
.

يَا لَيْلَى

حياتِ فاطمة زهراء سلام الله عليها

حیاتِ فاطمہ زہراء سلام اللہ علیہا

تالیف:

ڈاکٹر سید جعفر شہیدی

ترجمہ:

سید حسنین عباس گردیزی

ناشر: الرضا (ع) پبلیکیشنز - اسلام آباد
۳۰۱ ڈوسل آرکیڈ - بلیو ایریا - اسلام آباد
پوسٹ بکس نمبر: ۱۲۷۴ - اسلام آباد - پاکستان



کتاب:	حیات فاطمہ زہراء سلام اللہ علیہا
تالیف:	ڈاکٹر سید جعفر شہیدی
ترجمہ:	سید حسنین عباس گردیزی
تاریخ اشاعت:	ربیع الثانی ۱۴۲۲ھ جولائی ۲۰۰۱ء
تعداد:	ایک ہزار
مطبع:	ایلیا پرنٹنگ پریس - صدر - راولپنڈی - پاکستان
ناشر:	الرضا پبلیکیشنز - اسلام آباد

پیشگفتار

ناشر گرامی این کتاب شریف از نگارنده درخواست تا در معرفی نویسنده کتاب، استاد دکتر سید جعفر شهیدی برای خوانندگان اردو زبان مطلبی بنویسم. اگرچه "معرف باید از معرف اجلی باشد"، اما به سابقه سالها تلمذ در محضر استاد و نیز سالها افتخار همکاری با استاد در مؤسسه لغت نامه دهخدا و نیز همسفریم با استاد به خارج از کشور در جمع بعضی همکاران دانشگاهی و همچنین ادای وظیفه شاگردی و اخلاص و ارادتم، این مهم را پذیرفتم. امید که استاد لغزشها و کاستیهایم را بر من ببخشایند و البته دریغ می بود اگر به یاد "حق صحبت سالها"، "حالی از آن خوش حالها" گفته نمی آمد و پیش از آنکه فقط به ذکر آثار علمی استاد بپردازم، اشارتی به بعضی ویژگیهای کم مانند استاد نداشته باشم.

استاد مدرستی است محقق با کلاسهای پُربار که "قسم اکبر و حفظ اوفر" نصیب دانش پژوهانش می گردد. کلاس استاد به رفع دشواریهای اصلی و کلیدی متون درسی اختصاص دارد و تقریرات میان درسی استاد که به مناسبت بیان می گردد، بسیار سودمند می افتد.

حد کفی درس نیز در هر جلسه معین بود و این دیگر وظیفه طالبان - علم بود که در فاصله معمولاً یک هفته سهمیه تعیین شده از هر متن را با دقت بخوانند و آنچه برایشان مبهم می نماید در جلسه بعدی درس پیرسند که این خود از بسیاری وقت گذرانیهای بی حاصل بعضی کلاسها می کاهد.

از ویژگیهای درخور توجه استاد که همه مدرّسان کلاسهای سطوح و مقاطع تحصیلی بالا بی شک به آن مقرّند، مطالعه پیشاپیش مدّرس قبل از شروع درس است. حتی اگر سالها آن را تدریس کرده باشد. به یاد دارم در یکی از روزهای درس که جمع دانشجویان برای حضور در کلاس درس

استاد که آن روزها در ساختمانی در شمال میدان بهارستان و جنب سازمان برنامه آن روز تشکیل می‌گردید، حاضر شده بودند و استاد هم حسب معمول زودتر از دانشجویان به مدرّس آمده بود، اعلان فرمودند امروز کلاس درس تشکیل نمی‌گردد و سپس با صدای رسا فرمودند: "بنده دیشب درس را مطالعه نکرده‌ام".

تأثیر این بیان استاد که البته همه دانشجویان آن را حمل بر تواضع خاصّ و خفّض جناح استاد کردند، چنان تأثیری در دانشجویان گذاشت که مطمئنم آنان که تقریباً همه خود مدرّس نیز بودند، دیگر بدون مطالعه قبلی به کلاس نرفتند.

توفیق بیشتری نصیب نگارنده گردید تا از سال ۱۳۶۰ شمسی به بعد در حاشیه تدریس و کارهای دانشگاهی افتخار همکاری با گروه مؤلفان لغت نامه فارسی را در مؤسسه لغت نامه دهخدا یافتیم و روزهایی را که طبق سنت سنّیه مؤسسه لغت نامه جلسه "مقابله" در جمع یاران لغوی تشکیل می‌گردید، به صورتی دیگر امکان استفاده از محضر استاد و اظهار نظرهای اجتهادی‌اش بهره‌مُخلص نیز می‌گردید که اجتهاد و شَمّ زبانی استاد در هر دو زبان فارسی و عربی برای منّ بنده بسیار مغتنم بود و داوریه‌های عالمانه‌اش مشکل‌گشای راه مؤلفان لغت نامه فارسی و البته پژوهشی که با آن ظرافت و دقّت نظر مؤلفان ارجمند مؤسسه لغت نامه دهخدا در تألیف لغت نامه فارسی انجام می‌گرفت، نیازمند ارشاد پیران طریقتی همچون دکتر شهیدی نیز بود.

آنچه بر روی هم از حدود بیست سال انس و الفت با استاد در ذهنم نقش بسته تجسّمی است از صفات عالی انسانی از شخصیتی کم‌نظیر و متعالی و محقّقی گرانمایه و ژرف اندیش با روشی عالمانه در تحقیق و پایگاهی کم‌بدیل در تدریس و مجتهدی مسلّم در علوم اسلامی و تاریخ اسلام همراه با خُلقی کریمانه در رفتار و منّ بنده که این روزها دیگر

توفیق مصاحبت استاد را ندارم ، در این مورد از راهی دور با مولانا هم
آواز می‌گردم که :

لا تَكْلِفْنِي فَيَأْتِي فِي الْفَنَاءِ كَلَّتْ أَفْهَامِي فَلَا أُخْصِي ثَنَاءَ
كُلُّ شَيْءٍ قَالَهُ غَيْرُ الْمُتَفِيقِ إِنْ تَكَلَّفَ أَوْ تَصَلَّفَ، لَا يَلِيقُ

اشارتی به زندگینامه استاد :

استاد در سال ۱۳۰۰ شمسی در شهر بروجرد تولد یافت،
آموزشهای مقدماتی و ادبیات عربی و علوم دینی و فقه و اصول را
همانجا آموخت، در سال ۱۳۲۰ عازم نجف اشرف شد و از محضر
عالمان بزرگ آن زمان آقایان : حاج سید یحیی یزدی، حاج میرزا حسن
یزدی، حاج میرزا هاشم آملی و سپس آیه الله خوئی توشه ها اندوخت و
پس از هفت سال اقامت در نجف اشرف، بزرگترین دانشگاه علوم اسلامی
آن زمان در سال ۱۳۲۷ به تهران بازگشت. استاد در سال ۱۳۲۸ کار
خود را با شادروان استاد دهخدا در لغت نامه آغاز کرد و به سال ۱۳۳۰
همزمان، به تدریس در دبیرستانها نیز اشتغال ورزید. در سال ۱۳۳۲ از
دانشکده معقول و منقول و در سال ۱۳۳۵ از دانشکده ادبیات دانشگاه
تهران در زبان و ادب فارسی درجه لیسانس گرفت در سال ۱۳۴۰ دوره
دکتری زبان و ادبیات آن دانشگاه را به پایان برد و از سال ۱۳۴۲
معاونت مؤسسه لغت نامه و از سال ۱۳۴۶ ریاست آنجا به او واگذار
گردید. و از همین سال همکاری با شادروان دکتر معین را نیز برای تهیه
فرهنگ فارسی معین آغاز کرد. استاد به دعوت دانشگاههای جهان برای
شرکت در کنفرانسها و مجامع علمی به کشورهای مختلف و از جمله :
اردن هاشمی، مصر، الجزایر، عراق، چین، امریکا سفر کرده و از دانشگاه
پکن عنوان استادی افتخاری را دریافت کرده است.

بعضی تألیفات استاد دکتر شهیدی عبارت است از :

* جنایات تاریخ (۳ مجلد) کتاب فروشی حافظ، تهران، ۱۳۲۷ و ۱۳۲۹

- * چراغ روشن در دنیای تاریخ ، انتشارات علمی، تهران ۱۳۳۵
- * در راه خانه خدا، دانش نو، تهران ۱۳۵۶
- * پس از پنجاه سال ، امیرکبیر ۱۳۵۸ ، چاپ شانزدهم، دفتر نشر فرهنگ اسلامی ۱۳۷۲
- * شرح لغات و مشکلات دیوان انوری، چاپ اول ، انجمن آثار ملی ۱۳۵۸ چاپ دوم انتشارات علمی و فرهنگی ۱۳۶۲
- * تاریخ تحلیلی اسلام، تا پایان امویان، مرکز نشر دانشگاهی، تهران ۱۳۶۲
- * زندگانی حضرت فاطمه (ع) چاپ اول ، دفتر نشر فرهنگ اسلامی، ۱۳۶۰ چاپ هجدهم، دفتر نشر فرهنگ اسلامی ۱۳۷۳
- * عرشیان، نشر مشعر، قم، ۱۳۷۱
- * شرح مثنوی شریف، جلد چهارم (دنباله کار مرحوم استاد فروزانفر)، انتشارات علمی و فرهنگی، تهران ۱۳۷۳
- * علی از زبان علی، دفتر نشر، تهران ، ۱۳۷۶
- * تصحیح کتاب درّه نادره که از جمله متون مصنوع و دشوار ادب فارسی بشمار می رود، نمودار نهایت دقت و ظرافت و اجتهاد استاد در زبان و ادب فارسی و عربی است.
- برای استاد دکتر شهیدی تندرستی و طول عمر و بازهم توفیق بیش از پیش آرزو می کند.

دکتر رضا مصطفوی سبزواری

(استاد دانشگاه و رایزن فرهنگی ج.ا.ا - اسلام آباد)

نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ نَبَأَهُم بِالْحَقِّ (کہ: ۱۳)
ہم ان کا قصہ صحیح طور پر تمہارے لیے بیان کرتے ہیں

اس کتاب کا موضوع دختر رسول یعنی اسلام کی عظیم ترین خاتون فاطمہ یا فاطمۃ الزہراء (س) کی زندگی کا جائزہ ہے۔ اس کتاب کے مطالعے سے قاری کو یہ اندازہ ہو گا کہ جو کچھ ان چند اوراق میں سمو دیا گیا ہے وہ صرف ایک شخصی زندگی کی روداد نہیں ہے بلکہ اس میں کئی سبق آموز اور عبرت آمیز پہلو موجود ہیں۔ اگرچہ تاریخی اہمیت کی حامل شخصیات کے حالات زندگی خود سبق آموز ہوتے ہیں۔ جو کچھ آپ ان صفحات میں پڑھیں گے وہ ان عجیب واقعات کا تجزیہ و تحلیل ہے، جو ہمارے زمانے سے صدیوں پہلے رونما ہوئے اگر ہم ان واقعات کے کرداروں کو ان واقعات سے علیحدہ کر دیں تو ہم دیکھیں گے کہ وہ واقعات تاریخ کے ادوار میں بلکہ ہمارے زمانے میں بھی دنیا کے کسی گوشہ میں وقوع پذیر ہوئے ہیں اور ہو رہے ہیں۔ جن حوادث و واقعات کی ہم بات کریں گے، اگرچہ زمان و مکان کے لحاظ سے ہم سے بہت دور ہیں لیکن ان کے باقی ماندہ اثرات نہ صرف پرانے نہیں ہوئے بلکہ اپنی تازگی کو اسی طرح برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ آپ کتاب پڑھنے کے بعد دیکھیں گے کہ جو ہم کہہ رہے ہیں وہ مبالغہ اور فضول گوئی نہیں ہے۔

پیغمبر اسلام کی رحلت کے بعد مدینہ (دین اسلام کی تبلیغ و اشاعت کے مرکز) میں دو مخالف تحریکیں وجود میں آئیں۔

☆ ایک تحریک، جس کی یہ کوشش تھی کہ اسلامی معاشرے کو چلانے کے لئے سیرت پیغمبر پر عمل کیا جائے بالفاظ دیگر یہ سنت رسول کی نگہبانی اور حفاظت کرنا چاہتی تھی۔

☆ دوسری تحریک اپنے ظن و گمان یا اجتہاد کی بناء پر زمانے کی ترقی کے لحاظ سے سیاسی نظام اور کبھی نظام قانون میں تجدید و اصلاح کو ضروری سمجھتی تھی اور یہ نظریہ رکھتی تھی کہ سنت کو اہمیت دینے والے حقیقت کو کما حقہ نہیں سمجھتے۔ وہ زمانے کے تقاضوں کے مطابق اس تبدیلی کو مسلمانوں

☆ تاکہ دوسرے کی بات کو اعتراض سے خالی نہ جانے اور اسے قبول کرنے سے پردہ میں رہے (قبول نہ کرے)۔

☆ تاکہ یہ بہتر فرقتے قیامت کے دن تک دنیا میں باقی رہیں۔

آخر کار یہ سب برج منجیق (سنگ انداز) کے ذریعہ الٹ جائیں گے اور تمام حرکات ایک نقطے پر پہنچ جائیں گی اور سنت شکن اور سنت کی پیروی کرنے والے حق تعالیٰ کی رحمت و مغفرت کے سائے میں مل کر زندگی گزاریں گے۔ اس کام کے لئے میں اپنے آپ کو اس کا اہل پاتا ہوں نہ میرے کاندھوں پر موجود ذمہ داری مجھے ایسا کرنے کی اجازت دیتی ہے۔ وہ لوگ جو تاریخ میں جستجو اور تحقیق کا ذمہ اپنے سر لیتے ہیں وہ اسناد کے مطالعہ، مختلف قسم کے بیانات کی چھان بین اور روایات کے موازنہ اور جرح و تعدیل کے علاوہ اور کچھ نہیں کر سکتے۔ واقعہ نگار ناچار جو کچھ واقع ہوا ہے، اسے لکھ سکتا ہے اور جس حد تک اسناد و قرآن کے توسط سے واقعات کے بارے میں اپنی رائے قائم کر سکتا ہے، فیصلہ کرتا ہے۔ لہذا اسے چاہیے کہ اگر اس میں انحرافی نکات موجود ہیں تو ان کی نشاندہی کرے۔ اس طرح حقیقت آشکار ہو جائے گی۔ لیکن وہ ان اسناد و روایات کو کس طرح قبول کرے؟ کس طرح ان کی درجہ بندی کرے اور کس معیار پر انہیں پرکھے؟ یہ بذات خود ایک انتہائی کٹھن کام ہے۔ جب یہ تاریخی واقعہ رونما ہوا تو اس کے دو سو سال یا کچھ کم عرصے کے بعد اسے مؤرخین اور محدثین نے اپنی کتابوں میں محفوظ اور تحریر کیا اور یوں اسے فراموشی، عبارت میں تصرف اور دیگر عارضوں کے نقصان سے بچا لیا۔ ان دو صدیوں میں مضبوط اور طاقتور سیاسی مکاتب فکر ایک دوسرے کے مد مقابل رہے، جن کے سایہ یا تقلید میں لوگوں کے کئی گروپ تھے یا ایک گروہ نے دوسرے کی جگہ لے لی۔ وہ افراد جو صدر اسلام سے لے کر تیسری صدی ہجری کے اختتام تک کی تاریخ سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ اس دوران حدیث گھڑنا، اس میں تخلیط اور تدلیس، ملاوٹ اور فریب، حدیث کو مٹانا، حدیث کی اپنے مفادات کے حق میں اور دوسرے کے دعویٰ کو باطل کرنے کے لئے تفسیر اور تاویل رائج رہے ہیں۔

سیاست اموی، خوارج، عباسی اور ان کے مد مقابل پارٹیوں سے وابستہ افراد، وہ نو مسلم جو خدا کی وحدانیت اور محمدؐ کی رسالت کی گواہی کو اپنی جان کی حفاظت کا وسیلہ قرار دیتے اور اندر ہی اندر دین کی جڑوں کو کھوکھلا کرتے اور مختلف مکاتب فکر کے استاد جو اپنے حلقہ درس میں فقط مخالف کی بات کو باطل ثابت کرتے، خدا جانتا ہے اس مدت میں ان سب نے تاریخی اسناد کا کیا حلیہ بگاڑا ہے۔ سیاسی اہل کا بھی یہی حال ہے۔

تاریخی داستانوں، کسی شخصیت کی تاریخ ولادت یا تاریخ وفات بیان کرنے والی روایات اور

اس طرح کے دیگر بیانات کا سارا دار و مدار چونکہ راویوں کے حافظے پر تھا اس لئے ایسا بہت کم دیکھنے میں آیا ہے کہ کوئی واقعہ ایک طرح سے نقل ہوا ہو۔ اس صورت حال میں کیا کرنا چاہئے؟ مصنف نے حتی المقدور کوشش کی ہے کہ اپنے بیانات کو درجہ اول یا درجہ اول کے نزدیک ترین اسناد اور روایات کی بنیاد پر استوار اور منظم کرے، کیونکہ ان روایات میں تحریف کا احتمال کمتر ہے۔ (۱) نیز مصنف نے حتی الامکان اپنے بیانات کو خارجی قرائن سے بھی تطبیق دی ہے اور بالآخر مختلف اقوال میں سے ان اقوال کو قبول کیا ہے جن کو سب نے یا اکثریت نے قبول کیا ہے یا وہ ان کی کسی نہ کسی طرح سے تائید کرتے ہیں۔

ان سب باتوں کے باوجود میں یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ جو کچھ میں نے لکھا ہے وہ ایسی حقیقت ہے جو واقعیت کے مطابق ہے کیونکہ اس حقیقت کو اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔



(۱) اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ دُختر رسولؐ کے بارے میں دوسروں کی تحریریں معنف کی نگاہ سے دور رہی ہیں۔ چنانچہ کتاب کی فہرست مصادر میں آپ ملاحظہ کریں گے جو کچھ اس کے بارے میں لکھا گیا ہے۔ ان میں سے بیشتر پر معنف کی نظر رہی ہے۔

مَنْ خَالَ جَارِ يَتِيمٍ حَتَّى تُدْرِكَ دَخَلْتُ أَنَا وَ
هُوَ الْجَنَّةُ كَهَاتَيْنِ

(کنزل العمال، کتاب نکاح، باب حقوق دختران)

جس نے دو لڑکیوں کی پرورش کی یہاں تک کہ وہ بالغ ہو
گئیں، میں اور وہ، ان دونوں (ملی ہوئی انگلیوں کی طرف اشارہ
فرماتے ہوئے) کی طرح جنت میں داخل ہوں گے۔

محترم قارئین! اس وقت جب آپ اس کتاب کے مطالعے میں مشغول ہیں، کیا آپ نے
عرب کی تاریخ یا جغرافیہ کا مطالعہ کیا ہے؟ عرب سے میری مراد فقط شہر مکہ، مدینہ اور بحیرہ احمر کے
ساحل کی آبادی نہیں ہے اور نہ ہی میرا مقصود عرب کا سرسبز و شاداب اور خوشحال علاقہ یمن ہے۔
بلکہ عرب سے میری مراد وہ وسیع و عریض سرزمین ہے جو ایک طرف وادی حضرموت اور صحرائے
نفود کے درمیان واقع ہے اور دوسری طرف وادی دواسر اور ذھناء کے صحراؤں سے گھری ہوئی
ہے۔ اس جزیرہ نمائے عرب کا زیادہ تر حصہ یعنی بیس لاکھ ساٹھ ہزار کلومیٹر، اسی سرزمین پر مشتمل ہے
اور صدیاں گزر جانے کے بعد بھی تقریباً اپنی اصلی حالت پر باقی ہے۔

یہ عجیب خطہ ارضی انسان کو حیرت زدہ کر دیتا ہے۔ ایک طرف آباد دنیا سے کٹے ہوئے اس
کے خشک اور باشندوں سے خالی بیابان اور دوسری طرف طرف آفتاب کی مسلسل تپش سے جلے ہوئے
اور قدیم زمانے کے آتش فشانوں کے یادگار پہاڑوں کا سلسلہ اور ان کی ترکیب سے ایک عجیب اور
ساتھ ہی ایک پرکشش مجموعہ ارضی معرض وجود میں آیا ہے۔

مہم جو سیاح سرما میں یا بہار کے آغاز میں اس سرزمین میں داخل ہو تو وہ میلوں کا فاصلہ طے
کرنے کے بعد پھر کہیں ایسے مقام پر پہنچتا ہے، جہاں ایک دو دن پہلے کی بارش کا پانی کسی گڑھے
میں جمع ہوا ہو اور ممکن ہے پانی کے اس تالاب کے کنارے ایک خاندان، ایک دو اونٹوں کے ساتھ
آباد ہو۔ یہ اس صحرا کی مشکلات، خصوصاً پانی کی قلت کے مقابلے میں سخت جان انسان کا نمونہ ہیں۔

اس بیابان کا انسان پشمرودہ، لاغر، سیاہ رنگ، سخت مزاج اور پر حوصلہ ہے۔ اسے بدوی اور رانج طور پر بدو کہا جاتا ہے اور انسان سے بھی زیادہ سخت جان اس صحرا کا بار بردار جانور اونٹ ہے۔

صرف یہ دو جاندار صحرا کی سخت اور صبر آزما مشکلات سے نبرد آزما ہو سکتے ہیں۔ اس صحرا میں اگر پودوں کا وجود ہے تو وہ خاردار جھاڑیوں کی شکل میں ہے۔ رات کے وقت جب ہوا ان شاخوں سے گزرتی ہے تو ایک ہولناک آواز پیدا ہوتی ہے۔ صحرائی لوگوں کے وہم و خیال کے مطابق ان درختوں کے نیچے دیو رہتے ہیں اور یہ آوازیں ان کے بچوں کی ہوتی ہیں۔ اس لئے ان خاردار جھاڑیوں کو وہ ”ام غیلان“ کہتے ہیں جو مخفف ہو کر ”مغیلان“ بن گیا ہے۔ اس سر زمین کا درخت کھجور ہے جو نخلستانوں اور تالابوں کے کناروں پر پایا جاتا ہے اور درختوں میں پانی کی کمی کا مقابلہ کرنے میں پہلے نمبر پر ہے۔ ایسے مشکل ترین حالات میں جفاکش انسانوں کی ثابت قدمی قدرتی رکاوٹوں کے خلاف بقاء زندگی کے لئے ان کی جہد مسلسل کی علامت ہے۔ جس چیز کے حصول کے لئے زندہ رہنے کی خاطر انہیں کوشش کرنا پڑتی ہے وہ انسانوں اور حیوانوں کا سرمایہ حیات ”پانی“ ہے۔

پانی کی تلاش میں ہر روز یا چند روز کے بعد بدو کو اپنا رخت سفر باندھنا پڑتا ہے۔ اسے اپنے سامان کو، جس میں چربی کی چند ٹکلیاں اور وہ بھی اونٹ کی اون سے مخلوط اور کھجور کے چند دانوں کے سوا کچھ نہیں۔ اپنے بار بردار جانور کی پشت پر لاد کر اور معمولاً اپنی بیوی اور کبھی کبھار اپنے چھوٹے بچے کو سامان کے اوپر بٹھا کر ریت کے تپتے ہوئے ٹیلوں کو سر کرنا پڑتا ہے اور پانی کے ذخیرے تک پہنچنے کے لئے اسے سلگتے صحراؤں اور گرم چٹانوں کو عبور کرنا پڑتا ہے۔

یہ پانی بھی کیسا؟ سیاہ رنگ، بدبودار، کیڑے مکوڑوں اور دوسرے ریگنے والے جانوروں سے پر، جو اس بدو سے پہلے وہاں پہنچے ہوئے ہوتے ہیں۔ لیکن یہ خستہ حال مسافر زندگی کے اس سہارے کو دیکھ کر خوش ہو جاتا ہے۔ وہ اپنا سامان اتارتا ہے اور وہاں ڈیرہ لگا لیتا ہے۔ لیکن افسوس کہ اس کی یہ خوشی عارضی ثابت ہوتی ہے۔ اسی دوران اسی طرح کا ایک اور بیچارہ انسان بھی وہاں آن پہنچتا ہے۔ اس بد بخت انسان کے تلوے پھٹے ہوئے اور جلے ہوئے ماتھے پر پڑی ہوئی سلوٹیں یہ بتا رہی ہیں کہ یہ بھی اسی چیز کی تلاش میں سرگرداں ہے جسے پہلے مسافر نے پالیا ہے اور وہ ہے پانی۔

صدیوں پر محیط تمام مدت میں اس سنگدل صحرا نے اپنی دھرتی کے سپوتوں کو صرف ایک سبق سکھایا ہے کہ ”مارو تا کہ زندہ رہو“۔ اسی اصول کے پیش نظر مذکورہ گھاٹ پر لڑائی شروع ہو جاتی ہے اور تھوڑی دیر میں بیچارے انسان کے خون سے زمین رنگین ہو جاتی ہے۔ وہ انسان جو حکم جبلت کے تحت زندہ رہنا چاہتا تھا لیکن وہ اپنے طاقتور حریف کے مقابلے میں شکست کھا گیا اور جان کی بازی ہار گیا۔ ابھی اس کے تشنہ لب، اس کی تھکی ماندی سواری اور اس سے وابستہ ایک دو بے سہارا جانیں پانی سے سیراب بھی نہ ہونے پائی تھیں کہ بے رحم، سنگدل اور طاقتور دشمن نے دانت دکھائے

اور جس پر اس کی، اس کے اونٹ اور بیوی بچوں کی زندگی کا دار و مدار تھا، اسے چھیننے کے لیے اس پر حملہ کر دیا۔ افسوس کہ یہ دشمن پہلے دشمن سے زیادہ طاقتور ہے جس کے قتل سے وہ ابھی فارغ ہوا ہے۔ یہ ایسا دشمن ہے جسے یہ کبھی شکست نہیں دے سکتا۔ وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے کہ میں گرم پانی کی سطح دن بدن نیچے ہوتے جا رہی ہے اور بخارات مسلسل ہوا میں اٹھ رہے ہیں۔ یہاں تک کہ اس تالاب کی تہ میں گیلی مٹی اور چند نیم جان کیڑوں کے سوا کچھ باقی نہیں رہتا۔ ہاں سورج نے اپنا کام کر دکھایا ہے، اب یہاں سے کسی دوسری جگہ کوچ کرنا چاہیے۔

”انھو اب کوچ کرو“ ایک ایسا گیت ہے جسے بدو، اس مشقت بھری پوری زندگی میں گاتا ہے۔ اس کی ہر صبح کسی (نئی) جگہ پر اور ہر رات راہ گزر پر ہوتی ہے۔

اسی افر تفری اور سامان اتارنے اور چڑھانے کے ہنگامے میں اچانک اس کے کانوں سے ہلکی سی آواز ٹکراتی ہے۔ یہ کونسی آواز ہے؟ یہ اس نومولود کے رونے کی آواز ہے جس نے مصائب و آلام کی وادئی حیات میں ابھی قدم رکھا ہے۔

ابھی اس کی بیوی درد زہ سے فارغ ہوئی ہے اور اس بے نوا کنبے میں ایک لڑکی کا اضافہ ہو گیا ہے۔ آہ کتنی بڑی مصیبت! وہ ہمیشہ ایسے وقت سے پریشان اور خوفزدہ تھا۔
لڑکی! بیٹی! یہ ذلت و رسوائی کا سامان بچی میرے کس کام کی؟

میری بیوی نے لڑکا کیوں نہ جتا؟ اگر لڑکا ہوتا تو وہ ایک نعمت تھا۔ بچپن میں وہ اونٹوں کی نگہبانی کرتا اور جوان ہو کر میرے شانہ بشانہ دشمنوں سے لڑتا۔ لیکن لڑکی تو پاؤں کی زنجیر ہے، بلکہ اس سے بھی بدتر۔ یعنی ذلت و رسوائی کا باعث ہے۔ کیوں؟ اس لئے کہ اسے یاد ہے کہ چند دن پہلے اس کی فلاں شخص سے لڑائی ہوئی تھی جس پر اس کی بیٹی کو اس نے اسیر کر لیا تھا اور اس کے ماں باپ اور قبیلے کے ماتھے پر بدنامی اور ذلت کا داغ ہمیشہ کے لئے چھوڑ دیا تھا۔ اسے کیا معلوم کہ ایک دن اس کے سر بھی وہی بلا نازل ہو گی۔

نہیں! ابھی دیر نہیں ہوئی۔ اس کا حل سوچنا چاہیے اور واقعہ سے پہلے اس کا تدارک کرنا چاہیے۔ اس لڑکی کو زندہ نہیں رہنا چاہیے۔ مبادا شرمساری اور رسوائی کا باعث بنے۔ لہذا اسے زندہ درگور کر دینا بہتر ہے۔ (۱)

(۱) رَاٰذَا بُنْیَرَ اَجْذَمَ بِالْاَنْثَى طَلَّ رُجْعُهُ مَسْرُوْدًا وَاَوْفُوْا كَطَبْنِیْرٍ ۝ یَخْرُاٰی مِنْ الْقَوْمِ مِنْ سُوْرَ مَا یُنْخِرُ بِهِ ط اَلْیَسْبُحُ عَلٰی فَوْنٍ اَمْرٍ یَذْنُ فِی التَّرَابِ ط اَلَا سَاءَ مَا یَحْكُمُوْنَ ۝ (نمل ۵۸-۵۹) اور جب ان میں سے کسی کو بیٹی کی خوشخبری دی جاتی ہے تو مادے غصے کے اس کا منہ سیاہ ہو جاتا ہے۔ اس بری خبر کی وجہ سے وہ لوگوں سے بچتا پھرتا ہے (اور سوچتا ہے) کیا اسے ذلت کے ساتھ زندہ رہنے دے یا اسے زیر خاک دبا دے؟ دیکھو! کتنا برا فیصلہ ہے جو یہ کر رہے ہیں

صرف غربت و افلاس اور ذلت و رسوائی کا خوف اس قبیح فعل کے ارتکاب کا سبب نہ تھا بلکہ کبھی خرافاتی عقائد اور باطل اوہام بھی دختر کشی کا موجب بنتے تھے۔ چنانچہ اگر نیلی آنکھوں والی یاسیاء رنگ والی لڑکی اس کے گھر میں پیدا ہوتی تو اسے وہ قال بد گردانتے تھے۔ موجودہ صدی کے چند عرب ادیب اور مورخین اس غیر انسانی عمل کی تاویل انسانی جذبات اور احساسات کے ذریعے سے کرنا چاہتے ہیں۔ ان کے بقول چونکہ باپ کو اپنی اس جنس کی اولاد سے شدید محبت ہوتی ہے، لہذا وہ اپنی لڑکیوں کو اس خطرے کے پیش نظر زندہ در گور کر دیتا کہ کہیں ان کی عزت و ناموس پر حرف نہ آئے۔ (۱) یہ ایک بے بنیاد توجیہ ہے۔ کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن ان افراد کی سخت ملامت اور سرزنش کرتا ہے کہ یہ لوگ کیوں غربت اور تنگدستی کے خوف سے معصوم جان کو قتل کرتے ہیں۔ (۲)

قرآن ایک اور مقام پر ارشاد فرماتا ہے:

وَإِذَا الْمَوْءُذَةُ سُئِلَتْ ۖ بِأَيِّ ذَنْبٍ قُتِلَتْ ۖ (نور ۸-۹)

اس دن جب اس زندہ در گور لڑکی کے بارے میں پوچھا جائے گا کہ اسے کس جرم میں قتل کیا گیا؟

ہاں! اس غیر انسانی فعل کا عامل کچھ بھی ہو، اس کی برائی اور قباحت میں کمی نہیں کرتا۔ وہ لوگ اس قسم کی سرزمین میں اس قسم کی رسم کے حامل تھے اور ایک دوسرے کے ساتھ اس سے بھی بدتر سلوک اور وحشیانہ طرز عمل اختیار کرتے تھے۔

یہ تھا ظہور اسلام سے پہلے صحرائینوں کا حال۔ لیکن جزیرۃ العرب کے شہروں میں بسنے والوں کی حالت بھی مشکلات اور سختیوں کے اعتبار سے ان سے کچھ زیادہ اچھی نہ تھی۔ البتہ ان کی لڑائیاں اور طرح کی ہوتی تھیں۔ مالدار، سرمایہ دار اور وڈیروں کی یہ خواہش تھی کہ غریب اور مفلس لوگ انا کے لئے محنت و مشقت کریں اور اپنی جان ماریں، تاکہ وہ عیش و عشرت اور چین و سکون سے رہیں، ان کے مال و دولت اور خزانوں میں اضافہ ہوتا رہے اور ان بے چاروں کی کمریں قرضوں اور غربت و ناداری کے بوجھ تلے مزید جھک جائیں۔ ظاہر ہے کہ جغرافیائی لحاظ سے مذکورہ خصوصیات کی حامل ہونے اور اپنے ساکنین کے اعتبار سے اس قسم کے افراد کی وجہ سے، اس سرزمین، کی علم الانساب کے ماہرین اور ماہرین سماجیات کی نگاہ میں کیا اہمیت رہ جاتی ہے۔ اگر ساتویں صدی عیسوی کے آغاز میں تاریخ کا عظیم معجزہ رونما نہ ہوتا اور اس تاریک بیابان میں نور کا چشمہ نہ پھوٹتا تو بے شک آج بہت

(۱) بلوغ الادب ج ۳ ص ۴۲-۵۳

(۲) وَلَا تَقْتُلُوا أَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ إِبْلَاسٍ ۖ نَحْنُ نَرِزْقُهُمْ فَإِذَا كُنُوا عُمِلًا ۖ إِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطَاً كَبِيرًا ۖ (اسراء: ۳۱) اور تم اپنی اولاد کو

تنگدستی کے خوف سے قتل نہ کیا کرو۔ ہم انہیں رزق دیں گے اور تمہیں بھی۔ ان کا قتل یقیناً بہت بڑا گناہ ہے۔

ہی کم لوگ ہوتے جنہیں صحرائے عربستان کے نام کا پتہ ہوتا اور یہ کہ یہ صحرا ایشیا کے جنوب مغربی کنارے پر واقع ہے۔ اس کی جغرافیائی اور تاریخی صورت حال اور دیگر خصوصیات کے بارے میں کسی کو بھلا کیا خبر ہوتی۔ یہ کہاں ممکن تھا کہ ایک مہم جو سیاح جزیرۃ العرب کے پہاڑی سلسلہ سینا کو سر کرتا اور نجد کے خشک بیابانوں کو عبور کرتے ہوئے، تھامہ کے دروں کو پار کر کے اپنے آپ کو ”نفود“ یا ”الربع الخال“ کے وسیع و عریض صحرائے تک پہنچاتا اور صحرائے چلتے والے طوفان کی زد میں آ کر ریت میں دب کر ابدی نیند سو جاتا اور اگر دسیوں لوگوں میں سے کوئی ایک بچ جاتا تو دوسروں کو اپنے مشاہدات بتاتا۔

لیکن تقدیر کو کچھ اور منظور تھا۔ اس سر زمین سے ایسی صدا بلند ہوئی جو ابتداء میں بحیرہ احمر کے کنارے چھوٹے سے شہر سے اٹھی اور پھر اس شہر سے پانچ سو کلومیٹر دور ایک نخلستان میں پہنچی، وہاں سے اس بحیرہ کی مشرقی جانب اور پھر تمام جزیرہ نمائے عرب میں پھیل گئی۔ اس کے بعد یہ آواز ایران میں پہنچی۔ پھر مصر، براعظم افریقہ اور آخر کار پورے عالم کو اس نے اپنی پلیٹ میں لے لیا۔ پوری دنیا میں گونجنے والی اس آواز نے صحرائے ایشیائیوں کو یہ درس دیا کہ اے عرب کے صحرائے نور! جو سبق تم نے اس صحرائے سیکھا ہے وہ غلط ہے۔ صحرائے تمہیں غلط سبق پڑھایا۔ وہ ایک برا استاد ہے۔ تمہیں خدا سے سبق سیکھنا چاہیے۔ تمہارا شعار وہ نہیں جس کی تمہیں عادت پڑ چکی ہے۔ تمہیں قتل و غارت کے لئے پیدا نہیں کیا گیا۔ تم تو اللہ کے خلیفہ ہو اور اللہ نور، محبت، لطف، رحمت اور مہربانی ہے۔ تم دوسروں کے لیے زندہ ہو اور تم سب ایک دوسرے کے ساتھ خدا کی خاطر ہو۔

تم اس سبق کو فراموش کر دو جو تم نے سینہ بہ سینہ حاصل کیا ہے یا اپنے آباء اجداد کی تقلید سے سیکھا ہے۔ وہ کوئی اچھے معلم نہ تھے۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ سبق تقلید سے نہیں سیکھنا چاہیے۔ لڑکی بھی لڑکے کی مانند ہے۔ یہ دونوں تمہارے کام آئیں گے۔ ہر دو خدا کی نعمتیں ہیں۔ خدا کی تمام نعمتوں کا شکر ادا کرنا چاہیے اور ایک کو دوسرے پر برتری نہیں دینی چاہیے۔

اے لوگو! تم اپنی لڑکیوں کے ساتھ ایسا سلوک کیوں کرتے ہو؟ تم کیوں انہیں فضول اور بے وقعت سمجھتے ہو؟ تمہیں کس نے جتا اور پالا پوسا ہے؟ کیا تم انہی لڑکیوں کی گود میں پروان نہیں چڑھے ہو، جو اب تمہاری مائیں ہیں؟ جان لو کہ جب کسی گھر میں لڑکی پیدا ہوتی ہے تو اللہ تعالیٰ فرشتوں کو ان کے پاس بھیجتا ہے کہ اے گھر والو تم پر سلام ہو۔ اس کے بعد اس لڑکی پر اپنے پروں کو اوڑھا دیتے ہیں اور اپنے ہاتھ اس کے سر پر پھیرتے اور کہتے ہیں کہ جو کوئی ان کی پرورش اور نگرانی کا ذمہ لے گا اس کی قیامت میں مدد کی جائے گی۔ (۱) جس کی لڑکی ہو اور وہ اسے زندہ درگور

(۱) کنزل العمال، کتاب النکاح، از اوسط طبرانی

نہ کرے، لڑکی کو ذلیل و خوار نہ سمجھے اور لڑکے کو اس پر ترجیح نہ دے تو خدا اسے بہشت میں لے جائے گا۔ (۱)

یہ آسمانی تعلیمات کبھی قرآنی آیات کی شکل میں اور کبھی حدیث کی زبان میں ان دیر فہم اور بوجھل کانوں والے افراد پر پڑھی جاتی رہیں، لیکن ان تعلیمات کا عملی نمونہ بھی ہمراہ ہونا چاہیے تاکہ ان کا اثر زیادہ ہو۔ اس عملی تربیت کا اعلیٰ نمونہ رسول خدا کی بیٹی سیدہ فاطمہ الزہرا (س) ہیں۔

یہ حیران کن بات ہے کہ رسول اللہ کی پہلی زوجہ حضرت خدیجہ (س) سے اولاد میں لڑکیوں کی تعداد لڑکوں سے زیادہ ہے اور پھر لڑکے زندہ نہ رہے اور بچپن میں ہی فوت ہو گئے جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے کہ بدوی زندگی اور قبائلی نظام میں لڑکا باپ کے گھر کے چراغ کو روشن کرتا ہے اور اگر کسی کے ہاں لڑکا نہ ہو تو اس کا نام مٹ جاتا ہے۔ ایسے شخص کو وہ ”اہتر“ کہتے تھے اور ککے کے کوتاہ فکر افراد یہی بات حضرت محمدؐ کے بارے میں کہتے تھے کہ وہ اہتر ہیں۔ اس لئے دنیا سے چلے جانے کے بعد ان کا نام و نشان ختم ہو جائے گا، کیونکہ ان کا کوئی بیٹا نہیں جو ان کا وارث بنے۔ آپؐ کے بارے میں دل کے اندھے قریش کا یہ باطل نظریہ تھا۔

لیکن مشیت الہی کے عین مطابق اور ان تاریک دل اور کج فہم و فکر کافروں کی سوچ کے برعکس، رسول اللہ کی ایک بیٹی باقی بچیں اور اس ایک بیٹی نے انفرادی زندگی اور اجتماعی و معاشرتی زندگی میں اپنے طرز عمل اور کردار اور رفتار سے آپؐ کی باتوں کو سچ کر دکھایا اور قرآن کے اسرار و رموز کو ان خود خواہوں پر اس طرح واضح کیا کہ اِنَّ شَانَنكَ هُوَ الْاٰخِرُ (کوثر: ۲) ”بے شک تیرا دشمن ہی اہتر ہے“۔ اے محمدؐ آپ کا نام گرامی زندہ و جاوید رہے گا۔ تجھے طعنے دینے والے خود گمنامی کے طوق گلے میں ڈالیں گے۔ وہ گمنامی کی زندگی گزاریں گے اور گمنامی کی موت مریں گے۔

اسی طرح جناب فاطمہ (س) کے بیٹے اور ان کی اولاد، مذکورہ بشارت الہی کا ایک راز قرار پائی۔ مولانا رومی نے کیا خوب کہا ہے:

مصطفیٰ را وعده داد الطاف حق مگر بمیری تو نمیرد این سبق
رونقت را روز روز افزون کنم نام تو ہرز و ہر نقرہ زہم
منبر و محراب سازم بھر تو! در محبت قہر من شد قہر تو! (۱)
☆ محمد مصطفیٰ (س) سے الطاف الہی نے یہ وعده کیا ہے کہ آپ کی رحلت کے بعد یہ اسلام کا سبق ختم نہیں ہو گا۔

(۱) کنز العمال، کتاب النکاح، از مسند ابو داؤد

(۲) شہد مولانا رومی، طبع نیکلسن دفتر سوم ص ۶۸

- ☆ آپؐ کی بزم کی رونق کو میں روز افزوں کر دوں گا۔ آپؐ کا نام سونے اور چاندی کے سکوں پر لگواؤں گا۔ (آپؐ کے نام کا سکہ چلے گا)۔
- ☆ منبر و محراب آپؐ کے لئے بناؤں گا اس میں میری ناراضگی آپؐ کی ناراضگی بن جائے گی۔

تقدیر خداوندی یہ تھی کہ پیغمبر اسلامؐ اپنی تمام پداری محبت و شفقت سیدہ فاطمہ (س) کے نام کر دیں تاکہ اس عملی تربیت کے ذریعہ وہ خود خواہ لوگ جان لیں کہ بیٹیوں کو بھی بیٹوں کی طرح اہمیت دینی چاہیے۔ کیا ہمارا یہ عقیدہ نہیں ہے کہ رسولؐ کی تین قسم کی سنت ہے جس کی پیروی تمام مسلمانوں پر واجب ہے۔ اس کی ایک قسم آنحضرتؐ کا طرز عمل ہے۔ پس آپؐ کی پیروی میں آپؐ کے امتی بھی ایسا سلوک اپنی بیٹیوں کے ساتھ کریں اور نسلی بقاء کے سرمائے کو یوں حقیر نہ سمجھیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب بھی ہر گز نہیں ہے کہ جناب محمدؐ اپنی بیٹی کا جو بھی احترام کرتے تھے وہ صرف دوسروں کی تربیت اور دوسروں کو بتانے کے لئے تھا۔ ایسا نہیں ہے۔ یہاں حضرت فاطمہ (س) کی اخلاقی شخصیت کا بیان آئے گا۔ اس کے متعلق ہم تفصیل سے بات کریں گے اور آپؐ دیکھیں گے کہ حضرت سیدہ زہرا (س) اس احترام و اہمیت کے لائق تھیں۔ یہاں پر جو بات کرنا مقصود ہے وہ یہ ہے کہ رسول اکرمؐ کا فرض تھا کہ قرآن کی تعلیمات کے ساتھ ساتھ امت کے لئے عملی نمونہ بھی پیش کریں۔

☆☆☆☆☆

وَأَيْنَ مِثْلُ خَدِيجَةَ صَدَقْتَنِي حِينَ كَذَبَنِي النَّاسُ

(حدیث شریف۔ سفیر المعارف ج ۱ ص ۱-۳)

خدیجہ کی طرح (بیوی) کہاں ہے؟ اس نے میری (باتوں کی)
اس وقت تصدیق کی جب لوگوں نے مجھے جھٹلایا۔

جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ حضرت فاطمہ (س) حضرت محمد رسول اللہ کی بیٹی ہیں اور ان کی والدہ ماجدہ حضرت خدیجہ بنت خویلد ہیں۔ حضرت خدیجہ کی پیغمبر اسلام سے شادی سے پہلے کی زندگی کے بارے میں چند اشاروں کے سوا مستند معلومات قدیم کتب تاریخ میں نہیں ہیں۔ ابتدائی منابع میں چند واقعات کے حوالے سے گاہ بگاہ ان کے والد اور چچا زاد کا نام آیا ہے۔ خویلد بن عبد العزی بن قصی بن کلاب، قریش کے معروف خاندان اور شرفاء میں سے تھے۔ دور جاہلیت میں خویلد اپنے قبیلہ کے سردار تھے۔ دوسری جنگ فجار (۱) میں جو شمشطہ کے نام سے مشہور ہے اور اس دن قریش، کنانہ کے ساتھ جنگ کرنے کے لئے آمادہ ہوئے۔ قبیلہ اسد کے رئیس وہ تھے۔ (۲)

مورخین نے لکھا ہے کہ جب تیج حجر الاسود کو یمن لے جانا چاہتا تھا تو خویلد اس کے مقابلے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے (۳)۔ ان کا یہ اقدام ان کے زمانے میں ممتاز حیثیت کا پتہ دیتا ہے۔ حضرت خدیجہ کے چچا زاد ورقہ بن نوفل عرب کے کاہنوں میں سے تھے اور جیسا کہ مورخین نے لکھا ہے کہ وہ سابقہ ادیان کی کتابوں کو جانتے تھے۔ حضرت خدیجہ ظہور اسلام سے قبل قریش کی ممتاز خواتین میں

(۱) اس جنگ کو جنگ فجار اس وجہ سے کہتے ہیں کہ یہ حرام میٹوں میں واقع ہوئی۔ بعض کا قول یہ ہے کہ اس وجہ سے یہ نام دیا گیا کیونکہ اس جنگ میں کچھ حرام چیزوں کو طلال قرار دے دیا گیا۔ ملاحظہ فرمائیں: سیرت ابن ہشام ۲۰۱ ج ۱۔ مجمع الامثال میدانی، فصل ایام العرب، نیز اقرب الموارد۔

(بقیہ اگلے صفحے پر)

شمار ہوتی تھیں۔ یہاں تک کہ انہیں قریش کی عورتوں کی سردار اور طاہرہ کہا جاتا تھا۔ رسول اکرمؐ سے عقد سے قبل وہ پہلے ابو ہالہ ہند بن نباش بن زرارہ (۱) کی بیوی تھیں اور پھر بنی مخزوم کے فرد عتیق بن عائد کی زوجہ بنیں (۲) ان کے ابو ہالہ سے دو بیٹے ہوئے اور عتیق سے ایک بیٹی ہوئی۔ یہ حضرت فاطمہ سلام اللہ علیہا کے ماں کی طرف سے بھائی اور بہن ہیں۔

(بقیہ از صفحہ گزشتہ)

(۲) ابن اسحاق ج ۱ ص ۵۹۳، انساب الاشراف بلاذری ص ۱۰۲ طبع دارالعارف۔ لیکن ابن سعد بنی کریم کی حضرت خدیجہ سے شادی کے دن کے بارے میں یوں رقمطراز ہیں: یہ جو لکھا گیا ہے کہ ”حضرت خدیجہ نے اپنے والد کو مشروب پلا کر انہیں طبعی حالت سے خارج کر دیا“ درست نہیں ہے اور اس کی اسناد بالکل غلط ہے۔ جو کچھ اہل علم سے ہم تک پہنچا ہے اور ان کی اسناد بھی درست ہیں یہ ہے کہ خویلد جنگ فجار سے پہلے ہی انتقال کر گئے تھے۔ (طبقات ص ۸۵ ج ۱) لیکن تفسیر میدانی نے ”یوم حط“ کا ترجمہ ”بنی ہاشم اور بنی عبد شمس کے مابین جنگ کا“ کیا ہے۔ (مجمع الامثال) جنگ فجار میں ایک طرف قریش اور دوسری طرف کنانہ تھا اور اس حوالے سے ”تفسیر میدانی“ دقت نظر اور ہر ایک بنی سے محروم ہے۔ اسی طرح خدیجہ کے نکاح کے دن خویلد کے مست ہونے اور اس شادی پر راضی ہونے کا جو واقعہ بعض لوگوں نے نقل کیا ہے وہ بھی بے بنیاد ہے۔ جیسا کہ اکثر اہل سنت کی روایات اور شیعہ مآخذ میں ہم پڑھتے ہیں، اس خواستگاری میں حضرت خدیجہ کے چچا عرد ابن اسد اور رقدہ ابن نوفل موجود تھے اور ظاہرًا خویلد اس تاریخ کو زندہ ہی نہیں تھے۔

(۳) عماد فاطمة الزہراء ص ۱۰۔ عماد نے اپنی سند کا ذکر نہیں کیا ہے۔ یمن کے بادشاہوں کا عام لقب ”قیح“ ہے۔ اگر یہ داستان درست ہو تو یہ شخص قیح الاصغر حسان تھے۔ لیکن مؤرخین نے چند بادشاہان یمن ”قیح“ کی داستانوں کو غلط کر دیا ہے۔ (تاریخ یعقوبی، حبیب السیر، مجمل التواریخ و القصص، اور تاریخ گزیدہ کی طرف رجوع کیجئے۔) جہاں تک مؤلف نے تحقیق کی ہے، اس قیح نے ایک خواب دیکھنے کے بعد خانہ کعبہ کا احترام کیا اور اسے غلاف پہنا دیا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ پہلے آدمی ہیں جنہوں نے کعبہ کو غلاف پہنایا۔ جو داستان محمد ابن اسحاق سے نقل کرتے ہوئے سیر ہشام میں لکھی گئی ہے اور یاقوت نے بھی اس کا کچھ حصہ لفظ کعبہ کی تشریح میں بیان کیا ہے، ایسا لگتا ہے کہ بے بنیاد ہے۔ واللہ العالم۔ (سفیر البحار ج ۲ ص ۶۳۳ کی طرف رجوع فرمائیں)

(۱) بلاذری انساب الاشراف۔ ص ۳۹۰

(۲) ابن سعد، طبقات ج ۸ ص ۸۔ بعض مآخذ نے ان کی عتیق سے پہلے ابو ہالہ سے شادی کا ذکر کیا ہے۔ (مقاتل الطالبین ص ۳۸۔ کشف الغمہ ج ۱ ص ۵۱۱) اس شہرت کے مقابلے میں ابن شہر آشوب نے مناقب اور سید مرتضیٰ نے ثانی میں لکھا ہے کہ حضرت خدیجہ پیغمبر اسلامؐ سے شادی کے موقع پر کنواری تھیں اور جس کی شادی ابو ہالہ سے ہوئی تھی وہ خدیجہ کی بہن تھیں۔ ابن شہر آشوب نے اپنے متعدد مآخذ میں احمد بلاذری کی کتاب کا حوالہ بھی دیا ہے۔ (مناقب۔ ج ۱ ص ۱۵۹) قاعدۃ احمد بلاذری کو ”انساب الاشراف“ کا مؤلف احمد ابن یحییٰ ہونا چاہیے اور اگر ایسا ہے تو وہ امام حسنؑ کا ایک جملہ نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ”میں نے اپنے ماموں ہند ابن ابی ہالہ سے پوچھا۔“ اور اس جملے کی تفسیر میں وہ کہتا ہے کہ چونکہ خدیجہ بنت خویلد پہلے ابو ہالہ اسدی کی بیوی تھیں۔ (انساب الاشراف ص ۳۹۰) اور اسی طرح کتاب کے صفحہ ۳۰۶ پر یوں نقل کیا گیا ہے کہ خدیجہ بنی کریم سے نکاح سے پہلے ابو ہالہ ہند ابن نباش کی زوجہ تھیں۔

حضرت محمدؐ کے ساتھ ان کی شادی

ان دو شادیوں کے بعد باوجود اس کے کہ وہ خوبصورت اور مالدار خاتون تھیں اور ان کے رشتے کے خواہاں بہت سے تھے، انہوں نے کسی سے شادی نہ کی اور اپنے مال سے تجارت کرنے لگیں۔ یہاں تک کہ حضرت ابو طالب نے اپنے بھتیجے سے کہا کہ وہ بھی اپنے دوسرے حصہ داروں کی طرح خدیجہ کے عامل بنیں اور ان کی طرف سے ان کا مال شام لے جائیں اور ایسا ہی ہوا۔ اس تجارتی سفر کے بعد حضرت خدیجہ حضرت محمدؐ سے شادی کرنے پر مائل ہوئیں اور جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ انہوں نے آنحضرتؐ کو اپنا شوہر قبول کر لیا۔ جیسا کہ مؤرخین کے درمیان مشہور ہے اور سنت بھی اس بات کی تائید کرتی ہے کہ حضورؐ سے شادی کے وقت حضرت خدیجہ کی عمر چالیس سال تھی۔ لیکن ان کے بطن سے آنحضرتؐ کی جو اولاد ہوئی ان کی تعداد کو دیکھتے ہوئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ مؤرخین نے اس لحاظ سے چالیس کے عدد کا انتخاب کیا کہ یہ ایک مکمل عدد ہے۔ اس شہرت کے مقابلے میں ابن سعد اپنی سند کے ساتھ ابن عباس سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت محمدؐ سے شادی کے وقت حضرت خدیجہ کی عمر اٹھائیس سال تھی۔ (۱)

حضرت خدیجہ پہلی خاتون تھیں جو آنحضرتؐ پر ایمان لائیں۔ جب پیغمبر اکرمؐ نے اعلانِ دعوت کا آغاز کیا تو مکہ کے ثروتمند اور امیر لوگ آپؐ کے مقابلے کو اٹھ کھڑے ہوئے اور آپؐ کو اور آپ کے پیرو کاروں کو آزار و اذیت پہنچانا شروع کر دی۔ حضرت ابو طالب اپنے بھتیجے کی دشمنوں کے گزند سے حفاظت کرتے تھے۔ ان کے ساتھ حضرت خدیجہ آپؐ کی مونس و مددگار تھیں جو گھر میں آپؐ کو آرام و سکون پہنچاتیں اور آپؐ کی ہمت افزائی کرتیں۔ اسی انسانی جذبے اور اسلامی احساس کی بنا پر رسول خداؐ ہمیشہ انہیں اچھے انداز سے یاد کرتے (۲)۔

حضرت فاطمہ اطہر (س) ایسے باپ اور ایسی ماں کی بیٹی تھیں۔ ان کی ولادت کب اور کس تاریخ کو ہوئی؟ اس کا دن بلکہ سال بھی معلوم نہیں ہے۔ یعنی مورخین نے اس سلسلے میں کوئی متفقہ تاریخ بیان نہیں کی بلکہ مختلف تاریخیں ذکر کی ہیں۔ اسلام کی عظیم شخصیات (مرد و یا عورت) کی تاریخ ولادت اور وفات کا مشخص ہونا تاریخی لحاظ سے اگرچہ قابلِ اہمیت اور قابلِ بحث ہے اور ہم بھی اس کی تحقیق کریں گے لیکن شخصیات کے تجزیہ و تحلیل میں چند اہم نہیں ہے۔ اسلام کی بڑی اور غیر معمولی شخصیات کی زندگیوں کے حوالے سے بعد میں آنے والی نسلوں کے لئے جو چیز اہمیت کی حامل ہے وہ یہ ہے کہ انہیں معلوم ہو کہ وہ کون تھے؟ ان کی تربیت کیسی ہوئی؟ انہوں نے زندگی کس

(۱) ابن سعد طبقات، ج ۸ ص ۱۰۔ کشف الغمہ ج ۱ ص ۵۱۳

(۲) بخاری ج ۵ ص ۳۷-۳۸۔ رجوع بحیثیہ اعلام النساء ج ۱ ص ۳۳۰

طرح گزاری؟ انہوں نے کیا کردار اپنایا؟ اور کیوں اپنایا؟ معاشرے پر اپنی زندگی میں اور بعد میں کیا اثرات مرتب کیے؟ لیکن وہ کب پیدا ہوئے اور کب وفات پائی؟ اس بارے میں بعض افراد کا خیال ہے کہ اس کی کیا ضرورت ہے؟ معلوم ہے کہ ایک دن وہ دنیا میں آئے اور ایک دن اس دنیا سے رخصت ہوئے۔ شاید بات یہی درست ہو۔ ایسی شخصیات کبھی نہیں مرتیں اور ہمیشہ تاریخ کے ساتھ زندہ ہیں۔ لیکن تاریخ نویس تاریخ پیدائش اور تاریخ وفات کو مشخص کرنا اپنی پیشہ وارانہ ذمہ داری سمجھتا ہے۔ اس لئے کہ وہ مورخین اور سیرت نگاروں کی سنت اور روش کی پیروی کرنا اپنا فریضہ جانتا ہے اور اس وجہ سے بھی کہ یہ تاریخیں تاریخ کے عظیم افراد کی زندگی کے تمام واقعات سے ایک طرح سے مربوط ہو جائیں۔

اس کتاب میں اگرچہ اس کی ضرورت ہے لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ تمام تر سعی و کوشش کو بروئے کار لانے کے باوجود رسول اللہ کی بیٹی کے سال پیدائش کے متعلق کوئی صحیح اور دقیق اطلاع نہیں دی جاسکتی۔ یہ صرف جناب فاطمہ (س) کی تاریخ پیدائش کا مسئلہ نہیں کہ جس میں مورخین متفق نہیں ہیں بلکہ دین کے پیشواؤں اور آئمہ معصومین علیہم السلام بلکہ خود رسول اکرم کی تاریخ ولادت اور تاریخ وفات میں سے کسی ایک پر بھی مورخین کا اتفاق نہیں ہے۔ یہ سب اختلاف کیوں پیش آیا؟ پہلی فصل میں اس کا مختصر جواب دیا جا چکا ہے۔

اس زمانے میں واقعات کو محفوظ رکھنے اور لکھنے کا رواج نہیں تھا۔ راویوں نے جو کچھ سنا اسے ذہن نشین کر لیا۔ جو کچھ قوم کے بوڑھے اور بزرگ افراد کہہ دیتے قوم اسے قبول کر لیتی۔ کبھی کبھار کوئی اہم ترین واقعہ یا کوئی ایسا واقعہ جو نیا نیا وقوع پذیر ہوتا، تاریخ کا مبداء قرار پا جاتا۔ اس سے بڑی شخصیات کی تاریخ پیدائش اور تاریخ وفات کا حساب کرتے۔ جیسا کہ خود ہم نے اپنی زندگیوں میں اپنے بڑوں سے سنا ہے کہ فلاں سال سیلاب آیا، فلاں سال شہر برباد ہوا، فلاں سال قحط پڑا، فلاں سال دبا پھیلی وغیرہ۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کے واقعات و حادثات کی تاریخ کو اس کے چند سال بعد لوگ یاد رکھتے ہیں اور اسی کی بنیاد پر اپنے حساب و کتاب کرتے ہیں لیکن ایک مدت گزرنے کے بعد خود وہ واقعات مجہولات میں شامل ہو جاتے ہیں۔

مورخین نے لکھا ہے کہ پیغمبر اکرم کی ولادت باسعادت عام الفیل میں ہوئی۔ جس سال ابرہہ اپنے ہاتھیوں سمیت خانہ کعبہ کو تباہ و برباد کرنے کے لئے آئے تھا۔ عام الفیل کئی سالوں تک مکہ کے لوگوں کو یاد رہا۔ لیکن ہم اگر جاننا چاہیں کہ یہ واقعہ کس سال میں رونما ہوا تو بذات خود یہ ایک مشکل ہے۔ اس کے باوجود مبداء تاریخ بننے والے واقعات کو درست بھی مان لیا جائے اور دقیق تاریخ سے یعنی شاہدوں کی غفلت اور فراموشی سے ہم صرف نظر کر لیں، پھر بھی یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ راویوں کا حافظہ کتنا ہی قوی کیوں نہ ہو کیا یہ غلطی نہیں کر سکتے؟ بالفرض پہلے درجے کے راوی

غلطی نہ کریں لیکن سو سال میں تقریباً تین نسلیں بدلتی ہیں، اس حالت میں کون اس بات کی ضمانت دے سکتا ہے کہ راویوں کے اس سارے سلسلے میں سب کا حافظہ کمال درجے کا ہے۔ نیز یہ کہ دو یا چند با اعتماد گواہ کسی کے قوی حافظہ کی تعریف کر دیں تو یہ علم روایت یا درایت اور اصول یافتہ کے کام کے حوالے سے دلیل بن سکتا ہے، لیکن واقعات بیان کرنے میں جہاں روایتوں کا کوئی عمل دخل نہیں ہوتا، ایسا ضابطہ اور اصول کافی نہیں ہے۔ تاریخی واقعات کو محفوظ کرنے میں راویوں اور مؤرخین میں پائے جانے والے اختلاف کی مذکورہ دو وجوہ کافی ہیں، لیکن ان کے علاوہ اور اسباب کا اضافہ بھی کیا جاسکتا ہے۔ جیسا کہ ہم ملاحظہ کریں گے کہ ہماری زیر بحث شخصیت کے بارے میں بھی یہی صورت حال ہے۔

اہل تشن کے سیرت نگاروں اور مؤرخین نے عام طور پر حضرت فاطمة الزہرا (س) کی تاریخ پیدائش پانچ سال قبل از بعثت رقم کی ہے۔ جبکہ بعض شیعہ تاریخ نویسوں اور بڑے بڑے علماء کے مطابق ان کی ولادت بعثت کے پانچویں سال ہوئی ہے۔

ابن سعد ”طبقات“ میں، (۱) طبری ”تاریخ“ میں، (۲) بلاذری ”انساب الاشراف“ میں، (۳) ابن اثیر ”کامل“ میں، (۴) ابو الفرج اصفہانی ”مقاتل الطالبین“ میں، (۵) محمد بن اسحاق (۶) اور ابن عبد البر ”استیعاب“ میں (۷) اور دوسرے چند افراد نے اول الذکر تاریخ کو قبول کیا ہے اور عموم نے لکھا ہے کہ یہ وہ سال تھا جب قریش نے خانہ کعبہ کی تعمیر نو کی۔ بلاذری اس طرح روایت کرتا ہے:

ایک دن عباس بن عبدالمطلب حضرت علیؑ کے پاس آئے دیکھا کہ حضرت علیؑ اور حضرت فاطمہ (س) اس بات پر گفتگو کر رہے ہیں کہ دونوں میں سے کون بڑا ہے۔ عباس نے کہا علیؑ تم بڑے ہو کیونکہ تم خانہ کعبہ کی تعمیر نو سے چند سال پہلے پیدا ہوئے جبکہ میری بیٹی (فاطمہ) اس سال پیدا ہوئی جب قریش خانہ کعبہ کی تعمیر کر رہے تھے۔ (۸)

نیز طبری اور دوسروں نے صراحت کے ساتھ لکھا ہے کہ وفات کے وقت حضرت زہرا (س) کی عمر انتیس (۲۹) سال کے لگ بھگ تھی۔ (۹) لیکن یعقوبی جو اپنی زیادہ تر روایات میں منفرد ہے اس نے حضرت زہرا (س) کی عمر، وفات کے وقت تیس (۲۳) سال درج کی ہے۔ (۱۰) اس کے بقول حضرت زہرا (س) کی ولادت پیغمبر اکرمؐ کی بعثت والے سال میں ہوئی ہے۔

(۱) طبقات ابن سعد ج ۸ ص ۱۱ (۲) تاریخ طبری ج ۱۳ ص ۲۳۳ نیز ج ۳ ص ۱۸۶ (۳) بلاذری انساب الاشراف ص ۳۰۲ (۴) ابن اثیر کامل ج ۲ ص ۳۳۱ (۵) مقاتل الطالبین ص ۴۸ (۶) نقل از مجلسی بحار الانوار ص ۲۱۳ (۷) استیعاب ص ۷۵۰ (۸) انساب الاشراف ص ۳۰۳۔ (۹) ج ۳ ص ۱۸۶۹۔ (۱۰) یعقوبی ص ۹۵ ج ۲

اسی شہرت کے برخلاف شیعہ علماء اور محدثین مثلاً کلینی نے کافی (۱) میں، ابن شہر آشوب نے مناقب، (۲) علی بن عیسیٰ اربلی نے کشف الغمہ (۳) اور مجلسی نے بحار الانوار میں دلائل الامامہ اور دوسری کتب (۴) سے نقل کرتے ہوئے لکھا ہے کہ رسول اللہ کے منصب رسالت پر مبعوث ہونے کے پانچ سال بعد حضرت زہرا کی ولادت ہوئی۔ صرف مصباح المتہجد (۵) میں شیخ طوسی کی تحریر اس مشہور روایت کے برخلاف ہے۔ کیونکہ انہوں نے حضرت زہرا (س) کی حضرت علی سے شادی کے وقت عمر تیرہ سال لکھی ہے اور اگر ان کی شادی ہجرت کے پانچ ماہ بعد ہونے کو ہم تسلیم کریں تو ان کی ولادت بعثت کے پہلے سال میں ماننا پڑے گی اور یہ رائے یعقوبی کے قول سے مطابقت رکھتی ہے۔ روایات میں اس اختلاف کے ساتھ کسی ایک کی سند کو قبول کرنا اور دوسری سند کو چھوڑ دینا نہایت مشکل نظر آتا ہے، جیسا کہ ہم نے مقدمے میں اشارہ کیا ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں خارجی قرائن کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ ممکن ہے ان قرائن کی مدد سے کسی ایک طرف کا پلڑا بھاری ہو جائے اور اسے اختیار کرنے میں آسانی ہو سکے اور یوں نتیجے کے طور پر اسے مرجع قرار دے دیا جائے۔

ایک قابل ذکر اور قوی قرینہ شیعہ علماء اور محدثین کی روایات میں عمومی طور پر پایا جاتا ہے، جو اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ دختر رسول اکرم کی ولادت بعثت کے بعد ہوئی تھی۔ یہ قرینہ حضرت زہرا (س) کی پیدائش کا معراج النبی سے باہم مربوط ہوتا ہے۔ معراج کی روایات کے ضمن میں رسول اللہ نے فرمایا کہ شب معراج مجھے بہشتی سیب دیا گیا اور میری بیٹی فاطمہ (س) کا نطفہ اسی پھل سے وجود میں آیا (۶)۔

اگر مورخین نے معراج کی تاریخ کو بطور دقیق معین کر دیا ہوتا، مثلاً بعثت کے کون سے سال میں یہ واقعہ ہوا تو کوئی مشکل پیش نہ آتی۔ لیکن دوبارہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ معراج رسول اکرم کس سال واقع ہوئی تھی؟ اس سوال کا جواب بھی واضح نہیں ہے۔ ابن سعد نے ایک روایت کے مطابق ہجرت مدینہ سے اٹھارہ ماہ پہلے اس واقعہ کا وقوع ذکر کیا ہے اور دوسری روایت کی بنا پر ہجرت سے ایک سال قبل کا واقعہ کہا ہے۔ (۷) اور ابن اثیر نے تین سال اور بروایت ایک سال قبل از ہجرت بیان کیا ہے۔ جب کہ شیعہ علماء نے بعثت کے دو سال بعد سے لے کر ہجرت سے چھ ماہ پہلے تک اس کی تاریخیں بیان کی ہیں۔ جب روایات کے اختلاف کا سامنا ہوا تو اس کی وجہ یہ بتائی گئی کہ حضور اکرم کئی بار آسمان پر تشریف لے گئے تھے۔ (۸) لیکن جو بات اہل سنت کے مورخین اور محدثین کے قول کی تائید کرتی ہے وہ یہ ہے کہ حضرت فاطمہ (س) اس سال پیدا ہوئیں جب قریش نے خانہ

(۱) اصول کافی ص ۲۵۸ ج ۱ مناقب ج ۳ ص ۳۵۷ (۳) کشف الغمہ ج ۱ ص ۲۴۹ (۴) الامامہ ج ۳ ص ۷ (۵) مصباح المتہجد ص

۵۶۱ (۶) بحار ج ۳ ص ۱۵ از علل الشرائع (۷) الکامل ص ۵۱ ج ۲ (۸) منہجی الآمال ص ۲ ج ۲

کعبہ کو دوبارہ بتایا۔

خانہ کعبہ کی تعمیر نو کا واقعہ تاریخوں میں بیان ہوا ہے اور پیغمبر اکرمؐ کی حیات طیبہ کی تاریخ سے واقف سب افراد اس واقعہ کو جانتے ہیں۔ مختصر طور پر یہ واقعہ یوں ہے کہ ایک دفعہ سیلاب کی وجہ سے خانہ کعبہ گر گیا۔ لہذا اس کی تعمیر نو کی گئی۔ جب تعمیر کے دوران میں حجر الاسود کو نصب کرنے کا مرحلہ آیا تو اس سعادت کے حصول میں قریش کے قبائل کے درمیان اختلاف اور نزاع پیدا ہو گیا۔ ہر گروہ کا سردار یہ چاہتا تھا کہ یہ افتخار اس کے حصے میں آئے۔ نوبت یہاں تک آن پہنچی کہ قریب تھا کہ جنگ چھڑ جاتی۔ آخر کار وہ سب اس بات پر متفق ہو گئے کہ جو بھی سب سے پہلے دروازے سے اندر داخل ہو گا اس کا فیصلہ مان لیں گے۔ سب سے پہلے آنحضرتؐ دروازے سے اندر داخل ہوئے۔ سب نے کہا وہ ائمن ہیں اور ہم انہیں اپنے درمیان خگم (منصف) کے طور پر قبول کرتے ہیں۔ آپؐ سے ماجرا بیان کیا گیا۔ آپؐ نے فرمایا ایک چادر یا بڑا کپڑا پھیلایا جائے۔ اس کے بعد آپؐ نے حجر الاسود اٹھا کر چادر پر رکھا اور چار قبیلوں کے سرداروں سے کہا کہ وہ ایک ایک کونہ پکڑ لیں اور زمین سے اٹھائیں۔ ان سب نے چادر کو زمین سے اٹھایا۔ آپؐ نے حجر الاسود اٹھا کر اس کی جگہ پر رکھ دیا۔ یوں آپؐ نے اپنی انوکھی تدبیر سے طویل اور مسلسل قتل و غارت سے انہیں بچالیا۔ حضرت محمدؐ کا فیصلہ کرنا اور حجر الاسود کو نصب کرنا، ان مقدمات کے ساتھ ہو تو یقیناً یہ بعثت سے پہلے کا واقعہ ہے۔ کیونکہ بعثت کے پانچویں سال میں قریش پیغمبر اکرمؐ کے سخت دشمن تھے۔ لہذا انہیں فیصلہ کرنے کا حق ہر گز نہ دیتے۔

دیگر خارجی قرائن کو مختصر طور پر ذیل میں ذکر کیا جاتا ہے:

- ۱۔ ایک دن اونٹ کا فضلہ اور اوچڑی، ابو جہل کے کہنے پر رسول اللہؐ پر گرائی گئی۔ حضرت فاطمہ (س) کو معلوم ہوا تو وہ مسجد الحرام گئیں اور اس گندگی کو اپنے بابا کے لباس سے صاف کیا (۱) قریش کی طرف سے حضور اکرمؐ کے ساتھ ایسا ہتک آمیز سلوک ظاہر بعثت کے دسویں سال سے پہلے، رسول اللہؐ کی طائف ہجرت سے پہلے، شعب ابی طالب کے محاصرہ اور بایکات سے پہلے تھا۔ اگر حضرت فاطمہ (س) کی پیدائش کو بعثت کے پانچویں سال تسلیم کیا جائے تو اس وقت ان کی عمر تین سے پانچ سال سے زیادہ نہ تھی اور بعید ہے کہ اس عمر کی بچی مسجد جائے اور وہاں پر ایسا کام انجام دے۔
- ۲۔ جنگ احد کے دن جب حضرت فاطمہ (س) نے سنا کہ ان کے بابا کا چہرہ زخمی ہوا ہے تو وہ چند عورتوں کے ساتھ آپؐ کی خدمت میں گئیں اور جب باپ کو دیکھا تو ان کے گلے میں ہاتھیں ڈال کر روئیں اور پھر آپؐ کے چہرہ اقدس سے خون صاف کیا۔ (۲) اگر ہم واقعہ معراج کو بعثت کے پانچویں

(۱) انساب الاشراف ص ۲۵۵ مآخذ دیگر (۲) انساب الاشراف ص ۳۲۳۔ معاذی ص ۳۲۹

سال مانیں تو اس وقت احد کے واقعہ میں کسی قسم کا عدم امکان نظر نہیں آتا لیکن اگر اٹھارہ ماہ یا چھ ماہ ہجرت سے پہلے والی روایت صحیح ہو تو اس وقت تسلیم کرنا پڑے گا کہ جنگ احد کے موقع پر حضرت فاطمہ (س) کی عمر پانچ سال یا اس سے کم تھی۔ جیسا کہ آئندہ آئے گا حضرت زہرا کی شادی ہجرت کے دوسرے سال ذوالحجہ میں جنگ احد سے پہلے انجام پائی۔ یعنی اس وقت ان کی عمر نو سال یا اس سے زیادہ تھی۔

۳۔ جیسا کہ ہم لکھیں گے، شیعہ روایات میں یہ بات مذکور ہے کہ حضرت زہرا بعثت کے پانچ سال بعد پیدا ہوئیں اور یہ وہ سال تھا جب قریش خانہ کعبہ دوبارہ تعمیر کر رہے تھے۔ قریش کے سرداروں کے درمیان ثالثی کرانا حتمی طور پر بعثت سے پہلے کا واقعہ ہے۔ کیونکہ بعثت کے پانچ سال پہلے اور بعد میں قریش آنحضرتؐ کے ساتھ اچھا سلوک روا نہیں رکھتے تھے۔ چہ جائیکہ وہ آپؐ کو امین سمجھیں اور آپؐ کی ثالثی فیصلے کے سامنے اور وہ بھی اتنے بڑے مسئلہ میں سر تسلیم خم کریں۔

۴۔ ہم جانتے ہیں کہ مؤرخین نے حضرت خدیجہ کی نبی اکرمؐ سے شادی کے وقت عمر چالیس سال لکھی ہے۔ اگر ہم کہیں کہ حضرت فاطمہ زہرا (س) کی ولادت بعثت کے پانچویں سال ہوئی ہے تو پھر ماننا پڑے گا کہ اس وقت حضرت خدیجہ کی عمر ساٹھ سال تھی۔ اگرچہ یہ امر محال تو نہیں ہے لیکن بعید نظر آتا ہے۔ دوسری طرف علامہ مجلسی نے امالی صدوق سے اس مضمون کی روایت نقل کی ہے:

حضرت خدیجہ نے رسول اللہؐ سے شادی کی تو مکہ کی عورتوں نے حضرت خدیجہؓ سے دوری اختیار کر لی، ان کے ہاں آنا جانا چھوڑ دیا۔ نہ ان سے ملتیں اور نہ انہیں سلام کرتیں اور نہ ہی کسی عورت کو ان کے پاس جانے دیتیں۔ چنانچہ جب زہراء (س) کی ولادت قریب ہوئی تو حضرت خدیجہ نے قریش اور بنی ہاشم کی عورتوں کو مدد کے لیے بلایا، لیکن انہوں نے صاف جواب دے دیا اور کہا: تم نے ہماری نصیحت کو نہ مانا اور ابوطالب کے یتیم بھتیجے سے شادی کر لی۔ (۱)

اگر اس روایت کو اسی طرح قبول کر لیا جائے اور جناب زہرا کی ولادت کو بعثت کے پانچویں سال مانا جائے تو اس وقت حضرت خدیجہ کی آنحضرتؐ سے شادی اور حضرت زہرا (س) کی ولادت میں بیس سال کا وقفہ بنتا ہے۔

ان بیس سالوں میں ملامت کرنے والی عورتوں میں کچھ مر کھپ گئی ہوں گی۔ جو جوان تھیں وہ بوڑھی ہو چکی ہوں گی اور نابالغ لڑکیاں جوان ہو گئی ہوں گی اور تمام تر صورت حال بدل

(۱) امالی صدوق از مجلسی ج ۳ ص ۶۔

پچی ہو گی۔ اب حضرت محمدؐ ابو طالب کے یتیم بھتیجے نہیں ہیں، بلکہ اللہ کے پیغمبر ہیں۔ لوگوں کا ایک گروہ ان کا دل و جان سے گرویدہ اور ان کا پیروکار ہے۔ قریش کے مردوں کی یہ آرزو ہے کہ آپؐ ان سے مدد طلب کریں اور وہ اس امداد طلبی کو غنیمت شمار کرتے ہوئے اپنے تئیں اسے موافقت اور رفع اختلاف کا مقدمہ قرار دیں۔

ان حالات میں ہو سکتا ہے قریش کی عورتیں جن کے شوہر رسول اکرمؐ کے دشمن ہیں حضرت خدیجہ کی بات کو ٹھکرا دیں لیکن بنی ہاشم کی عورتیں کیوں مثبت جواب نہ دیں؟ اور اصولی طور پر حضرت خدیجہ کو اس وقت کافر اور بت پرست قریش کی عورتوں کی مدد کی کیا ضرورت تھی؟ کیا مسلمان عورتیں اس کام میں ان کی مدد نہیں کر سکتی تھیں۔ یہاں پر یہ بات کہنا مناسب ہے کہ ان راویوں کی روایت پر اکتفا نہیں کیا جاسکتا جو صرف اپنے حافطے پر اعتماد کرتے ہوئے روایت نقل کریں۔

کشف الغمہ میں ایک اور روایت بیان ہوئی ہے:

حضرت فاطمہ (س) بعثت کے پانچ سال بعد پیدا ہوئیں اور یہ وہ سال تھا

جب قریش نے خانہ کعبہ کو دوبارہ تعمیر کیا۔۔۔ (۱)

ہمیں یوں لگتا ہے کہ سب سے پہلے راوی یا بعد والے راویوں میں سے کسی ایک نے روایت نقل کرنے میں غلطی کی ہے اور اس کے ذہن میں بعثت سے پہلے کی بجائے بعثت کے بعد کا لفظ یاد رہ گیا اور اس نے پھر یونہی آگے نقل کر دیا۔ جیسا کہ ہم نے کہا کہ خانہ کعبہ کی عمارت کی تعمیر نو بعثت سے پانچ سال پہلے ہوئی ہے۔ بالفرض اگر ہم یہ تسلیم کر لیں کہ اس تاریخ کے بعد بھی خانہ کعبہ کی کئی دفعہ تعمیر ہوئی ہے (جیسا کہ بعض متاخرین نے اس کا احتمال بتایا ہے) مسلم ہے کہ قبائل کے درمیان وہ جھگڑا دوبارہ پیش نہیں آیا ہو گا اور اگر یہ واقعہ بھی تکرار ہوا ہو تو جیسا کہ ہم نے بیان کیا انہوں نے ثالثی کے لیے رسول خداؐ کو ہرگز قبول نہیں کیا ہو گا اور اگر خانہ کعبہ کی تعمیر نو کے ساتھ یہ تمام واقعات وقوع پذیر نہ ہوئے ہوں تو پھر اس کی اس حد تک اہمیت نہیں رہتی کہ یہ مبداء تاریخ قرار پائے۔ بہر حال جو چیز مسلم ہے وہ یہ ہے کہ حضرت زہرا (س) کی ولادت اور خانہ کعبہ کی تعمیر نو ایک ہی سال میں ہوئی ہے اور اس کا ذکر شیعہ و سنی دونوں کی چند روایات میں موجود ہے۔

جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے کہ ان روایات کے بارے میں بحث کا فائدہ سوائے تاریخ کے تعین کے اور کوئی نہیں ہے۔ رسول خداؐ کی بیٹی بعثت سے پانچ سال پہلے پیدا ہوں یا پانچ سال بعد، نو

(۱) کشف الغمہ ج ۱ ص ۴۴۹۔ بحار ج ۳۳ ص ۷

سال کی عمر میں ان کی شادی ہوئی یا اٹھارہ سال میں۔ اٹھارہ سال کی عمر میں دنیا سے رخصت ہوئی ہوں یا اٹھائیس سال کی عمر میں۔ وہ نبی آخر الزمانؐ کی دختر، تربیت یافتہ خاتون کا کامل نمونہ اور اعلیٰ اسلامی اخلاق کے زیور سے آراستہ ہیں۔ ان کی زندگی سے ہر مسلمان مرد اور عورت کو جو درس لینا چاہیے، وہ ان کے تقویٰ، پارسائی، پرہیزگاری، بردباری، فضیلت، خدا پر ایمان، خوف الہی اور دوسری اعلیٰ انسانی اقدار کا درس ہے۔ وہ سب اعلیٰ صفات کی مالک تھیں۔ ان صفات کا ذکر ہم آگے چل کر کریں گے۔

اس بحث کو ہم نے اس لئے تفصیل کے ساتھ بیان کیا تا کہ مؤرخین اور محدثین کی سنت کا بھی لحاظ رکھا جائے۔



فُطِمَتْ فَاطِمَةُ مِنَ الشَّرِّ

(امام صادقؑ - روضة الواعظین ج ۱ ص ۱۳۸)

فاطمہ (س) کو شر سے پاک کر دیا گیا ہے۔

سیرت نگاروں اور محدثین نے دختر رسولؐ کے چند القاب ذکر کئے ہیں: زہراء، صدیقہ، طاہرہ، راضیہ، مرضیہ، مبارکہ، بتول اور دوسرے القابات۔ ان میں سے لقب زہرا زیادہ مشہور ہے اور کبھی کبھی ان کے نام کے ساتھ آتا ہے۔ یعنی فاطمہ زہرا یا عربی ترکیب فاطمة الزہراء۔ عرف عام میں ان کے نام کی بجائے بیشتر زہرا استعمال ہوتا ہے۔ لغت کے اعتبار سے زہرا کا لفظ درخشندہ، روشن اور اس کے مترادف معنوں کا حامل ہے۔ یہ لقب ہر لحاظ سے اس بانو کے شایان شان ہے۔ وہ مسلمان خاتون کا درخشندہ چہرہ، معرفت کی تابندہ روشنی، پرہیز گاری اور خدا پرستی کا روشن نمونہ ہیں۔ یہ درخشندگی کسی خاص لمحے یا معین دن کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ جس دن انہوں نے اپنا فرض نبھایا اس دن سے لے کر آج تک وہ اسلامی تربیت کی پیشانی پر گوہر کی مانند درخشندہ ہیں۔

ان میں سے بعض القاب اور ان کے اسباب و وجوہات کے حوالے سے محدثین نے بہت سی روایات نقل کی ہیں۔ ان سب کے ذکر کرنے سے گفتگو طویل ہو جائے گی۔ مجموعی طور پر ان روایات سے حضرت فاطمہ (س) کے باپ اور شوہر کی نظر میں ان کے بلند مقام و مرتبے اور ان کی عظمت کو سمجھا جاسکتا ہے۔ اسی طرح اسلام میں اور مسلمانوں کے درمیان ان کی قدردانیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کے تمام اسلامی مذاہب کے پیرو کار معترف ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ شیعہ کتب میں اکثر اور اہل سنت کی معتبر کتابوں میں کبھی کبھار حضرت فاطمہ (س) کی فضیلت پر علیحدہ کتاب دیکھنے کو مل جاتی ہے یا ان کتابوں میں فضائل کے بارے میں روایات پر مشتمل جداگانہ ابواب ذکر کئے جاتے ہیں۔

ان کا اسم گرامی فاطمہ (س) ہے۔ فاطمہ فطم کے مصدر سے اسم صفت ہے اور فطم عربی

لغت میں کاٹنے، قطع کرنے اور جدا ہونے کے معنوں میں آیا ہے۔ اس صیغہ کا جو کہ فاعل کے وزن پر مفعولی معنی دیتا ہے، یہاں پر معنی کٹا ہوا اور جدا شدہ ہیں۔

فاطمہ کس چیز سے علیحدہ اور جدا ہے؟ شیعہ اور سنی کتب میں پیغمبر اسلام کی ایک حدیث نقل ہوئی ہے کہ آپؐ نے فرمایا: ان کا نام فاطمہ رکھا گیا چونکہ وہ اور ان کے شیعہ دوزخ کی آگ سے جدا ہیں (۱)۔ علامہ مجلسی نے ایک روایت عیون اخبار الرضا سے نقل کی ہے۔ عیون اخبار الرضا کے راوی نے اپنی اسناد کے ساتھ اسے علی بن محمد بن موسیٰ الرضا علیہما السلام اور محمد بن علی علیہما السلام سے نقل کیا ہے۔ انہوں نے مامون سے اور مامون نے ہارون سے، اس نے مہدی سے اور مہدی نے اپنی سند کے ساتھ ابن عباس سے روایات کی ہے کہ ابن عباس نے معاویہ سے پوچھا کہ کیا تم جانتے ہو کہ فاطمہؑ کو فاطمہؑ کیوں کہتے ہیں؟ اس نے جواب دیا نہیں! ابن عباس نے بتایا کہ کیونکہ وہ اور ان کے شیعہ دوزخ میں نہیں جائیں گے۔ (۲) قتال نیشاپوری نے امام صادقؑ سے ایک حدیث نقل کی ہے کہ فاطمہ (س) چونکہ برائیوں اور بدیوں سے دور اور جدا ہیں اس لئے انہیں فاطمہ کہا جاتا ہے۔ (۳) اسی قسم کے مفہوم پر مشتمل دوسری احادیث بھی منقول ہوئی ہیں۔ اسی طرح اس کے صیغہ اسم صفت کے مذکورہ معانی کے علاوہ اور معانی بھی بیان ہوئے ہیں۔ (۴)

ظہور اسلام سے پہلے دو یا تین عورتوں کے نام فاطمہ تھے۔ جو اسلام میں فواطم کے نام سے مشہور ہیں۔ جیسے اسد بن ہاشم کی بیٹی فاطمہ، عتبہ بن ربیعہ کی بیٹی فاطمہ۔ (۵) اور عمر بن عائد کی بیٹی فاطمہ۔ (۶)

حضرت زہرا (س) کی پرورش نبوت کے گھر میں اپنے باپ رسول خداؐ کی آغوش میں ہوئی۔ وہ اس گھر میں پروان چڑھیں جو فرشتوں کی آماجگاہ اور مرکز نزول وحی و آیات قرآن تھا۔ وہ جگہ جہاں مسلمانوں کا اولین گروہ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر ایمان لایا اور اپنے ایمان پر ثابت قدم رہا۔ ان کے دلوں کو اللہ نے آزمایا اور ان کی قرآن میں مدح فرمائی۔ دین کی تعلیم و تربیت حضرت زہرا (س) نے حضرت محمدؐ جیسے معلم سے حاصل کی جو معلم انسانیت تھے۔ جب تک دین باقی ہے، دین و دانش کا چراغ آپؐ کے دم سے روشن و تابندہ رہے گا۔

یہ چھوٹی سی بچی ان مسلمانوں کو دیکھتی کہ وہ آیات قرآن کی تعلیم لینے اور اللہ کی عبادت و بندگی کے احکام سیکھنے روزانہ کس شوق اور گرجوشی کے ساتھ ان کے بابا کے پاس آتے ہیں۔ یہ وہ گھر تھا جس سے تکبیر کی آواز بلند ہوئی۔ جہاں پروردگار عالم کی بارگاہ میں حاضر ہونے کی ابتدا ہوئی

(۱) بحار ص ۱۸ ج ۳۳ از المالی شیخ طوسی۔ نسائی، حافظ ابوالقاسم دمشقی۔ (۲) بحار ص ۱۲ ج ۳۳۔ (۳) روضۃ الواعظین ص ۱۳۸۔

(۴) بحار ص ۱۲۔ (۵) ابن سعد ج ۳ ص ۳ لسان العرب ذیل فلم۔ (۶) یعقوبی ج ۲ ص ۸۔

اور ہر روز و شب، خاص اوقات میں وحدہ لاشریک کی بزرگی کا ذکر شروع ہوا۔ ان ایام میں پورے عرب بلکہ پورے جہان میں صرف ایک ہی گھر تھا جہاں سے ”اللہ اکبر“ کی صدا بلند ہوتی تھی۔ مکہ میں فاطمہ زہرا اسی چھوٹی لڑکی تھیں جو اپنے ارد گرد اس جوش و جذبے کا مشاہدہ کرتیں۔ اس آسمانی آواز نے اور ان بے مثال اعمال عبادت نے اس کسین بچی کی روح پر جو اثرات مرتب کئے یہ کئی سالوں بعد آشکار ہوئے۔

وہ گھر میں اکیلی تھیں اور انہوں نے اپنا بچپن تنہائی میں گزارا۔ ان کی دو بہنیں رقیہ اور ام کلثوم (۱) ان سے چند سال بڑی تھیں۔

گھر میں ان کے ساتھ کھیلنے کے لئے کوئی بھولی نہ تھی۔ شاید ان کی تنہائی بھی ان عوامل میں سے ایک عامل ہو جس کی وجہ سے بچپن ہی میں ان کی تمام تر توجہ جسمانی ریاضت و عبادت اور روحانی تعلیم و تربیت کی طرف مرکوز ہو گئی۔ اللہ اکبر کی تعلیم پھر اَشْهَدُ اَنْ مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللّٰہ کا درس۔ آہستہ آہستہ دوسری آیات نازل ہوئیں اور درس میں وسعت آتی گئی۔ قرآنی اخلاق کے درس اور انسانی عادات و اطوار اور اقدار کے حصول کی تعلیمات اور یہ کہ تمام لوگ اللہ اور اس کے قانون کے سامنے برابر ہیں، کسی کو دوسرے پر کوئی برتری حاصل نہیں، خدا کے حضور آقا اور غلام مساوی ہیں، تمہارا فرض ہے کہ غلاموں کے ساتھ، قیدیوں کے ساتھ، غریبوں اور مسکینوں کے ساتھ مہربانی کرو اور ان سے خوش اسلوبی سے پیش آؤ۔ اپنی لڑکیوں کو لڑکوں کی طرح سمجھو اور ان کے ساتھ سختی سے پیش مت آؤ۔ ان تعلیمات کے نازل ہونے اور انہیں مسلمانوں کو سکھانے اور مسلمانوں کے ان تعلیمات کے حصول میں جوش و جذبے کے ساتھ ساتھ حضرت زہرا (س) نے اپنے باپ کے ساتھ رشتہ داروں اور مکہ والوں کی دشمنی کو بھی دیکھا۔ وہ لوگ ان باتوں کو پسند نہیں کرتے تھے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ ان احکامات اور تعلیمات سے لوگ آگاہ ہوں، جو اس سے پہلے سنی، نہ دیکھی گئی تھیں۔ ان تعلیمات کے پھیلنے نے ان کی زندگیوں کو درہم برہم کر دیا تھا۔ انہوں نے اپنے ڈر اور خوف کو چھپانے اور اپنے خیال میں ان تعلیمات کے اثرات زائل کرنے کے لیے آپ پر جہتیں لگائیں کہ آپ جادو گر ہیں، دیوانے ہیں۔ کہاں ابو طالب کا یتیم بھتیجا اور کہاں پیغمبری؟ یہ وحی کے اور یثرب کے کسی بڑے امیر آدمی پر کیوں نازل نہیں ہوئی وغیرہ۔ (۲) انہوں نے کہا کہ کہیں معاملہ ہمارے ہاتھوں سے نکل نہ جائے، لہذا اس کے لئے کوئی تدبیر کرنی چاہیے۔ لیکن اگر انہیں قتل کریں

(۱) اکثر شیعہ مؤرخین کی یہ رائے ہے کہ حضرت رقیہ اور ام کلثوم آنحضرت کی اپنی بیٹیاں نہیں بلکہ دبیباہن تھیں۔ مترجم

(۲) وَقَالُوا لَوْلَا نَزَلَ هَذَا الْقُرْآنُ عَلَى رَسُولٍ مِّنَ الْفَرِثِيِّينَ عَظِيمٍ (ذخرف: ۳۱) اور کہتے ہیں: یہ قرآن دونوں بیٹیوں میں سے کسی بڑے آدمی پر کیوں نازل نہیں کیا گیا؟

تو ابو طالب اور بنی ہاشم سے جنگ کرنا ہو گی۔ اس لئے بہتر یہی ہے کہ ان کے پیرو کاروں کو ان کے پاس سے منتشر کر دیا جائے اور اگر وہ زبان سے نہ سمجھیں اور اسے نہ چھوڑیں تو پھر ڈنڈے کے زور سے انہیں دور کیا جائے۔

چھوٹے آدمی کے پاس کون سا ہتھیار ہوتا ہے؟ دشنام، گالی، لڑائی، جھگڑا اور اگر ممکن ہو تو قتل۔ چھوٹے شہر میں خبریں بڑی تیزی سے پھلتی ہیں۔ خاتونِ جنتؑ کے بابا کا گھر ان دنوں ایسے واقعات اور خبروں کے انعکاس کا مرکز تھا: آج بلال کو شکنجے دئے گئے۔ آج عمار کو ظلم و ستم کا نشانہ بنایا گیا۔ آج عمار کی ماں کو شہید کر دیا گیا۔ آج آپؐ کے چچا ابو لہب نے یہ کہا اور ابو جہل نے یہ کہا اس کی۔ روزانہ اسی قسم کی بری اور روح فرسا خبریں آتیں۔ یہاں تک کہ ایک دن انہوں نے سنا کہ بابا نے اپنے پیرو کاروں کو حبشہ کی طرف ہجرت کا حکم دیا ہے، کیونکہ ان کے والد گرامی مسلمانوں پر ظلم و ستم اور مصائب کو دیکھنا برداشت نہیں کر سکتے تھے، آخر یہ لوگ اپنا گھر بار چھوڑ کر سفر کی صعوبتیں کیوں جھیلیں؟ اور اس جگہ کی طرف جائیں جس کے بارے میں یہ نہیں جانتے کہ وہ کہاں ہے؟ اس سے پناہ طلب کریں جسے نہیں جانتے کہ وہ کون ہے۔ اس کا طرز عمل کیسا ہے؟ ان کے بابا نے انہیں بتایا کہ نجاشی اپنے پاس پناہ لینے والوں کے ساتھ اچھا سلوک کرتا ہے لیکن انہوں نے کون سا جرم کیا ہے کہ وہ اس کے پاس جا کر پناہ مانگیں؟ وہ کیوں غریب الوطنی کا غم سہیں؟ کیا حقیقت میں، خانہ کعبہ کے اندر خدا کے نام پر لکڑی اور پتھر دلوں کے بتوں کی اتنی قدر و منزلت ہے؟ کیا قریش کے بزرگ لوگ نہیں جانتے کہ انسانوں کے ہاتھوں سے بنائے ہوئے یہ بت نہ فائدہ پہنچا سکتے ہیں نہ نقصان؟ یہ بات نہیں۔ یہ لوگ ایک اور چیز سے خوفزدہ ہیں اور وہ ایسے نقصانات ہیں جو محمدؐ کی دعوت کے پھیلنے سے انہیں لاحق ہوں گے:

الَّذِي جَمَعَ مَالًا وَعَدَّدَهُ يَحْسَبُ أَنَّ مَالَهُ أَخْلَدَهُ كَلَّا لَيُنْبَذَنَّ فِي الْحُطَمَةِ . (سورہ مہرہ)

وہ جس نے مال جمع کیا اور اسے گنتا رہا۔ وہ خیال کرتا ہے کہ اس کا مال اسے ہمیشہ باقی رکھے گا۔ نہیں، ہر گز ایسا نہیں ہے۔ یہ مال اسے دوزخ کی آگ میں پھینک دے گا۔

جی ہاں! جنگ شروع ہو چکی ہے۔ کچھ لوگ چاہتے ہیں کہ مخلوق کی اطاعت سے خالق کی اطاعت کی طرف لوٹ آئیں۔ غلامی کا طوق گردنوں سے اتار بھیٹکیں اور آزاد ہو جائیں۔ اسی کی خاطر وہ ان تمام مصائب و آلام کو اپنی جان کے بدلے خرید رہے ہیں۔ لیکن خدا کی اطاعت و بندگی چھوڑ کر شیطان کی بندگی کو ہر گز قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ جبکہ ان کا مخالف گروہ یہ چاہتا ہے کہ سب لوگ اسی طرح ان کی خدمت گزاری میں لگے رہیں اور ان کی مال و دولت میں

اضافے کا سبب بنتے رہیں۔ ان تمام واقعات میں ہر ایک اپنے لحاظ سے حضرت زہرا کے ظاہر اچھوٹے لیکن معنوی اعتبار سے بڑے دل پر اثر ہوا۔ ہر واقعہ نے انہیں ایک درس اور پیغام دیا۔ استقامت اور ثابت قدمی کا درس دیا۔ وہ لوگ جو اللہ کی حکومت کے سامنے گردن جھکا دیتے ہیں اور اپنے قول پر ثابت قدم رہتے ہیں، ان پر فرشتے نازل ہوتے ہیں۔ (۱) اس جہان میں روحانی اطمینان و سکون اور اگلے جہان میں بہشت جادواں اس شخص کے نصیب میں ہے جو مصائب و مشکلات میں پامردی اور استقامت دکھائے اور شیطانی مکر وہ حیلوں سے نہ گھبرائے۔ یہ وہ سبق تھے جو مسلمانوں کو سکھائے جاتے تھے۔ حضرت فاطمہ (س) کا اس ہستی کے ساتھ بلا واسطہ تعلق تھا جن کے قلب مقدس پر یہ الٰہی احکامات اور تعلیمات نازل ہوتی تھیں۔ لہذا وہ آپ سے ان کی علیحدہ تعلیم حاصل کرتی تھیں۔ حضرت زہرا کو یکے بعد دیگرے ان تمام آزمائشوں سے گزرنا چاہیے تھا۔ کیونکہ لوہے کو جتنا زیادہ پگھلایا جائے اتنا زیادہ مضبوط اور طاقتور ہوتا ہے۔ لیکن یہ آزمائشیں نہ ختم ہونے والی ہیں۔ ہر روز نیا امتحان اور ہر شب نئی مشکل۔

آزمائش و مشکلات کی گھڑیاں یکے بعد دیگرے گزرتی گئیں۔ ہر آزمائش پہلی سے سخت اور تلخ تھی۔ آزمائشوں اور ابتلاء کا سلسلہ لگا تار، دشوار تر اور دردناک تر ہوتا گیا۔ دھکیوں، دھمکیوں، تکلیفوں، بھوک اور زندگی کی سختیوں کی تمام بھینوں سے گزارا گیا۔

ایک دن انہوں نے سنا کہ ان کے بابا جان پر اونٹ کی غلاظت پھینکی گئی ہے اور آپ کے لباس مبارک کو گندگی سے آلودہ کر دیا گیا ہے۔ وہ فوراً اپنے والد گرامی کی خدمت میں پہنچتی ہیں اور اپنے باپ کے لباس کو صاف اور پاک کرتی ہیں۔ دوسرے دن انہیں یہ خبر ملی کہ ان کے باپ کے پاؤں کو پتھر مار کر زخمی کر دیا ہے۔ ان تمام زیادتیوں کا جیسا کہ دشمن لوگ چاہتے تھے کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ نہ حضور اکرمؐ اپنی دعوت و تبلیغ سے دست بردار ہوتے ہیں اور نہ آپ کے اصحاب آپ کا ساتھ چھوڑتے ہیں۔ کچھ مدت کے بعد شکست خوردہ اور غم و غصے سے بھرے قریش ایک زیادہ سخت فیصلہ کرتے ہیں اور وہ فیصلہ بنی ہاشم کے اقتصادی و معاشرتی بایکاٹ کا تھا کہ انہیں معاشی اور معاشرتی طور پر محاصرہ میں لیا جائے۔ بھوک اور لوگوں سے قطع تعلق انہیں اچھا سبق سکھائے گا۔ اگر یہ کچھ مدت تک اسی حالت میں رہے تو اکتا جائیں گے اور آخر کار تنگ آکر اپنے آرام و سکون کی خاطر ہی سہی، محمدؐ کی حمایت سے دستبردار ہو جائیں گے۔ اس وقت محمدؐ کے سامنے دو راستے ہوں گے یا اپنے مشن سے ہاتھ اٹھالیں گے یا قریش کے ہاتھوں قتل ہو جائیں گے۔ مکہ سے کچھ فاصلے پر

(۱) اِنَّ الْاٰمِنِيْنَ قَالُوْا رَبَّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَغَاثُوْا فَتَنَزَّلَ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ... (نفلت: ۳۰) تحقیق جو کہتے ہیں، ہمارا پروردگار اللہ ہے پھر ثابت

قدم رہتے ہیں ان پر فرشتے نازل ہوتے ہیں

موجود شعب ابی طالب کا شہر بدر کئے جانے والے افراد کے لئے انتخاب کیا گیا۔ ان کے ساتھ خرید و فروخت اور ملنا جلتا سب بند کر دیا گیا۔ ان تک غذا، خوراک اور لباس پہنچانے کو ممنوع قرار دے دیا گیا۔ بنی ہاشم کتنی مدت تک اس دھشتاک گھائی میں رہے؟ یہ صحیح طور پر معلوم نہیں۔ ابن ہشام نے یہ مدت دو یا تین سال لکھی ہے۔ اس دوران میں حضرت زہرا (س) پر کیا گزری؟ اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ اس زندگی کا زیادہ تر بھاری بوجھ ان کے کندھوں پر تھا۔ لیکن ان سب تکلیفوں سے زیادہ سخت اور دردناک غم عزیزوں کی وفات کا تھا۔

حضرت خدیجہ (س)

اور حضرت ابو طالب (ع) کی وفات

تقدیر الہی تھی کہ اسلام کی پہلی مسلمان خاتون اور ایثار و قربانی کا مجسمہ بی بی جناب خدیجہ کبریٰ اور حضرت ابو طالب کی وفات تھوڑے وقفے کے ساتھ ایک ہی سال میں ہوئی (۲) فاطمہ زہرا (س) نے قرآن سے درس سیکھا تھا۔ انہیں اس آزمائش سے بھی گزرنا تھا۔ اپنے عزیزوں کی جدائی ان کے لیے ایک اور امتحان تھا۔ انہیں ان مشکلات و تکالیف کو تحمل و برداشت کرنا اور اپنے رب کی بشارت کا انتظار کرنا تھا۔ (۳) پہلی آزمائش جسمانی تھی، لیکن یہ روحانی طاقت کا امتحان ہے۔ حضرت خدیجہ گھر میں ان کے باپ کی غم خوار تھیں اور حضرت ابو طالب گھر سے باہر دشمنوں کے مقابلے میں آپ کی حمایت کرتے تھے۔ حضرت ابو طالب کے ہوتے ہوئے مشرکین مکہ آپ کی جان کو کوئی ضرر نہیں پہنچا سکتے تھے، کیونکہ ان کا خاندان (قبیلہ بنی ہاشم) بہت بڑا تھا۔ اگرچہ ان کے پاس بنی زہرہ یا بنی مخزوم یا بنی حرب جیسی دولت اور طاقت تو نہ تھی لیکن شرافت و بزرگواری میں کوئی قبیلہ ان کے ہم پلہ نہ تھا۔ مکہ کے سردار اور مالدار لوگ یہ جانتے تھے کہ اگر وہ محمد کی جان کے درپے ہوں تو بنی ہاشم خاموش نہیں بیٹھیں گے اور چہ بسا دوسرے قبائل اور طوائف بھی ان کی حمایت میں اٹھ کھڑے ہوں۔ انہوں نے مجبوراً اپنے سینوں کے اندر بغض و کینے کی آگ کو انہیں آزار و تکلیف دے کر ٹھنڈا کیا۔ دشنام، تمسخر، گالی گلوچ، طعنہ زنی، منہ چڑانا، پتھر مارنا، اور تہمتیں لگانے کے حربے وہ بزدل استعمال کرتے تھے۔ تقدیر کا لکھا تھا کہ ان سب چیزوں کو فاطمہ زہرا (س) دیکھیں اور یہ تمام

(۱) ابن ہشام ج ۱ ص ۳۷۵

(۲) کلینی کے بقول حضرت طالب کا انتقال حضرت خدیجہ کی وفات سے ایک سال بعد واقع ہوا۔ اسول کافی ج ۱ ص ۳۴

(۳) زینبیر الصبرین ۵ الذین إذا أصابهم مصیبة قالوا انا لله وانا الیہ راجعون ۵ (بقرہ: ۱۵۵-۱۵۶) ان صبر کرنے والوں کو

خوشخبری دیئے۔ جو مصیبت میں مبتلا ہونے کی صورت میں کہتے ہیں کہ ہم تو اللہ ہی کے ہیں اور اسی کی طرف ہمیں پلٹ کر جانا ہے۔

مصائب و مشکلات جھیلنے کے بعد یہ دو صدے بھی برداشت کریں۔

اب جناب فاطمہ (س) اس گھر کی لڑکی نہیں ہے۔ وہ اب عبد اللہ، عبد المطلب، ابو طالب، اور خدیجہ کی جائین ہیں۔ ام ایہا (اپنے باپ کی ماں) کیسی مناسب کنیت ہے۔ اب انہیں اپنی ماں والے فرائض ادا کرنا ہیں۔ وہ اپنے باپ کے لئے بیٹی کا کردار بھی ادا کرے گی اور ماں کے فرائض بھی انجام دے گی۔

اگر ہم اس بات کو قبول کریں کہ حضرت زہرا (س) کی ولادت بعثت سے پانچ سال پہلے ہوئی ہے تو اس صورت میں ان کے اسی ماں والے کردار کی وجہ سے سترہ سال تک ان کی شادی نہ ہو سکی یا انہوں نے کرنا نہ چاہی۔ وہ اپنے باپ کو اکیلا نہیں چھوڑنا چاہتی تھیں۔ وہ سمجھتی تھیں کہ جس قدر ہو سکے گھر کے اندر رسول اکرم کو آرام و سکون بہم پہنچائیں۔ کیونکہ اب پیغمبر اکرم کے پاس خدیجہ جیسی ہمدرد اور غم خوار ہستی نہیں ہے اور نہ ابو طالب جیسا حمایت کرنے والا سرپرست ہے۔ اب مشرکین کی دشمنی شدت اختیار کر گئی ہے۔ انہیں دلجوئی کی ضرورت ہے اور رسول خدا بھی ان کے ایثار و فداکاری کے جذبے کو دیکھتے ہوئے محبت و مہربانی کے ساتھ اپنی رضا و خوشنودی کا اظہار فرماتے۔ ان واقعات کے کئی سالوں بعد جب حضرت عائشہ سے پوچھا گیا کہ وہ جنگ جمل میں کیوں آئیں تو انہوں نے کہا کہ اس داستان کو نہ دہرائیے گا۔ (۱) انہوں نے کہا کہ میں نے فاطمہ کے بابا کے سوا فاطمہ (س) سے زیادہ کسی کو سچا نہیں پایا۔ (۲) ممکن ہے ان افراد کے ذہنوں میں، جنہوں نے پیغمبر اکرم اور ان کے اہل بیت کی سیرت کا دقیق مطالعہ اور تحقیق نہیں کی یا جنہوں نے شریعت محمدی اور اسلام کی روح کو جیسا کہ چاہیے تھا لمس نہیں کیا، یہ بات آئے کہ یہ محبت جبلت انسانی کے تحت ہر باپ کی اپنی اولاد سے محبت کی طرح ہے۔ ایک لحاظ سے ان کا خیال شاید صحیح ہو، کیونکہ ہم یہ نہیں کہتے کہ فاطمہ زہرا (س) سے رسالت کی محبت شفقت پدری کے جذبے سے خالی تھی۔ کیونکہ حضرت محمد باپ تھے اور حضرت فاطمہ (س) ان کی بیٹی تھیں۔ لہذا باپ بیٹی کا رشتہ موجود تھا، لیکن یہ کو یہ روایت اور تھوڑے بہت الفاظ کے اختلافات کے ساتھ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے منقول دیگر روایات ایک اور حقیقت کی نشاندہی کرتی ہیں۔ یہ پیغمبر اکرم کے دور اور بعد کے اکابر اسلام کی نگاہوں میں حضرت زہرا (س) کی عظمت و بزرگی ہے۔ جناب فاطمہ (س) کو یہ مقام و مرتبہ صرف اس وجہ سے نہیں ملا کہ وہ رسول اللہ کی بیٹی ہیں۔ جس چیز نے انہیں اس بلندی تک پہنچایا وہ ان کا ایثار، پارسائی، زہد، دانش اور دوسرے انسانی ملکات ہیں جو ان میں حد کمال کو پہنچے ہوئے تھے۔ سب شیعہ و

(۱) بحار ج ۲۳ ص ۲۲۳ از ابی مخنف طوسی

(۲) مناقب ج ۱ ص ۲۶۲

سنی مؤرخین نے ان کے ان فضائل اور امتیاز کو اپنی معتبر کتب میں بیان کیا ہے۔
حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے پوچھا گیا کہ بعض لوگ آپ سے ایک حدیث نقل کرتے ہیں جو ناقابل قبول ہے۔ وہ کہتے ہیں:

فاطمہ (س) کی ناراضگی سے اللہ تعالیٰ ناراض ہوتا ہے۔ (۱)

امام صادق علیہ السلام نے فرمایا:

کیا تمہاری کتابوں میں یہ حدیث موجود نہیں ہے کہ بندہ مؤمن کی ناراضگی سے خدا ناراض ہو جاتا ہے؟
انہوں نے جواب دیا: ”کیوں نہیں۔“

امام نے فرمایا:

پس تمہیں اس بات پر کیوں اعتبار نہیں آتا کہ فاطمہ (س) ایک با ایمان خاتون ہوں اور ان کے ناراض ہونے سے خدا بھی ناراض ہو جائے۔ (۲)

حضرت خدیجہ اور حضرت ابو طالب کی وفات نے رسول اکرمؐ کو بھی سخت رنجیدہ اور غمزدہ کر دیا۔ آپؐ اب اپنے آپ کو تنہا اور کسی غم خوار اور پشت پناہ کے بغیر محسوس کر رہے تھے۔ لیکن ان تمام حالات میں خدا آپؐ کا مدد گار تھا اور اللہ کی بندگی کی دعوت آپؐ کا شعار تھا۔ آپؐ نے طائف کا سفر اختیار کیا، اس امید پر کہ اس شہر کے طاقتور قبیلے ثقیف کے افراد میں سے کسی کو شاید الہی دین میں داخل کر سکیں۔ لیکن وہاں کے سرداروں اور دیگر لوگوں نے نہ صرف آپؐ سے برا سلوک کیا بلکہ آپؐ کو اتنی تکلیف دی اور اتنا ستایا کہ آپؐ لبو لہان ہو گئے۔

الہی دین کی اس شمع کو بجھانے کے لئے اہل مکہ نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا لیکن اس سے انہیں کچھ حاصل نہ ہوا۔ ہر روز صدائے اسلام میں قوت آتی گئی اور روز سننے نئے افراد کے کانوں تک اس کی گونج سنائی دینے لگی۔ مشرکین قریش کا آخری حربہ یعنی معاشی بائیکاٹ بھی ناکام ہو گیا۔ یہاں تک کہ قوم کے لیڈروں نے خود اس معاہدہ کو توڑ دیا۔ اب انہوں نے ایک اور فیصلہ کیا۔ اب جبکہ مکہ میں محمدؐ کا کوئی حامی و ناصر، یعنی حضرت ابو طالب نہیں ہے، لہذا اب ان کا خاتمہ کر دیا جائے۔ البتہ ان کے قتل میں سب قبائل شریک ہوں تاکہ بنی ہاشم ان کا انتقام اور قصاص کسی سے نہ لے سکیں۔ لیکن شیطانی مکر و فریب کو تقدیر الہی کے سامنے دوام نہیں ہے۔ ان کی سازش سے کچھ مدت پہلے دعوت اسلام کا مرکز مکہ سے پانچ سو کلومیٹر دور شہر یثرب میں منتقل ہو چکا تھا یا اس سے بہتر

(۱) خوارزمی ج ۱ ص ۶۰

(۲) بخاری ج ۲۲ ص ۲۳

الفاظ میں یوں کہیں کہ اسلام کی دعوت و اشاعت کے لئے ایک جدید مرکز کھل گیا تھا۔ فاطمہ زہرا (س) کے بابا کے اصحاب ایک ایک کر کے یا گروہ کی شکل میں اپنے گھربار چھوڑ کر یثرب کی طرف ہجرت کر رہے تھے۔ یثرب کے لوگوں نے، جنہیں اس کے بعد تاریخ اسلام میں ”انصار“ کا لقب دیا گیا، ان ہجرت کرنے والے مسلمانوں کا نہایت پر تپاک استقبال کیا اور ان کی ہر ضرورت کو پورا کیا۔ یہاں تک کہ اپنے آپ پر انہیں ترجیح دی۔ جس رات قریش نے اپنی سازش کو عملی جامہ پہنانے کا منصوبہ بنایا کہ پیغمبر اسلام کو تمام قبائل پر مشتمل گروہ قتل کر دے، آنحضرتؐ نے اپنے بستر پر حضرت علیؑ کو سلا دیا اور خود حضرت ابو بکرؓ کے ساتھ یثرب کا سفر اختیار کیا۔ یہ وہی عظیم واقعہ ہے جو چند سالوں بعد مسلمانوں کی تاریخ کا مبداء قرار پایا اور آج تک ”تاریخ ہجری“ کے نام سے رائج ہے۔

مدینہ میں آہستہ آہستہ تمام امور سنبھلنے لگے۔ ایک مسجد بن گئی۔ مہاجرین اپنے نئے گھروں میں آباد ہو گئے۔ آنحضرتؐ نے جناب فاطمہ (س) کو ہجرت کا حکم دیا۔ بلاذری لکھتے ہیں: زید بن حارثہ اور ابو رافع سیدہ فاطمہ (س) کو لے آئے۔ (۱) لیکن ابن ہشام نے لکھا ہے کہ عباس بن عبدالمطلب کو فاطمہ (س) کے لانے پر مامور کیا گیا تھا۔ (۲) بہر حال سیدہ زہرا اپنے لانے والے کے ساتھ اپنی سواری پر سوار ہوئیں۔ قافلے نے سفر شروع کر دیا۔ اس دوران میں حویرث بن نقید جو حضورؐ کا بڑا سخت دشمن تھا اور ہمیشہ آپؐ کی بد گوئی کرتا تھا، قافلے کے پاس آیا اور اس نے ان کے اونٹ کو زخمی کر دیا۔ اونٹ بدک گیا اور فاطمہ (س) گر پڑیں۔ ابن ہشام اور دیگر مؤرخین نے اس حادثے میں حضرت زہرا (س) کو پہنچنے والے کسی ضرر کا ذکر نہیں کیا۔ لیکن ظاہر ہے کہ اس میں انہیں کچھ نہ کچھ ضرر ضرر پہنچا ہو گا۔ اس پست فطرت شخص کا شمار ان افراد میں ہوتا ہے، جن کے بارے میں فتح مکہ کے موقع پر رسول اللہؐ نے فرمایا تھا کہ یہ افراد اگر خانہ کعبہ کے غلاف سے بھی چٹے ہوئے ہوں تو پھر بھی ان کا خون بہایا جائے۔ حویرث، فاطمہ (س) کے شوہر نامدار حضرت علی (ع) کے ہاتھوں واصل جہنم ہوا۔ (۳) ان اسناد کے برخلاف درجہ اول کے مورخ یعقوبی لکھتے ہیں کہ حضرت فاطمہ سلام اللہ علیہا کو حضرت علی علیہ السلام مدینہ سے لائے تھے۔ (۴) البتہ شیعہ روایات یعقوبی کے قول کی تائید کرتی ہیں۔ آخر کار وعدہ الہی پورا ہوا۔ مسلمان، مشرکوں اور دشمنوں کے شر سے آسودہ خاطر ہوئے۔ تاریخ اسلام میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوا۔ اس کے بعد وہ نہ صرف اپنے مذہبی مراسم اور عبادات بغیر خوف و خطر اور مکمل آزادی کے ساتھ انجام دے سکتے تھے، بلکہ اب وہ اس پوزیشن میں تھے کہ دوسروں کو بھی دین حق قبول کرنے کی دعوت دیں اور اگر وہ قبول نہ کریں تو پھر ان سے جنگ کریں۔

(۲) ج ۲ ص ۳۱

(۳) ابن ہشام ج ۴ ص ۹

(۱) انساب الاشراف ص ۳۱۳ و ۲۶۹

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (آب: ۲۱)

تحقیق تمہارے لیے اللہ کے رسول میں بہترین نمونہ ہے۔

مہاجرین کو مدینے آئے ہوئے دو سال یا اس سے کچھ زیادہ عرصہ گزر گیا۔ ان دو سالوں میں مسلمانوں کے سیاسی اور معاشرتی حالات میں قابل ذکر تبدیلیاں ہوئیں۔ اسی طرح بعض سر یہ (۱) پیش آئے جن میں مسلمانوں کو فتح و کامیابی نصیب ہوئی۔ اس کے نتیجے میں مسلمانوں کے امور میں کچھ آسانیاں پیدا ہو گئیں اور مخالف قبائل کے سامنے مسلمانوں کی حیثیت و طاقت میں اضافہ ہوا۔ اسی طرح وہ چند قبائل جو مسلمانوں اور یہودیوں کے درمیان لڑائی میں حالت تردد میں تھے وہ یا تو غیر جانبدار ہو گئے یا مسلمانوں کے ساتھ ہو گئے اور یہی حال منافقین مدینہ کا تھا۔

ان سب سے بڑی اور اہم کامیابی غزوہ بدر میں مسلمانوں کی فتح تھی۔ جس نے مکہ کی افسانوی قدرت و طاقت کو درہم برہم کر دیا اور قریش کے سرداروں کی شان و شوکت کو خاک میں ملا دیا۔ وہ افراد، قبائل جو ابھی تک مکہ والوں کی ناراضگی مول نہیں لینا چاہتے تھے، سمجھ گئے کہ قریش اور ان کے تاجر بھی قابل شکست ہیں۔

رسول اکرمؐ کی گھریلو زندگی میں بھی تبدیلی آئی۔ زمعہ بن قیس کی بیٹی حضرت سودہ اور حضرت ابو بکر کی بیٹی حضرت عائشہؓ آپ کی بیویاں بن کر آپ کے گھر آ گئیں۔ حضرت سودہ کی شادی ہجرت سے چند ماہ پہلے ہوئی۔ (۲) جبکہ حضرت عائشہؓ کی شادی ہجرت کے پہلے سال ماہ شوال میں انجام پائی۔ (۳) اگرچہ ان دونوں بیویوں میں سے کوئی بھی حضرت خدیجہ کی کچی حضرت فاطمہ زہرا (س) اور

(۱) رسول اللہؐ کے زمانے میں آپ کے حکم سے مسلمان ایسا جنگوں میں شریک ہوئے جن میں آپ نے ہدایت خود شرکت نہیں فرمائی، جنہیں سر یہ کہا جاتا ہے۔

(۲) بلاذری۔ انساب الاشراف ص ۱۰۷

(۳) ایضاً ص ۳۰۹

حضور پاکؐ کی نظر میں پورا نہ کر سکتی تھی لیکن پھر بھی وہ آنحضرتؐ کا خیال رکھتیں۔ اب اس لحاظ سے جناب زہراؑ کو اپنے والد گرامی کے حوالے سے پریشانی نہ تھی۔ حضرت عائشہؓ کی عمر نو سال تھی اور حضرت سودہ سکوان بن عمرو بن عبد شمس کی بیوہ تھیں۔ سکوان نے جیشہ ہجرت کرنے والے مسلمانوں کے دوسرے گروہ کے ساتھ ہجرت کی۔ حضرت سودہؓ بھی ان کے ہمراہ تھیں۔ (۱) مکہ واپس آنے کے بعد سکوان فوت ہو گئے تو حضرت سودہؓ سے آپؐ نے نکاح کر لیا۔ اب اگر حضرت فاطمہؓ (س) کی شادی ہو جائے اور وہ اپنے شوہر کے گھر سدھار جائیں تو ان کے والد کا خیال کرنے والے موجود ہیں۔

یہ امر مسلم ہے کہ جناب فاطمہؓ زہراؑ (س) کے رشتہ کے خواہاں کئی افراد تھے۔ اس بارے میں روایات کے ذکر کی ضرورت نہیں ہے۔ ان کے والد کا مقام اعلان نبوت سے پہلے اپنی قوم میں بہت بلند اور ارجمند تھا۔

جناب فاطمہؓ (س) کی تربیت وحی کے زیر سایہ مرکز نزول قرآن میں ہوئی تھی۔ جیسا کہ آپ اس کتاب میں ملاحظہ فرمائیں گے اور اس کے مآخذ پہلے درجے کی اسلامی تاریخ ہے۔ حضرت ابو بکر اور حضرت عمرؓ بھی جناب فاطمہؓ کے خواستگاروں میں سے تھے۔ جب انہوں نے رسالتؐ کی خدمت میں اپنی خواہش کا اظہار کیا تو آپؐ نے فرمایا کہ میں اللہ کے فیصلے کا منتظر ہوں۔ (۲) اہل سنت کے بہت بڑے محدث امام نسائی اپنی کتاب سنن میں کہتے ہیں: پیغمبر اسلامؐ نے ان کے جواب میں فرمایا: ”فاطمہؓ (س) چھوٹی ہیں۔“ جب حضرت علیؓ نے خواستگاری کی تو آپؐ نے قبول فرما لیا۔ (۳) البتہ اس حدیث کو ایسے باب میں نقل کیا جس کا عنوان ہے: ”عورت و مرد کا ہم عمر ہونا۔“ مذکورہ دو اصحاب کا نام اس لئے بیان کیا جاتا ہے کیونکہ یہ دو باقی اصحاب کے لحاظ سے زیادہ معروف اور مشہور ہیں، نہ اس لئے کہ نبیؐ کی بیٹی کے لئے انہی دو بڑی عمر کے بوڑھے مردوں کے رشتے آئے۔ یعقوبی نے لکھا ہے کہ مہاجرین میں سے کئی افراد نے آپؐ سے فاطمہؓ (س) کا رشتہ مانگا۔ (۴) جناب فاطمہؓ (س) کی خواستگاری اور حضرت علیؓ علیہ السلام سے ان کی شادی کے حوالے سے جو ہم بیان کریں گے، وہ سب کچھ اور شیعہ اور سنی کتب میں آچکا ہے۔ ان کے علاوہ بھی بعض روایات ملتی ہیں لیکن ان کا مفہوم اور مطلب بھی یہی ہے۔ شاید تھوڑا بہت اختلاف روایات کے الفاظ میں موجود ہو۔ یہ روایات اور جو کچھ بلاذری،

(۱) انساب الاشراف ص ۲۱۹۔ الامامہ ج ۲ ص ۱۰

(۲) ابن سعد طبقات ج ۸ ص ۱۱۔

(۳) سنن ج ۱ ص ۶۲۔ فاطمہ الزہراء ص ۲۵ ج ۲۔

(۴) یعقوبی ج ۲ ص ۳۱

اسحاق، ابن ہشام، طبری جیسے مؤرخین اور کلینی، مفید اور شیخ طوسی جیسے علماء نے تحریر کیا ہے، بعد کے مصنفین کے لئے واحد اسناد و مآخذ کا درجہ رکھتے ہیں۔ شیعہ ہو یا سنی مغربی ہو یا مشرقی جو بھی ان پہلی اور دوسری صدی ہجری کے واقعات کے بارے میں کتاب لکھنا یا تحقیق کرنا چاہے، اسے انہی کتابوں کی طرف رجوع کرنا ہو گا۔ اس کتاب کے مصنف نے بھی یہی انداز اختیار کیا ہے۔ اگر مستشرقین کی کتاب میں ایسا مطلب یا بات نظر آئے جو ان بنیادی کتابوں میں نہ ہو تو اسے رد کر دینا چاہیے یا کم از کم اس کی صحت میں شک کرنا چاہیے۔ ہمیں ہر گز نہیں کہنا چاہیے کہ شاید ان کے پاس ایسے مدارک ہوں جو ہماری دسترس میں نہ ہوں۔ کون سے مآخذ؟ انہوں نے ان مآخذ کو کہاں سے حاصل کیا؟ صدر اسلام کی تاریخ لکھنا، ایشیائی اور حموی تہذیبوں کے بارے میں تحقیق کی طرح نہیں یا دور ہخامنشی کی پتھروں پر کندہ تحریروں کو پڑھنا نہیں یا انیسویں اور بیسویں کی سائنسی ایجادات پر ریسرچ نہیں ہے کہ ہم کہیں کہ ان غیروں کے پاس ایسے وسائل ہیں جو ہمارے پاس نہیں ہیں۔ اس قسم کی تصدیقات یکطرفہ اور اندھی تھلید کہلا سکتی ہیں۔ جس کی وجہ احساس کمتری یا ان کا آلہ کار بننا یا مختلف کتب اور مدارک کی طرف رجوع اور تحقیق کرنے کی فرصت یا ہمت کا نہ ہونا ہے۔

البتہ ہم اس بات کا انکار نہیں کرتے کہ بعض موارد میں تاریخی واقعات اور مسائل کے تجزیہ و تحلیل میں مغرب کے محققین کی روش بعض گزشتہ مشرقی مؤرخین کی روش سے زیادہ عمیق اور گہری ہے۔ لیکن جہاں اصل واقعہ درجہ اول کی اسناد کے ساتھ واضح طور پر موجود ہو، وہاں نص کے مقابلے پر اجتہاد معنی نہیں رکھتا۔

ہمیں ان مستشرقین سے کوئی گلہ شکوہ نہیں ہے جو حقیقت تبدیل کر دیتے ہیں یا حقائق کی اس طرح تاویل و تفسیر کرتے ہیں جو ان کے عقیدے (یہودیت یا عیسائیت) کے مطابق ہو۔ ان سے شکوہ کرنا بھی نہیں چاہیے۔ کیونکہ یہ لوگ معذور ہیں۔ ہمیں تعجب تو اپنے تاریخ دان دوستوں پر ہوتا ہے جو مکمل طور پر ان کے اقوال و بیانات کے سامنے سر تسلیم خم کر دیتے ہیں۔ ان کی تحریروں کو مسلم حقیقت اور ناقابل اعتراض سمجھ لیتے ہیں۔ جب ان کے سامنے ان محققین کی غلطیوں کو رکھا جاتا ہے تو وہ یہ بہانہ کر کے ان سے چشم پوشی اختیار کر لیتے ہیں کہ ان کا ہم پر استاد والا حق ہے۔ اس کم ہمتی، سہل انگاری یا نا آگاہی کا نتیجہ یہ ہے کہ آج تاریخ اسلام کے اکثر شعبوں پر یہودی مستشرقین کا قبضہ ہے۔ وہ جو چاہتے ہیں لکھتے ہیں۔ پھر ان کا عربی اور فارسی ترجمہ ہوتا ہے اور وہ مسلمان مؤرخین کی تحقیقات کا منبع قرار پا جاتا ہے۔

کبھی کبھار ہمارے ایرانی برادران عربوں کے بارے میں حسن ظن سے کام لیتے ہوئے ان کی کتابوں کا بلا تبصرہ اور کسی قسم کا اظہار نظر کئے بغیر عربی سے فارسی میں ترجمہ کر دیتے ہیں۔ پھر یہی تحریروں ان افراد کے لئے منبع علم قرار پاتی ہیں جو صدر اسلام کی تاریخ سے کما حقہ واقفیت نہیں

رکھتے۔ اس کی ایک مثال ملاحظہ فرمائیں:

چونکہ فاطمہ (س) بد صورت تھی اس لیے سترہ سال یا اس سے بھی زیادہ عرصہ باپ کے گھر بیٹھی رہیں اور کوئی ان کا رشتہ لینے نہ آیا۔ ایک دن ان کے باپ نے آ کر بتایا کہ علیؑ رشتہ لینے آئے ہیں تو انہوں نے اظہار تعجب کرتے ہوئے کہا: کیا ایسا ممکن ہے؟

نعوذ باللہ! حقیقت کی پردہ پوشی، جنگ جوئی اور بد طینی انسان کو کس مقام تک لے جاتی ہے؟ اس قسم کے دانشور اور محققین چاہتے ہیں کہ تاریخی واقعات کا جدید علوم کی روشنی میں تجزیہ و تحلیل کریں۔ لیکن اس علم کو انہوں نے کس مأخذ سے اور کس طرح سیکھا؟ یہ معلوم نہیں۔

اگر رسول اللہؐ کی لخت جگر کی ولادت بعثت کے پانچویں سال ہوئی ہو تو اس وقت یہ مسئلہ پیش ہی نہیں آتا اور اگر ان کی ولادت بعثت کے پانچ سال پہلے ہو اور سترہ سال کی عمر میں شادی ہو تو اس کی دلیل ہم نے بیان کر دی ہے کہ مسلمانوں کی معاشرتی صورتحال، ہر قسم کا ڈر اور خوف، مشکلات و مصائب ہر کام میں رکاوٹیں، حبشہ کی طرف ہجرت، ایک طرف بنی ہاشم کا معاشی و معاشرتی بایکٹ، دوسری طرف ان کی ذاتی زندگی پر اثر انداز ہونے والے حادثات، مثلاً والدہ حضرت خدیجہ اور باپ کے چچا ابو طالب کی وفات، اس قسم کے حالات انہیں اس بات کی اجازت نہیں دیتے تھے کہ وہ اپنی شادی کے بارے میں سوچیں۔

وہ نہیں چاہتی تھیں کہ والدہ کی وفات کے بعد ان کے بابا کے گھر میں کوئی غمخوار اور ہمدرد نہ ہو۔ جیسا کہ ہم نے دیکھا کہ چند معتبر روایات ان کی ولادت کے بارے میں بیان کرتی ہیں کہ بعثت کے پانچویں سال ہوئی۔ اگر حقیقت یہ ہو تو یہ کہانی بالکل درست نہیں ہے اور اگر ہم اس روش کو نظر انداز کر کے ایک سمجھ دار اور دانشور مصنف کا طرز عمل اختیار کریں اور واقعات کی چھان بین جدید تحقیقات کی روشنی میں اور معاشرتی نظر سے کریں تو پھر بھی وہ نتیجہ نہیں نکلتا جو اس مستشرق نے اخذ کیا ہے۔ کیوں؟ اس لیے کہ:

بالعموم مورخین اور سیرت نگاروں نے حضرت محمدؐ کے بارے میں لکھا ہے کہ آپؐ کا چہرہ خوبصورت تھا اور جسم انتہائی مناسب ڈیل ڈول والا تھا۔ اسی طرح حضرت خدیجہ جہاں تک میں جانتا ہوں ایک خوبصورت اور حسین عورت تھیں۔ فطری طور پر خوبصورت والدین کی اولاد بھی اچھی شکل و صورت والی ہوتی ہے۔

سیرت نگاروں نے عمومی طور پر دوسری اور تیسری نسل تک ہاشمی لڑکیوں کی خوبصورتی اور چہرے کے حسن کو بیان کیا ہے۔ جب حسن بن حسنؑ اپنے چچا امام حسین علیہ السلام کے پاس ان کی دو بیٹیوں میں سے ایک کا رشتہ مانگنے گئے اور امام حسین علیہ السلام نے فرمایا ان دو میں سے جس کا رشتہ

چاہو لے سکتے ہو۔ حسن شرم کی وجہ سے چپ رہے اور کوئی جواب نہیں دیا۔ امام حسین علیہ السلام نے خود فرمایا: فاطمہ (س) کو تمہارے لئے منتخب کرتا ہوں جو کہ میری ماں کی شبیہ ہیں۔ (۱) جہاں تک معلوم ہے یہ فاطمہ (س) خاص حسن و جمال کی مالک تھیں۔ (۲) شیخ مفید نے لکھا ہے کہ یہ بی بی اتی خوبصورت تھیں کہ انہیں حور سے تشبیہ دی جاتی تھی۔ (۳)

اب اس بڑے مستشرق ”دانثور“ کا علمی انکشاف کس بنیاد اور کس مآخذ پر ہے؟ جو ہر واقعہ کی جدید علوم کی روشنی میں تحقیق کرنا چاہتا ہے۔ کیا یہ نص کے مقابلے میں اجتہاد اور متن تاریخ میں ملاوٹ نہیں ہے؟ اس نے جان بوجھ کر ایسا کیا ہے یا عربی سے عدم واقفیت کی بنا پر؟ ہم نہیں جانتے۔ لیکن اس عنوان سے کہ ”دروغ گورا حافظہ کم است“ یعنی جھوٹے آدمی کی یادداشت کمزور ہوتی ہے، مصنف موصوف اپنی کتاب میں جعل و افتراء، جھوٹ اور اپنی غلطیوں کے نشانات چھوڑتا ہے۔ اس نے اپنا مآخذ بلاذری کی کتاب کو قرار دیا ہے اور سب جانتے ہیں کہ اصولی طور پر اس کی مشہور کتاب انساب الاشراف ہے۔ کتاب ابھی میرے پاس موجود ہے۔ اس میں یہ عبارت موجود ہے:

پیغمبر اکرمؐ نے جناب زہرا سلام اللہ علیہا سے فرمایا کہ خاندان میں سب سے پہلے آپؐ مجھ سے آلیں گی۔ (۴) جناب سیدہ کے جسم میں جھر جھری آئی۔ رسول پاکؐ نے فرمایا: کیا آپ نہیں چاہتیں کہ جنت کی عورتوں کی ہر دار بنیں۔ جناب زہراؑ نے تبسم فرمایا۔

نہیں معلوم اس مستشرق نے اپنی علمی تحقیق کا نتیجہ اخذ کرنے میں ان دو روایتوں کو گڈمڈ کر دیا ہے یا جیسا کہ ہم نے لکھا کہ عربی سے کم آگاہی موجب بنی کہ وہ فاش غلطی کا ارتکاب کرے؟ یا زیادہ ”ایماندار“ مستشرقین کی طرح کسی خاص مشن پر مامور ہے؟ اور اس نے اپنا فرض نبھایا ہے۔ بہر حال ان میں سے کوئی بھی بے بنیاد ہو، نتیجہ ایک ہی ہے۔ ہم نے مستشرقین یا بشرق کے بارے میں مغربیوں سے زیادہ واقف مشرقی افراد کی کتابوں میں ایمانداری سے فرائض کے نبھانے کی بہت سی مثالیں دیکھی ہیں۔

اہل بیت اطہار کی محبت میں نسل در نسل زندگیاں گزارنے والے قارئین ایسے دشمنوں کے

(۱) مناقب العائین ص ۱۸۰ نیز ملاحظہ فرمائیں افغانی ج ۱ ص ۱۳۲ و ارشاد مفید ج ۲ ص ۲۲۔ نپ قریش ص ۵۱۔

(۲) نپ قریش ص ۵۱۔

(۳) ارشاد ص ۲۲ ج ۲۔

(۴) انساب الاشراف ص ۴۰۵ (تو جمعہ)

بیانات اور اقوال یا ایسے کج فکر افراد کی علمی اسماحت کی طرف متوجہ نہیں ہوتے۔ ممکن ہے یہ لوگ ہم پر اعتراض کریں کہ مذکورہ موضوع کے بارے میں اس کی استاوا مصاد کے متعلق اتنی تحقیق اور بحث کی کیا ضرورت ہے؟ درست ہے، ان لوگوں نے محبت اہل بیت کو ماؤں کے دلوں کے ساتھ پیار ہے اور اسے اپنے سے لگائے قبر میں جا لیں گے۔ وہ ایسے فضول قسم کے محققین کی باتوں سے متاثر نہیں ہوتے اور شاید کبھی بھی ان کی تحریریں نہ پڑھیں۔ لیکن یہ بات ہرگز فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ اہل بیت اطہار کی سیرت پر لکھی جانے والی یہ اور اس طرح کی دیگر کتابیں منہج کے لئے لکھی گئی ہیں۔

اسے افسوس کے ساتھ لکھوں یا مایہ خوش بختی کہوں کہ سو سال یا اس سے زیادہ عرصہ گزر رہا ہے کہ ہماری ثقافت مغربی ثقافت سے نزدیک ہوئی ہے اور بعض جگہوں پر آپس میں مخلوط ہو چکی ہے۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ سالوں سے مغربی محققین اور مستشرقین میں سے ہر ایک یا ہر گروہ اسلام کی تہذیب و تمدن اور ثقافت کے ہر شعبے میں ریسرچ کر رہا ہے اور اس بارے میں کتابیں لکھ رہا ہے۔ اسلامی تہذیب اور ثقافت اور بڑی بڑی اسلامی شخصیات کے بارے میں یورپ اور امریکہ کے اسلام کے متعلق تحقیقاتی مراکز میں ہر سال کئی کتابیں لکھی جاتی ہیں۔ حضرت محمدؐ، بعض ائمہ علیہم السلام اور جناب زہرا سلام اللہ علیہا کی حیات طیبہ کے بارے میں بہت ساری کتابیں ان مراکز سے چھپ چکی ہیں۔ ان میں سے بعض کا فارسی میں ترجمہ کیا جا چکا ہے یا ان کتابوں سے اقتباسات کو فارسی میں بیان کر دیا گیا ہے۔

لاہور میں گلدزیر، دور منکام، لونی، مسیحیون، برٹارڈ لوئیس، پڑوسیو، فیکس، رز وینس، مکیب اور دسیوں دیگر مستشرقین کی کتابوں کے تراجم تہران اور دوسرے شہروں میں بک سٹالوں پر دستیاب ہیں۔

ان میں سے اکثر علمی خیانت کے مرتکب ہوئے ہیں۔ ”بلاشر“ جیسا دانشور اور محقق جس نے اپنی ساری زندگی قرآن کے فرانسیسی زبان میں ترجمے میں صرف کر دی، اس نے اپنے ترجمے میں کئی قسم کا تبصرہ اور اظہار نظر کے بغیر سورہ نجم میں دو آیتوں کا اضافہ کر دیا ہے۔ وہی دو آیات جنہیں پہلی صدی ہجری کے اواخر میں کہانیاں گھڑنے والوں اور افسانہ نگاروں نے جعل کیا اور دشنام اسلام کے لئے ایک دستاویز اور ثبوت فراہم کیا۔ مصنف نے تیس سال پہلے افسانہ غرانیق کے عنوان سے ایک کتابچہ لکھا ہے۔ اس مقام پر ”بلاشر“ کی بدعتی کو اتفاق سے ملنے دیکھا ہے۔ کیا دوسرے مقامات پر بھی اس نے ایسا کام کیا ہے؟ اللہ بہتر جانتا ہے۔

اپنے ہم وطنوں میں ایسے افراد موجود ہیں جو اپنے خیال و گمان کے تحت اسلام کو سائنسی اور فلسفے کے آئینے میں سمجھنا اور جاننا چاہتے ہیں۔ وہ ان مستشرقین اور ایران شناس لوگوں کی کتابوں کو

اپنی تحقیق کی بنیاد قرار دیتے ہیں اور انہی پر ان کی تحقیقات کا دارومدار ہوتا ہے۔ آخر کار اس کا نتیجہ یہ برآمد ہوتا ہے کہ غلط ترجمہ کی بناء پر فضلی ابن حزم، حضرت علی ابن ابی طالب کو اپنے زمانے کا سب سے بڑا سرمایہ دار قرار دیتا ہے۔ اب ابن حزم نے یہ انکشاف کیسے کیا اور اس کا منہج کیا ہے؟ مصنف اسے اہمیت نہیں دیتا، لیکن ممکن ہے کچھ عرصے بعد یہی کتاب اسلام اور عربی سے صحیح واقفیت نہ رکھنے والے افراد کے لئے تحقیقات کی سند قرار پائے۔

اس کے باوجود میں ان کتابوں کے محترم مترجمین کی قدردانی کرتا ہوں۔ اگر کسی مکتب فکر سے ان کا نظریاتی لگاؤ نہیں ہے تو ان سے استدعا کرتا ہوں کہ وہ ایک اور زحمت بھی گوارا کریں کہ ان کتب کے مندرجات اور مطالب کو پہلے درجہ (پانچویں صدی ہجری کے آخر تک) کی کتابوں کے مطالب کے ساتھ موازنہ کریں۔ خدا نخواستہ وہ نا دانستہ طور پر کسی ایک یا کئی افراد کی گمراہی یا حقیقت سے دوری کا موجب نہ بنیں۔

ان مستشرقین کے بعض مقالات اور کتابوں کا عربی ترجمہ ہو چکا ہے اور چونکہ ایرانی عرب مترجمین اور مصنفین پر حسن ظن رکھتے ہیں، اس لئے انہوں نے ان تراجم کو آنکھیں بند کر کے فارسی میں منتقل کر دیا ہے۔ میں کم و بیش ان تراجم کے کمزور نقاط اور خامیوں سے آگاہ ہوں، لیکن میں پھر بھی یہ نہیں کہتا کہ یہ سب مؤلفین کج فکر یا اسلام دشمن ہیں۔

ممکن ہے عربی زبان سے کم واقفیت کی بناء پر یا تعصب سے عاری روایات و اسناد کی عدم دستیابی کی وجہ سے انہوں نے ایسے نتائج اخذ کئے ہوں۔ لیکن ان میں سے بعض کو میں قریب سے جانتا ہوں یا ان سے اس بارے میں گفتگو کر چکا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ وہ دلوں میں مسلمانوں سے ایسا کینہ و عناد رکھتے ہیں کہ اسے کبھی بھی فراموش نہیں کریں گے۔ کیوں؟ اس کا سبب خود ان سے پوچھنا چاہیے۔

میں ایک اسلام شناس دانشور کو جانتا ہوں جو اپنے شعبے میں لاثانی یا کم نظیر ہے۔ چند یورپی زبانوں میں مہارت کے علاوہ عربی زبان سے اس نے بہت زیادہ استفادہ کیا ہے۔ اس بنیاد پر اسے اسلام کی روح اور اس دین کے اصول و قوانین سے صحیح معنوں میں آگاہ ہونا چاہیے۔ وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ فاتحان عرب سب یکساں نہ تھے۔ ان میں سے اکثر دین کا درد رکھتے تھے۔ ان میں سے ایسے کم تھے جو دنیا کے پجاری تھے۔

اسلام کے بانی ہر دو قسم کے افراد کو خوب جانتے تھے۔ چنانچہ ارشاد فرمایا:

جو شخص خدا کی خاطر میدان جہاد میں جاتا ہے اس کا اجر خدا دے گا اور

جو مال غنیمت کے لالچ میں جاتا ہے اس کے حصے میں مال دنیا کے سوا کچھ

نہیں آئے گا۔ (بخاری ج ۱ ص ۲۲)

احتمال یہ ہے کہ مذکورہ مستشرق نے مجھ سے پہلے اس حدیث کو ملاحظہ کیا ہے۔ لیکن چونکہ وہ ایک خاص کتب فکر سے وابستہ ہے، اس لئے اپنی کتاب کا آغاز اس جملے سے کرتا ہے: ”مصر کی زرخیز زمین اناج اور پھلوں کی بھرپور پیداواری صلاحیت کی وجہ سے بھوکے عربوں کو سیر کر سکتی تھی۔“ میں نہیں کہتا کہ عمرو بن عاص نے رضائے الہی اور اسلام کی پیشرفت کے لئے مصر کی سرزمین پر قدم رکھا۔ مسلم ہے کہ جو خلوص افریقہ کو فتح کرتے وقت عقبہ بن نافع میں موجود تھا وہ اس میں نہ تھا۔ اگرچہ یہاں میں یہ بھی نہیں کہنا چاہتا کہ عقبہ نے شمالی افریقہ میں جو کردار ادا کیا وہ ہر لحاظ سے درست تھا۔

البتہ رسول اللہ کے سچے اصحاب جنہوں نے عمرو بن عاص کی قیادت میں وادی نیل میں قدم رکھے، وہ کیسے تھے؟ کیا وہ بھی اپنی بھوک و افلاس مٹانے گئے تھے اور پیٹ بھرنے کے لئے انہوں نے یہ سفر کیا؟ اس سے زیادہ اس موضوع کے متعلق بحث نہیں کرنا چاہتا۔ خداوند متعال سے اپنے لئے توفیق اور ان کی ہدایت کی دعا کرتا ہوں۔

جیسا کہ ہم لکھ چکے ہیں اور جیسا کہ درجہ اول کے محدثین و مؤرخین نے اپنی کتب میں نہایت وضاحت سے لکھا ہے اور شیعہ و سنی کی بنیادی روایات میں صراحت کے ساتھ موجود ہے، اسی طرح خارجی قرائن بھی ان مؤرخین کی تائید کرتے ہیں کہ نبی کریم کی بیٹی کے خواستگار بہت تھے، لیکن حضور اکرمؐ نے ان سب میں سے اپنے چچا زاد بھائی علی ابن ابی طالب کا انتخاب فرمایا اور انہیں حضرت زہرا (س) کا شریک حیات قرار دیا۔ آپؐ نے اپنی بیٹی سے فرمایا: میں نے آپ کے لئے ایسا شوہر منتخب کیا ہے جو سب سے زیادہ نیک، بااخلاق اور اسلام میں سبقت رکھتا ہے (۱)۔

ابن سعد لکھتے ہیں: جب حضرت ابو بکر اور حضرت عمر کو رسول اکرمؐ کی طرف سے مثبت جواب نہ ملا تو انہوں نے حضرت علیؑ سے کہا آپ خواستگاری کے لئے جائیں۔ وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ انصار کے چند آدمیوں نے حضرت علیؑ سے جناب فاطمہ (س) کا رشتہ مانگنے کو کہا۔ حضرت علیؑ (ع) پیغمبر اکرمؐ کے گھر تشریف لے گئے اور آپؐ کی خدمت میں بیٹھ گئے۔ آپؐ نے پوچھا:

ابو طالب کے بیٹے! کیسے آنا ہوا؟

..... فاطمہ (س) کی خواستگاری کے لئے۔

..... خوش آمدید۔ بہت اچھا! اس کے علاوہ آپؐ نے کچھ نہ فرمایا۔

جب حضرت علیؑ وہاں سے واپس آئے تو چند افراد نے آکر پوچھا کہ رسول خداؐ نے کیا جواب دیا؟ حضرت علیؑ نے فرمایا: مرحباً و اہل آفرمایا ہے۔

(۱) الریاض النضرۃ ج ۲ ص ۱۸۲۔ القدر ج ۳ ص ۲۰۔ نیز ملاحظہ فرمائیں باب ”شعرائے عرب سے انتخاب۔“

یہی جملہ کافی ہے۔ (۱) انہوں نے تمہاری خواہش اور خواستگاری کو قبول فرمایا ہے۔
یہ افتخار جو حضرت علیؑ کو نصیب ہوا اور انہیں رسول خداؐ کے داماد ہونے کا جو شرف حاصل
ہوا چند افراد پر گراں گزرا۔

علامہ مجلسی نے عیون اخبار الرضا سے نقل کیا ہے:
غیر اکرمؑ نے حضرت علیؑ (ع) سے فرمایا کہ قریش کے چند اشخاص مجھ سے
ناراض ہوئے ہیں کہ میں نے انہیں کیوں رشتہ نہ دیا۔ میں نے انہیں
جواب دیا کہ یہ کام ارادہ الہی سے ہوا ہے۔ کیونکہ علیؑ کے سوا فاطمہ (س)
کا شوہر بننے کے لائق کوئی بھی نہیں تھا۔ (۲)

بعض روایات میں نبیؐ کی بیٹی کی خواستگاری کے معاملے میں حضرت ام سلمہ کے عمل و دخل کا
ذکر بھی موجود ہے۔ علی بن عیسیٰ اربلی نے کشف الغمہ میں مناقب خوارزمی سے ایک طویل واقعہ نقل
کیا ہے۔ اس واقعہ میں وہ لکھتے ہیں: جب حضرت ابو بکر اور حضرت عمرؓ کو جناب فاطمہ (س) کی
خواستگاری کا مثبت جواب نہ ملا تو وہ حضرت علیؑ کے پاس گئے اور ان سے کہا: آپ فاطمہؑ کی خواستگاری
کے لیے کیوں نہیں جاتے؟ حضرت علیؑ نے جواب دیا: تنگدستی مجھے اس کام سے روکتی ہے۔ حضرت
ابو بکرؓ نے کہا: اے ابو الحسن (ع)! یہ دنیا اور جو کچھ اس دنیا میں ہے اللہ اور رسولؐ کے نزدیک اس کی
کوئی اہمیت نہیں ہے۔

اس گفتگو کے بعد حضرت علیؑ نے کنوئیں پر جتا ہوا اونٹ کھولا اور اسے گھر جا کر باندھ دیا
اور جوتے پہن کر آنحضرتؐ کی خدمت میں حاضر ہونے کے لیے چلے۔ اس وقت رسول خداؐ ابی امیہ
مخزومی کی بیٹی حضرت ام سلمہ کے گھر میں تشریف فرما تھے۔ حضرت علیؑ نے دروازے پر دستک دی۔
حضرت ام سلمہ نے پوچھا کون؟ آنحضرتؐ نے فرمایا: ام سلمہ اٹھو، دروازہ کھولو اور آنے والے سے کہو
کہ اندر آ جاؤ۔ آنے والا شخص ایسا ہے جو خدا اور رسولؐ سے محبت رکھتا ہے اور خدا اور رسولؐ اس سے
محبت کرتے ہیں۔ ام سلمہ فرماتی ہیں میں اس طرح اٹھی کہ نزدیک تھا کہ دروازے کے سامنے
گر جاؤں۔ (۳)

یہ حدیث مرفوع ہے یعنی اس کی سند متصل نہیں ہے۔ احتمال قوی بلکہ یقین ہے کہ اس
انداز میں یہ درست نہیں ہے کیونکہ حضرت ام سلمہ کا نام ہند تھا اور آپؐ بنی مخزوم کے شخص ابی امیہ

(۱) الطبقات الکبریٰ ج ۸ ص ۱۲۔ المواقف الخرقہ ص ۱۶۲ نیز ملاحظہ فرمائیں انساب الاشراف ص ۲۰۲۔

(۲) بحار ص ۹۲ نیز رجوع کیجئے باب "شعرائے عرب سے انتخاب"

(۳) کشف الغمہ ج ۱ ص ۳۵۳ نیز ملاحظہ فرمائیں بحار ص ۱۲۵-۱۲۶۔ نیز رجوع کیجئے تاریخ الخوارج ص ۳۸ اور اس کے بعد۔

حنیفہ بن مغیرہ بن عبد اللہ بن عمر کی بیٹی تھیں۔ رسول اللہ سے شادی سے پہلے آپ ابو سلمہ عبد الاسد بن عبد اللہ عمر بن مخزوم کی بیوی تھیں۔

ابو سلمہ اور ان کی زوجہ حبشہ کی طرف ہجرت کرنے والے تھے۔ (۱) لیکن ابھی حضور پاکؐ مکہ میں ہی تھے کہ یہ واپس آ گئے۔ (۲) ابو سلمہ نے مدینہ ہجرت کی۔ جنگ بدر میں شرکت کی (۳) جنگ احد میں اسامہ جُشمی نے ان پر تیر چلایا (۴) اور اس جنگ میں ان کی جان بچ گئی۔ ہجرت کے تیس ماہ بعد ایک سریہ میں کماثر کے طور پر ”قُطَن“ گئے۔ (۵)

اور انہوں نے بنی نضیر کے غنائم سے بھی حصہ لیا۔ (۶) آخر کار جمادی الثانی سنہ ۴ ہجری میں وفات پائی۔ مدت گزرنے کے بعد آنحضرتؐ نے شوال سنہ ۴ھ میں ام المؤمنین حضرت ام سلمہ سے عقد فرمایا۔ (۷) البتہ یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ اپنے شوہر کی زندگی ہی میں حضرت ام سلمہ کا حضور اکرمؐ کے گھر آنا جانا رہتا تھا۔ روایت ظاہری طور پر یہ بتا رہی ہے کہ جناب زہرا (س) کی خواستگاری کے لیے جب حضرت علیؑ تشریف لائے تو بی بی ام سلمہ آنحضرتؐ کی زوجہ تھیں۔ پس یہ احتمال درست نہیں ہے۔ البتہ علامہ مجلسی نے شیخ طوسی کی امالی سے یوں نقل کیا ہے:

حضرت علیؑ نے فرمایا ہے کہ میرے پاس ابو بکر اور عمر آئے اور کہا کہ تم پیغمبرؐ سے فاطمہؑ کا رشتہ کیوں نہیں مانگتے؟ میں آنحضرتؐ کی خدمت میں گیا۔ جب آپؐ نے مجھے دیکھا تو مسکرائے اور پوچھا ابو الحسن کیسے آئے ہو؟ میں نے آپؐ سے جو تعلق اور رشتہ تھا، اس کا ذکر کیا۔ اسلام میں اپنی سبقت کا ذکر کیا اور دین کے راستے میں جہاد کو بیان کیا۔ آپؐ نے فرمایا: تم سچ کہتے ہو۔ تمہاری فضیلت اس سے کہیں زیادہ ہے جنہیں تم شمار کر رہے ہو۔ میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! فاطمہؑ کی خواستگاری کے لئے حاضر ہوا ہوں۔ ارشاد فرمایا: اے علیؑ آپؐ سے پہلے بھی ان کے رشتے کے لیے بہت لوگ آئے ہیں، لیکن میری بیٹی نے انہیں قبول نہیں کیا۔ لہذا اس مرتبہ بھی اپنی لخت جگر سے پوچھ لوں۔ ان کی مرضی کیا ہے۔ اس کے بعد آپؐ گھر تشریف لے گئے اور اپنی بیٹی سے کہا: علیؑ میرے پاس تمہاری خواستگاری کے لئے آئے ہیں۔ تم علیؑ اور میرے درمیان قربت اور تعلق سے آگاہ ہو۔ تم ان کی اسلام میں سبقت، کارناموں اور فضائل سے

(۱) انساب الاشراف ص ۳۲۹۔ (۲) ابن ہشام ج ۲ ص ۳۹۰۔ (۳) مخازی و تہذیب ص ۱۵۵۔
(۴) انساب الاشراف ص ۳۲۹۔ (۵) وادی ص ۳۳۰۔ (۶) انساب الاشراف ص ۳۲۹ و طبقات ج ۸ ص ۶۔

واقف ہو۔ جناب فاطمہ (س) نے سر ہلانے کی بجائے خاموشی اختیار کی۔ پیغمبر اکرمؐ نے ان کے چہرے پر خوشی کے آثار دیکھ کر کہا: اللہ اکبر! ان کی خاموشی ان کی رضایت ہے۔ (۱)

شیخ طوسی نے اپنی امالی میں لکھا ہے کہ جب رسول خداؐ علیؑ و فاطمہؑ کے ازدواج پر راضی ہوئے تو جناب فاطمہؑ رونے لگیں۔ پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا: خدا کی قسم اگر اپنے اہل بیت میں سے اس سے افضل اور بہتر کسی کو پاتا تو تمہارا رشتہ اس سے کرتا۔ (۲)

نیز کشف الغمہ کے مصنف اور ان سے نقل کرتے ہوئے علامہ مجلسی نے بیان کیا ہے کہ حضرت علیؑ نے آنحضرتؐ سے عرض کیا:

میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں۔ آپ جانتے ہیں کہ آپؐ نے مجھے بچپن سے میرے باپ ابو طالبؑ اور ماں فاطمہ (س) بنت اسد سے لے کر اپنے دامن تربیت میں پر دان چڑھایا۔ میری تربیت فرمائی۔ اس پرورش میں آپؐ میرے والدین سے بھی زیادہ مجھ پر مہربان تھے۔ آپؐ نے مجھے اس شک و تردید سے نکالا جس میں ہمارے آباء و اجداد مبتلا تھے۔ دنیا و آخرت میں میرا سرمایہ اور مال و دولت آپؐ ہی کی ذات گرامی ہے۔ اب جبکہ خدا نے آپؐ کے وجود پاک سے مجھے توانا و طاقتور کیا ہے تو میں چاہتا ہوں کہ اپنا گھر بساؤں اور شادی کروں۔ میں فاطمہ (س) کی خواستگاری کے لئے حاضر ہوا ہوں۔ کیا آپؐ میری یہ درخواست قبول فرمائیں گے؟

جناب ام سلمہؓ کہتی ہیں کہ جناب رسالتؐ کا چہرہ چمک اٹھا اور آپؐ علیؑ کو دیکھ کر مسکرائے اور فرمایا: کیا میری بیٹی کو حق مہر دینے کے لئے تمہارے پاس کچھ ہے؟ علیؑ علیہ السلام نے جواب دیا: میری حالت آپؐ سے پوشیدہ نہیں ہے۔ میرے پاس تلوار اور اونٹ کے سوا کچھ نہیں ہے۔ اونٹ وہ ہے، جس کے ذریعہ سے کنوئیں سے پانی نکال کر مزدوری کرتا ہوں۔ پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا: تلوار کو جہاد کے لئے محفوظ رکھو اور اونٹ کھجوروں کو پانی دینے، روزی کمانے، سامان لادنے اور سفر کے لئے اپنے پاس رکھو۔ کیا تم چاہتے ہو کہ میں صرف زرہ کو حق مہر قرار دوں۔ (۳)

(۱) بحار ص ۹۳۔ (۲) امالی ج ۱ ص ۳۹

(۳) کشف الغمہ ج ۱ ص ۳۵۵۔ بحار ج ۲۳ ص ۱۲۶

جیسا کہ ہم نے لکھا ہے۔ اس موقع پر ام سلمہ موجود تھیں۔ ان کی موجودگی اتفاقیہ ہے۔ کیونکہ اس وقت تک وہ آنحضرتؐ کے عقد میں نہیں آئی تھیں۔
 زبیر بکار نے جن کی کتاب ”الموفقیات“ قدیمی مآخذ میں شمار ہوتی ہے، حضرت علی علیہ السلام کی گفتگو اس طرح بیان کی ہے:

میں رسول خداؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان کے سامنے خاموشی سے بیٹھ گیا۔ کیونکہ ان جیسا مرتبہ و احترام کسی دوسرے کا نہیں تھا۔ میری خاموشی دیکھ کر آپؐ نے پوچھا: ابو الحسن (۱) کیسے تشریف لائے ہو؟ میں اسی طرح چپ چاپ بیٹھا رہا یہاں تک کہ آنحضرتؐ نے تین مرتبہ اپنے سوال کو دہرایا پھر فرمایا: گویا فاطمہ (س) کی خواستگاری کے لیے آئے ہو؟ میں نے عرض کیا جی ہاں! آپؐ نے پوچھا: میں نے جو زرہ تمہیں دی تھی وہ کہاں ہے؟ میں نے عرض کیا: حضور وہ میرے پاس موجود ہے۔ آپؐ نے فرمایا: اسی زرہ کو فاطمہ (س) کا حق مہر مقرر کرو۔ (۲)

ابن سعد کی بعض روایات میں زرہ کی بجائے بھیڑ کی کھال اور پرانے یمنی پیراہن کا ذکر ملتا ہے۔

بعض مؤرخین کہتے ہیں کہ حضرت علیؑ نے اپنا اونٹ بیچ کر اس کی قیمت حق مہر میں دی۔ اس زرہ کی کیا قیمت تھی؟ اور حق مہر کتنا تھا؟ قرب الاسناد کے مؤلف حمیری نے اسے تیس درہم لکھا ہے۔ (۳) دوسروں نے چار سو اسی درہم تک ذکر کیا ہے۔ ابن سعد نے اپنی روایات میں سے ایک میں زرہ کی قیمت چار درہم (۴) بیان کی ہے۔ اس کے بارے میں میرا گمان یہ ہے کہ یہ چار سو درہم کی بجائے غلطی سے چار درہم لکھا گیا ہے، گویا کتابت کی غلطی ہے۔ ابن قتیبہ نے زرہ کی قیمت تین سو اور ایک روایت کے مطابق چار سو اسی درہم بیان کی ہے۔ (۵)

رسول اللہؐ کی دختر کا حق مہر چار سو درہم یا اس سے کچھ کم یا کچھ زیادہ تھا۔ بس یہی کچھ ان کا سرمایہ تھا۔ اس سادگی کے ساتھ علیؑ و فاطمہؑ رشتہ ازدواج میں منسلک ہوئے۔ وہ ایسے مقدس رشتے میں منسلک ہوئے کہ دونوں زندگی کے غموں اور خوشیوں میں ایک دوسرے کے شریک بن گئے۔

(۱) یہ تعبیر ”ابو الحسن“ دیگر بعض روایات میں بھی دیکھی گئی ہے۔ عموماً بڑے بیٹے کے نام پر کنیت اختیار کی جاتی ہے (مگر کہ یہ بنیادی شرط نہیں ہے) اور ممکن ہے کہ علی (ع) روایت کرتے ہوئے نام کی بجائے کنیت استعمال کرتے ہوں یا راویوں نے یہ تعبیر کی ہے۔

(۲) الاخبار الموفقیات ص ۳۷۵ نیز رجوع کیجئے کشف اللثام ج ۱ ص ۳۳۸ و بحار ج ۳ ص ۱۱۹

(۳) بحار ج ۳ ص ۱۰۵ (۴) ابن سعد طبقات ج ۸ ص ۱ (۵) عیون الاخبار ج ۴ ص ۷۰

کوئی بھی جنس فروخت نہیں ہوتی جب تک خریدار اور بیچنے والا اس کی قیمت کے بارے میں بات چیت نہ کر لیں۔ بہر حال زرہ تھی، بھیڑ کی کھال یا یمنی پیراہن جو کچھ بھی تھا فروخت ہوا، اس کی قیمت آنحضرتؐ کی خدمت میں لائی گئی۔ رسول خداؐ نے بغیر اس میں سے کچھ رقم بلالؓ کو دی اور فرمایا کہ ان پیسوں سے میری بیٹی کے لئے خوشبو (عطر) خرید لاؤ۔ پھر باقی رقم حضرت ابو بکرؓ کو دی اور فرمایا کہ اس سے میری بیٹی کی ضروریات زندگی کی اشیاء مہیا کرو۔ حضرت عمارؓ یاسرؓ اور دوسرے چند اصحاب کو حضرت ابو بکرؓ کے ساتھ روانہ کیا تاکہ وہ اپنی صوابدید کے مطابق جناب زہراًؓ کا جہیز خریدیں۔ شیخ طوسی نے جہیز کی فہرست اس طرح لکھی ہے:

سات درہم قیمت کا پیراہن، چار درہم کا نقاب، خیبر کا بنا ہوا سیاہ اونی کمبل، کھجور کے پتوں کا بنا ہوا ایک بستر، مصری ٹاٹ کے دو گدے جن میں سے ایک کھجور کی چھال اور دوسرا بکری کے بالوں سے بھرا ہوا اور جن کے ابرے موٹی کتان کے بنے ہوئے تھے۔ طائف کے چمڑے کے ٹکے، جن میں مکی خوشبودار گھاس بھری ہوئی تھی، ایک اون کا پردہ ایک ہجیر (۱) کا بنا ہوا بوریا، چکی، کپڑے دھونے کے لیے ایک تانبے کا لگن، دودھ دوہنے کے لئے گہرا پیالہ، پانی کے لئے چمڑے کی مشک، ایک لکڑی کا کٹورہ، تار کول جیسے مادہ سے بنا ہوا لوٹا، سبز صراحی اور مٹی کے چند پیالے۔ (۲)

جب جہیز آنحضرتؐ کی خدمت میں لایا گیا تو آپؐ نے اسے دیکھنے کے بعد فرمایا:

اللہ تعالیٰ اہل بیت کو برکت عطا فرمائے۔

خطبہ نکاح پڑھنے کا وقت آپہنچا۔ ابن شہر آشوب نے مناقب میں، علامہ مجلسی نے بحار الانوار میں اور دوسرے شیعہ علماء اور محدثین نے اس خطبے کو مختلف عبارتوں اور مختلف انداز سے نقل کیا ہے۔ ان میں سے درج ذیل منتخب کی گئی ہے، جسے اکثر محدثین نے تحریر کیا ہے۔ جو اس سے زیادہ تفصیل کا طالب ہو وہ بحار الانوار کی طرف رجوع کرے:

حمد و ثناء ہے اس پروردگار کی جس کی نعمتوں کی ستائش کی جاتی ہے۔ جس کی قدرت و طاقت کی پرستش کی جاتی ہے۔ اس کی سلطنت میں اس کی فرمانبرداری کی جاتی ہے۔ جس کے عذاب کا ڈر اور خوف ہے، اس کی عطا اور بخشش کے سب خواہاں ہیں اور زمین و آسمان میں اسی کی حکومت کا سکھ چلتا ہے۔ وہ ایسا خدا ہے جس نے مخلوقات کو اپنی قدرت سے خلق کیا۔ ہر ایک کو اس کی صلاحیت و استعداد کے مطابق ذمہ داری سونپی۔

(۱) گویا اس "حجر" سے مراد مرکزِ بحرین ہے۔ حجر مدینہ کے نزدیک ایک گاؤں کا نام بھی تھا

(۲) اہالی ج ۱ ص ۳۹

انسانوں کو اپنے دین کی وجہ سے بلندی عطا کی۔ اپنے محمدؐ کے ذریعہ انہیں عزت و فضیلت سے نوازا۔ خداوند تعالیٰ نے نکاح کو ایک دوسرے سے منسلک ہونے کا ذریعہ قرار دیا اور اسے واجب کیا۔ اس نکاح کے ذریعے رشتہ داری کے سلسلے کو مضبوط فرمایا۔ اسے لوگوں کے لئے نسب اور سبب کا رشتہ قرار دیا اور تیرا پروردگار توانا ہے۔ (۱) پھر حضور اکرمؐ فرماتے ہیں: اسی خدا نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں فاطمہ (س) کو علیؑ کی زوجیت میں دے دوں اور میں نے چار سو مثقال چاندی حق مہر کے بدلے انہیں علیؑ کی زوجہ قرار دیا ہے۔ اے علیؑ! کیا تم راضی ہو؟

جی ہاں! یا رسول اللہ۔

جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے کہ ابن شہر آشوب نے مناقب (۲) میں خطبے کو انہی الفاظ میں بیان کیا ہے اور علامہ مجلسی نے بھی کشف الغمہ سے اسی صورت میں نقل کیا ہے (۳) اور مذکورہ عبارت کے بعد ایک سطر کا اضافہ کیا ہے۔

البتہ ابن مردویہ نے اس خطبے کو دوسرے الفاظ میں بیان کیا ہے۔ اس خطبے کو اور وہ خطبہ جو حضرت علی علیہ السلام نے نکاح کی قبولیت کے عنوان سے پڑھا اسے بحار الانوار اور مناقب میں دیکھا جا سکتا ہے۔

خطبہ نکاح پڑھا گیا۔ اس کے بعد جناب زہرا (س) حضرت علیؑ کی شریک حیات بن گئیں۔ جہیز مذکورہ صورت میں تیار ہو گیا لیکن ایک عرصے کے بعد رخصتی عمل میں آئی اور جناب فاطمہ (س) اپنے باپ کے گھر سے اپنے شوہر کے گھر آئیں۔ علامہ مجلسی نے اپنی روایت میں اس عرصے کو ایک ماہ لکھا ہے، جبکہ بعض نے اس مدت کو ایک سال اور اس سے زیادہ بھی بیان کیا ہے۔

ان جزئیات کی تحقیق و جستجو زیادہ اہم نظر نہیں آتی۔ ایک ماہ یا ایک سال یا جو بھی ہو، بہر حال یہ مدت تمام ہوئی۔ آخر کار ایک دن حضرت عقیل حضور اکرمؐ کے گھر آئے اور آپؐ سے فاطمہ سلام اللہ علیہا کو رخصت کرنے کی درخواست کی۔ آنحضرتؐ کی بعض بیویوں نے بھی حضرت عقیل کی

(۱) الحمد لله المحمود بنعمة . المعبود بقدرته . المطاع في سلطانه ، المرعوب من غذائيه المرعوب اليه فيما عنده . النافذ امره في ارضه و سمائه الذي خلق الخلق بقدرته و فيزهم باحكامه و اعزهم بدينه . و اكرمهم بنبيه محمد . ثم ان الله جعل المصاهرة نسبا لا حقا و امرا مفترضا . و شج بها الارحام و الزمها الانام . فقال تبارك اسمه و تعالى جده " و هو الذي خلق من الماء بشرا فجعله نسبا و صهرا (الفرقان: ۵۶)

(۲) مناقب شہر آشوب ج ۳ ص ۳۵۰ (۳) بحار ج ۲۳ ص ۱۱۹

حمایت کی۔ ایک رات جناب فاطمہ (س) کو دلہن بنا کر چند عورتوں کے ہمراہ حضرت علی علیہ السلام کے گھر لے جایا گیا۔ پہلی اور دوسری صدی ہجری کے شیعہ شعراء، جیسے کیت، سید اسماعیل حمیری اور دیک الہن جس نے تیسری صدی کے آغاز میں وفات پائی، نے جناب فاطمہ (س) کی خواستگاری اور ان کی حضرت علی علیہ السلام سے شادی اور جہیز کی مقدار کے بارے میں نہایت عمدہ قصائد کہے ہیں، جو تذکرہ اور سوانح حیات کی کتابوں میں مذکور ہیں۔

جس رات فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کی رخصتی تھی رسول اکرمؐ نے فرمایا:

اے علیؑ! شادی طعام کے بغیر نہیں ہوتی۔

سعد نے کہا: میرے پاس ایک گوسفند ہے۔ انصار کے چند افراد نے کچھ کلو مکئی کا بندوبست کیا۔

زبیر بکار نے عبد اللہ بن ابی بکر کے ذریعے حضرت علیؑ سے یوں روایت کی ہے۔^(۱)

جب میں نے فاطمہ (س) سے شادی کرنا چاہی یعنی رخصتی کے وقت پیغمبر اکرمؐ نے مجھے ایک زریں برتن عطا کیا اور فرمایا اس کی قیمت سے اپنی شادی کی دعوت ولیمہ کا انتظام کرو۔ میں محمد بن مسلم انصاری کے پاس گیا اور کہا کہ اس برتن کی قیمت کے بدلے مجھے کھانے کا سامان دے دو۔ اس نے قبول کیا اور پھر مجھ سے پوچھا:

تم کون ہو؟

علی ابن ابی طالب۔

کیا پیغمبر اکرمؐ کے چچا زاد بھائی ہو؟

جی ہاں!

یہ سامان کس لئے خرید رہے ہو؟

اپنی دعوت ولیمہ کے لیے۔

کس سے شادی کی ہے؟

رسول خداؐ کی بیٹی سے۔

اس انصاری نے کہا یہ خورد و نوش کا سامان بھی آپ کا اور یہ زریں پیالہ بھی۔

رخصتی کے وقت رسول پاکؐ نے میاں بیوی کے لئے دعا فرمائی کہ اے پروردگار اس عقد

(۱) الاخبار الموفقیات ص ۳۷۶

کو ان میاں بیوی کے لئے مبارک قرار دے! خدا یا! انہیں بہترین اولاد عطا فرما (۱) ابن سعد نے دوسری روایت میں جس کی سند اسماء بنت عمیس تک پہنچتی ہے، بیان کیا ہے:

علی علیہ السلام نے اپنی زرہ یہودی کے پاس گروی رکھی اور اس سے کچھ مقدار میں ”جو“ لیے اور ان دنوں میں یہ بہترین دعوت تھی۔ (۲)

ابن شہر آشوب نے ابن بابویہ سے روایت نقل کی ہے:

پیغمبر اکرمؐ نے عبدالمطلب کی بہو بیٹیوں اور مہاجرین و انصار کی عورتوں سے فرمایا کہ وہ فاطمہ زہرا (س) کے ہمراہ علی علیہ السلام کے گھر جائیں اور راستے میں شادمانی اور خوشی کا اظہار کریں۔ اس مسرت و شادمانی سے متعلق اشعار پڑھیں۔ لیکن ایسی بات نہ کہیں جو اللہ کو پسند نہ ہو۔ انہوں نے حضرت زہرا (س) کو شہباء نامی نچر (یا اونٹ) پر سوار کیا۔ اس نچر کی باگ حضرت سلمان فارسی کے ہاتھ میں تھی۔ حضرت حمزہ، حضرت عقیل، حضرت جعفر اور دیگر بنی ہاشم کے افراد ان کے پیچھے پیچھے تھے۔ پیغمبر اکرمؐ کی بیویاں دلہن کے آگے آگے چل رہی تھیں اور یہ اشعار پڑھ رہی تھیں:

سرن بعون اللہ یا جارائی و اشکرہ فی کل حالات
و اذکرن ما أنعم رب العلی من کشف فکروہ و آفات
فقد هدانا بعد کفر و قد انعشنا رب السماوات
و سرن مع خیر نساء الوری نقدی بعمات و خالات
یا بنت من فضله ذوالعلی بالوحی منه والرسالات

☆ اے میری ساتھی عورتو!؟ خدا کی مدد سے جاؤ اور ہر حال میں اس خالق کا شکر ادا کرو

☆ یاد رکھو کہ خدائے بزرگ و برتر نے ہم پر احسان فرمایا اور ہمیں بلاؤں اور آفتوں سے نجات بخشی

☆ ہم کافر تھے اس نے ہماری ہدایت فرمائی ہم ناتواں تھے اس نے ہمیں قوت بخشی

☆ جاؤ! بہترین عورتوں کے ساتھ تجھ پر قربان ہوں پھمکیاں اور خالائیں

☆ وحی و رسالت کے ذریعے سب پر فضیلت عطا کی

(۱) رجوع کیجئے مناقب شہر آشوب ج ۳ ص ۲۵۱

(۲) طبقات ج ۸ ص ۱۴۔ یاد رہے کہ اسماء بنت عمیس جیسا کہ ہم آئندہ لکھیں گے اس زمانے میں اپنے شوہر جعفر بن ابی طالب کے ساتھ حبشہ میں تھیں۔

حضرت عائشہ کی زبان پر یہ اشعار تھے ان کا ترجمہ حسب ذیل ہے:

يا نسوة استن بالمعاجر و اذکرن ما يحسن في المحاضر
واذکرن رب الناس اذ خصنا بدينه مع كل عبد شاكر
فا لحمد لله على فضاله و الشكر لله العزيز القادر
سرن بها فا الله اعطى ذکرها و خصها منه بظهر طاهر

- ☆ اے عورتو! اپنے آپ کو پردے میں رکھو اور زبان پر اچھی بات کے سوا کچھ نہ لاؤ
- ☆ اپنی زبان پر رب العالمین کا نام لاؤ جس نے ہمیں اور سب انسانوں کو اپنے دین سے فضیلت بخشی
- ☆ فیاض اور مہربان خدا کی حمد و ثناء عزیز اور قادر خدا کا سپاس و شکر!
- ☆ اس دختر کو لے چلو جسے خدا نے محبوب کیا اور اسے پاک و پاکیزہ شوهر عطا فرمایا۔

حضرت حفصہ نے یہ اشعار پڑھے:

فاطمه خير النساء البشر و من لها وجه كوجه القمر
فضلک الله على كل الوری بفضل من خص بآی الزمر
زوجک الله فتی فاضلا اعنى عليا خير من فی الحضر
فسرن جاراتی بها انها کریمه بنت عظیم الخطر

- ☆ اے فاطمہ (س)! اے دنیا کی تمام عورتوں سے افضل آپ کا چہرہ چاند جیسا ہے!
- ☆ خدا نے آپ کو تمام انسانوں پر فضیلت عطا کیا ہے باپ کے ذریعے جسے اللہ نے اپنی آیات سے خصوصیت بخشی
- ☆ آپ کو ایسا شوهر عطا کیا جو صاحب فضیلت ہے یعنی علی جو سب حاضرین سے بہتر ہیں!
- ☆ میری ساتھیو! انہیں لے چلو! کہ خود بھی عظیم ہیں اور عظیم خاندان کی بیٹی ہیں۔

سعد بن معاذ کی والدہ معاذہ نے یہ اشعار پڑھے:

اقول قولاً فيه ما فيه و اذكر الخیر و اندیه

محمد خیر بنی آدم ما فیہ من کبر و لآتیه
بفضلہ عرفنا رشدنا فاللہ بالخیر مجازیہ
و تحن مع بنت نبی الہدی ذی شرف قد فکنت فیہ
فی ذرۃ شامخۃ اصلہا لما آری شینا یدانیہ

- ☆ جو بات کہنی چاہیے وہی کہوں گی۔ نیکی اور بھلائی کے سوا کچھ نہ کہوں گی!
- ☆ محمد خیر البشر ہیں۔ غرور و تکبر سے مبرا ہیں۔
- ☆ آپ نے ہمیں ہدایت کی راہ دکھائی۔ اللہ آپ کو جزائے خیر دے
- ☆ ہم دختر نبی ہدی کے ساتھ ہیں کہ عطا ہوا اسے شرف نبی سے
- ☆ وہ ایک ایسے خاندان میں پیدا ہوئی جس کی اصل برتر ہے جس کا نہ کوئی ثانی ہے نہ کوئی ہمسر

دوسری خواتین پہلے شعر کی تکرار کرتی جاتی تھیں
جیسا کہ لکھا جا چکا ہے یہ روایت اسی صورت میں مناقب ابن شہر آشوب سے نقل کی گئی
ہے۔ انہوں نے اپنی سند کتاب مولد فاطمہ اور ابن بابویہ کی روایت سے ملائی ہے۔ ابن بابویہ علماء
امامیہ کے بزرگوں میں سے ہیں۔
لیکن اس روایت کو مذکورہ شکل میں قبول کرنا مشکل ہے۔ کیونکہ سب سے پہلی چیز جو
ہمیں شک و شبہ میں مبتلا کرتی ہے، یہ بیان ہے کہ پیغمبر اکرمؐ کی گھر والیاں جناب فاطمہ (س) کے خچر
کے آگے آگے چل رہی تھیں۔ اس کتاب کے مؤلف نے حضرت زہراؑ کی شادی کی تاریخ ماہ ذوالحجہ سنہ
۲ ہجری ذکر کی ہے۔ (۱)

جبکہ ہماری تحقیق کے مطابق حضرت ام سلمہؓ ہجرت کے چوتھے سال اور حضرت حصہؓ جنگ بدر
کے بعد آنحضرتؐ کے گھر آئیں۔ (۲) جیسا کہ ہم نے پہلے بھی ذکر کیا ہے کہ حضرت زہراؑ کی شادی
کے موقع پر صرف حضرت سودہ اور حضرت عائشہؓ پیغمبر اکرمؐ کے عقد میں آئی ہوئی تھیں۔
دوسری بات جو شک و تردد کا موجب ہے، وہ حضرت عائشہؓ کے اشعار میں یہ جملہ ہے جس
میں انہوں نے خواتین سے کہا کہ اوڑھنیوں سے اپنے سروں کو ڈھانپ لو۔ پیغمبر اکرمؐ کی ازواج

(۱) مناقب ابن شہر آشوب ج ۳ ص ۳۵۷

(۲) خیس بن حذافہ، حضرت حصہ کے شوہر نے جنگ بدر کے بعد وفات پائی۔

مطہرات کو اوڑھنی لینے اور اپنے سینوں کو ڈھلپنے کا حکم سورہ احزاب میں ہے۔ (۱) ہم جانتے ہیں کہ یہ سورت ہجرت کے پانچویں سال نازل ہوئی ہے۔

تیسری قابل شک بات حضرت جعفر طیار کا شادی کے شرکاء میں تذکرہ کرنا ہے۔ حالانکہ ان دنوں حضرت جعفر طیار حبشہ میں تھے۔ اس کے بارے میں آئندہ صفحات میں مزید وضاحت کی جائے گی۔



اس نے اس دنیا کی برائی کو دیکھا اور اپنے آپ کو اس
سے مبرا کر لیا۔

(ابو نعیم اصفہانی)

شوہر کے گھر میں حضرت زہرا سلام اللہ علیہا کی زندگی نمونہ ہے۔ ان کی تمام زندگی نمونہ ہے۔ کیونکہ وہ خود نمونہ ہیں۔ ان کے والد، ان کے شوہر نامدار اور ان کے فرزند نمونہ ہیں۔ یہ ہستیاں انسانی اقدار و فضائل کی حامل نمونہ مسلمان تھیں۔ یہ ہستیاں لوگوں کے درمیان رہتی تھیں، ان کے ساتھ زندگی گزارتی تھیں دوسرے انسانوں کی طرح چلتی پھرتی، کھاتی پیتی، لباس پہنتی تھیں۔ ان کی سرشت فرشتوں سے بھی افضل تھی۔ ایسی سرشت جو خدا سے پیوستہ ہوتی ہے۔ یہ ایسے انسان تھے جو دوسروں کا درد رکھتے یا لوگوں کے دکھ درد کو سمجھتے اور اپنے کردار اور رفتار سے ان کے دکھوں اور تکلیفوں کا مداوا کرنے کی کوشش کرتے تھے اور اگر ایسا نہ کر سکیں تو خود ان کی تکلیف اور مشکل میں شریک ہوتے تھے۔ کبھی وہ خود تکلیف اٹھاتے تھے تاکہ دوسروں کو آرام ملے۔ ایسے افراد اطباء الہی اور ذات حق کے شاگرد ہیں اور اس شعر کے کامل مصداق ہیں:

كُلُّ يُرِيدُ رِجَالَهُ لِحَيَاتِهِ يَأْمَنُ يُرِيدُ حَيَاتَهُ لِرِجَالِهِ (۱)

وہ روح کی عظمت میں برتری سمجھتے ہیں نہ کہ جسم پالنے اور جسمانی
ضرورت کو پورا کرنے میں۔ اگر وہ جسم کے ساتھ زندہ اور موجود ہیں تو
اس لئے تاکہ دوسروں کو اچھی زندگی کا درس دیں۔

وہ ان سے کہتے ہیں کہ جب لوگوں کے ساتھ زندگی گزارو تو پھر تم نہیں ہو، بلکہ یہ لوگ
ہیں جن کی خدمت کے لئے تمہیں زندہ رہنا چاہیے۔

(۱) دیوان حبیبی ص ۱۹۰ ج ۳

انسانی ہمدردی میں اس مقام تک آگے بڑھ جاتے ہیں کہ کہتے ہیں کہ میں کس طرح پیٹ بھر کر سو جاؤں جبکہ کسی دور دراز مقام پر کوئی انسان بھوکے پیٹ لیٹا ہو۔ (۱) جناب زہرا (س) ایسے مدرسے کی تعلیم یافتہ تھیں۔ نئی نویلی دلہن جس کا جہیز ایک زرہ کی قیمت، یعنی چار سو درہم کا تھا اور اس کے گھر کا اثاثہ چند مٹی کے کاسے اور کوزوں پر مشتمل تھا۔ ظاہر ہے کہ وہ شوہر کے گھر میں کس طرح زندگی گزارے گی۔

اب زہرا (س) شوہر کے گھر جانے کے لئے تیار ہیں۔ ان کے والد گرامی انہیں آخری سبق دیتے ہیں۔ انہوں نے پہلے بھی اس طرح کے سبق سیکھے تھے۔ لیکن اخلاقی دروس کا پے درپے تکرار ہونا چاہیے تاکہ عملی مشق کے ذریعے وہ ملکہ نفسانی کی صورت میں بدل جائے۔ اگرچہ انہیں عملی مشق کی ضرورت نہیں ہے پھر بھی جو کچھ بھی ہوں آخر انسان ہیں اور رشتہ دار اور ہمسایہ عورتوں سے میل جول رہتا ہے لہذا آنحضرتؐ فرماتے ہیں:

میری بیٹی! لوگوں کی طرف دھیان نہ دینا، مبادا پریشان ہو جاؤ کہ تمہارا شوہر غریب ہے۔ فقر دوسروں کے لیے باعث ذلت ہے، لیکن پیغمبرؐ اور ان کے خاندان و اہل بیت کے لیے مایہ افتخار ہے۔

میری بیٹی! اگر تیرا باپ چاہتا تو زمین کے خزانوں کا مالک بن سکتا تھا لیکن اس نے رضائے الہی کو اختیار کیا۔ بیٹی! جو کچھ تیرا باپ جانتا ہے اگر تو جان لے تو دنیا تیری نظروں میں بری لگنے لگے۔ (۲) میں نے تیرے حق میں کوئی کوتاہی نہیں کی۔ تجھے میں نے اپنے خاندان کے بہترین فرد کے سپرد کیا۔ تیرا شوہر دنیا و آخرت میں عظیم ہے۔ (۳)

اے پروردگار! فاطمہ (س) مجھ سے ہیں اور میں فاطمہ (س) سے ہوں۔ خدایا اسے ہر پلیدی و ناپاکی سے دور فرما۔ فاطمہ (س) خدا کی پناہ میں اپنے گھر جاؤ۔

بعض روایات میں یوں آیا ہے کہ سب عورتیں اپنے گھروں کو واپس چلی گئیں لیکن اسماء بنت عمیس رہ گئیں۔ جب ان سے پوچھا گیا کہ آپ کون ہیں اور کیوں نہیں گئیں؟ انہوں نے جواب دیا کہ مجھے رسول اللہ کی بیٹی کے پاس رہنا چاہیے۔ شب عروسی جو ان لڑکی کے پاس ایسی خاتون کا ہونا ضروری

(۱) ملاحظہ فرمائیں حضرت علی علیہ السلام کا حنان بن حنیف کے نام خط۔ بیچ البلاغ ص ۵۰ ج ۲

(۲) کشف الغمہ ج ۱ ص ۲۶۳

(۳) ایضاً ص ۳۵۱

ہے۔ شاید اسے کوئی ضرورت پیش آئے۔

کشف الغمہ کے مصنف نے اس داستان کے آخری حصے کو اسی صورت میں بیان کیا ہے۔ ابو نعیم اصفہانی نے بھی اسماء بنت عمیس کے حالات زندگی میں یہ بات تحریر کی ہے۔^(۱) جیسا کہ ہم نے لکھا ہے کہ جعفر بن ابی طالب اور ان کی زوجہ اسماء بنت عمیس حبشہ کے مہاجرین کے پہلے گروہ میں سے تھے۔^(۲) وہ اپنے شوھر کے ساتھ ہجرت کے ساتویں برس فتح خیبر کے موقع پر مدینہ آئیں۔ ان کے حبشہ سے آنے پر پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا کہ ان دو میں سے کس پر زیادہ اظہار مسرت کروں، فتح خیبر یا جعفر کی آمد پر۔^(۳)

اس بناء پر یہ کہنا ممکن نہیں ہے کہ حضرت اسماء جناب فاطمہ زہرا (س) کی شب عروسی کے موقع پر مدینے میں تھیں۔ اگر اصل میں روایت درست ہو اور راویوں نے نام لکھنے میں اشتباہ نہ کیا ہو تو احتمال یہ ہے کہ یہ عورت اسماء ذات النطاقین بنت ابو بکر اور زبیر بن عوام کی زوجہ تھیں۔ عجیب بات یہ ہے کہ ابو نعیم نے پہلے خود حضرت اسماء کی حبشہ کی طرف ہجرت وہاں سے واپسی اور ان کی اس مسئلے پر حضرت عمر سے بحث کا حوالہ دیا کہ حبشہ کے مہاجرین کی مدینہ کے مہاجرین پر فضیلت بہت ہے، پھر اس کے بعد فوراً حضرت فاطمہ (س) کی شب عروسی کے موقع پر آنحضرتؐ سے ان کی گفتگو کو نقل کیا ہے۔^(۴)

معاصرین میں سے ایک فاضل شخص نے فاطمۃ الزہراء من المہد الی اللحد (فاطمہ (س) گود سے گور تک) نامی کتاب تالیف کی ہے جو تین سال پہلے بیروت میں چھپ چکی ہے۔ مذکورہ کتاب میں جب مصنف کو اس قسم کی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا تو وہ گزشتہ علماء کے اقوال کو بنیاد بنا کر اس شادی میں اسماء بنت عمیس کی شرکت کو ناممکن قرار دیتے ہیں۔ اس کے بعد وہ جلد ۲ صفحہ ۲۰۳ میں کہتے ہیں:

اس کا معقول حل یہ ہے کہ یہ اسماء وہی اسماء بنت عمیس ہیں لیکن وہ حبشہ جانے کے بعد چند مرتبہ مکے واپس آئیں اور چونکہ ان دو علاقوں کے مسافر وں کو صرف بحیرہ احمر عبور کرنا پڑتا ہے اس لئے یہ امر زیادہ مشکل بھی نہیں۔

اس محترم مصنف نے ایک اہم نکتہ فراموش کر دیا اور وہ یہ کہ تاریخی واقعات ہمارے فرض

(۱) حلیۃ الاولیاء ج ۲ ص ۷۵

(۲) رجوع فرمائیے: ابن ہشام ج ۱ ص ۳۳۵ وابن سعد ج ۸ ص ۹۵

(۳) ابن ہشام ج ۳ ص ۲۱۴ (۴) حلیۃ الاولیاء ج ۲ ص ۷۴-۷۵

اور تصور کے تابع نہیں ہیں۔ اگر تعارض روایت کے موقع پر ایک اصولی یا فقیہ جہاں تک ممکن ہو جمع عرفی یا جمع فقہاتی کا سہارا لیتا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ مدلول روایت کا عملی اثر ہے۔ یعنی وہ احکام تکلفی کی پانچ اقسام (واجب، حرام، مستحب، مکروہ، اور مباح) میں سے ایک قسم کو بیان کر رہی ہے اور جہاں تک ممکن ہو ایک فقیہ کو امارت سے دستبردار نہیں ہونا چاہیے۔

لیکن اس قسم کی تاریخ کو تاریخی واقعات اور روایات میں قبول نہیں کیا جاسکتا۔ اگر بالفرض قبول کر بھی لیں تو کم از کم ایک سند ایسی ہونی چاہیے جو اشارۃً یا اجمالاً یہ بیان کرے کہ مہاجرین حبشہ کے آتے جاتے رہتے تھے۔ ہمیں معلوم ہے کہ مہاجرین حبشہ کے چند افراد مدینہ سے پہلے کے واپس آ گئے تھے اور وہ اس وقت جب انہوں نے سنا یا خود خیال کیا کہ قریش مکہ نے حضور اکرمؐ کی مخالفت سے ہاتھ اٹھا لیا ہے۔

ابن ہشام نے ان مہاجرین میں سے ہر ایک کا نام اور قبیلہ لکھا ہے۔ کسی چھوٹی سی روایت میں حضرت جعفر ابن ابی طالب یا ان کی زوجہ اسماء بنت عمیس کی واپسی کا اشارہ بھی نہیں ملتا۔ اگر آج حجاز سے حبشہ کا سفر بحیرہ احمر کے عرض کو عبور کرنے سے آسان ہو گیا ہے تو اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ چودہ سو سال پہلے بھی یہ سفر اتنا ہی آسان تھا۔ وہ لوگ جنہوں نے جان کے خوف اور جسمانی آزار و تکلیف کے ڈر سے ایک غیر ملک میں پناہ حاصل کی ہو، وہ تاجروں یا سیاحوں کی طرح نہ تھے جو ہمیشہ ایک جگہ سے دوسری جگہ آتے جاتے رہتے ہیں۔

علاوہ ازیں ہمارے پاس دوسری صدی ہجری کی ایک سند موجود ہے جس میں اسماء بنت عمیس کی ہجرت کا تمام واقعہ نقل ہوا ہے۔ یہ سند ابو عبد اللہ مصعب بن عبد اللہ زبیری کی کتاب ”نسب قریش“ ہے۔ مصعب کی کتاب پروپینڈے کی غرض سے نہیں لکھی گئی بلکہ نہایت دقیق بیان ہے جو درجہ اول کی روایت کی بنیاد پر لکھی گئی ہے۔ وہ اسماء کے بارے میں یوں لکھتے ہیں:

جب جعفر بن ابی طالب نے حبشہ ہجرت کی تو اپنی زوجہ اسماء بنت عمیس کو بھی ساتھ لے گئے۔ حبشہ میں اسماء کے بطن سے جعفر کے تین بیٹے عبد اللہ، محمد، اور عون پیدا ہوئے۔ عبد اللہ کی پیدائش کے چند دن بعد نجاشی کے ہاں بھی ایک بیٹے کی ولادت ہوئی۔ اس نے کسی کو حضرت جعفر کے پاس بھیجا اور پوچھا کہ آپ نے اپنے بیٹے کا کیا نام رکھا ہے؟ حضرت جعفر نے بتایا عبد اللہ! نجاشی نے بھی اپنے بیٹے کا نام عبد اللہ رکھا اور حضرت اسماء نے اس بچے کو دودھ پلانا اپنے ڈے لے لیا۔ اس وجہ سے نجاشی کی نظروں میں ان کی قدر و منزلت بڑھ گئی۔ جب حضرت جعفر نے دو کشتیوں کے مسافروں کے ہمراہ واپسی کا ارادہ کیا تو اسماء بنت عمیس

نے اپنے بیٹوں کو جن کی ولادت حبشہ میں ہوئی تھی ساتھ لیا اور مدینے آگئیں۔ وہ مدینے میں رہیں یہاں تک کہ جنگ موتہ میں حضرت جعفر گئے اور شہادت کے رتبے پر فائز ہوئے۔^(۱)

اسماء بنت عمیس کے بارے میں یہ تاریخی سند قدیم ترین بھی ہے اور اس کے ساتھ واضح ترین ماخذ بھی ہے اور ہم یہ جانتے ہیں کہ حضرت جعفر فتح خیبر کے بعد ساتویں ہجری میں مدینے آئے تھے۔ حضرت جعفر نے حبشہ کی طرف ہجرت مہاجرین کے دوسرے گروہ کے ساتھ کی۔ ہجرت کا واقعہ ابن ہشام نے اپنی سیرۃ (۲) اور بلاذری نے انساب الاشراف میں بھی بیان کیا ہے۔ بلاذری لکھتے ہیں:

جعفر اپنی زوجہ اسماء بنت عمیس کے ہمراہ حبشہ کی طرف ہجرت کرنے والے مسلمانوں کے دوسرے گروہ میں تھے اور حبشہ میں ہی رہے۔ ابو طالب اپنی زندگی میں ان کے اخراجات بھیجتے رہے۔ آخر میں وہ فتح خیبر کے بعد مسلمانوں کی ایک جماعت کے ساتھ مدینے آگئے۔^(۳)

پس وہ روایات جو مکہ میں حضرت خدیجہ کی وفات کے موقع پر اور مدینے میں حضرت زہرا کی شادی کی رات اسماء کی موجودگی کا تذکرہ کرتی ہیں، واقعات کو آپس میں خلط ملط کرنے یا کسی دوسری خاتون کے ساتھ نام کے اشتباہ کرنے پر مبنی ہیں۔ اس طرح کے واقعات میں اس طرح کی غلطیاں بکثرت دیکھنے میں آتی ہیں۔

شادی کے تین دن بعد پیغمبر اکرمؐ اپنی بیٹی سے ملنے جاتے ہیں۔ اپنی لخت جگر اور داماد کے حق میں دعا فرماتے ہیں۔ بار دیگر علی علیہ السلام کے فضائل کا تذکرہ کرتے ہیں اور واپس گھر آ جاتے ہیں۔ لیکن آپؐ کے چہرے سے عیاں ہے کہ اپنے جگر گوشہ کی دوری اس تھوڑے سے فاصلے کے لئے بھی آپ کے لئے ناقابل برداشت ہے۔ کئی سالوں تک فاطمہ زہرا (س) دن رات آپ کے ساتھ رہیں۔ وہ بیٹی ہونے کے ساتھ حضرت خدیجہ کی یادگار اور آپؐ سے ہی حضرت خدیجہ کی یادیں تازہ ہو جاتی تھیں۔ آپؐ فرماتے تھے:

کون ہے جو خدیجہ کی جگہ لے سکے؟ جب لوگوں نے مجھے جھٹلایا تو اس نے میری تصدیق کی۔ جب سب نے مجھے چھوڑ دیا تو اس نے اپنے ایمان

(۱) لب تریث ص ۸۱

(۲) سیرۃ ابن ہشام ج ۱ ص ۳۱۵

(۳) ایضاً ص ۱۹۸

اور مال کے ساتھ دین خدا کی نصرت کی۔ (۱)

آپؐ کی خواہش تھی کہ خدیجہ کی یادگار ہمیشہ ان کے پاس رہے۔ لیکن اب وہ علیؑ کی زوجہ تھیں۔ لہذا انہیں علیؑ کے گھر میں رہنا چاہیے تھا۔ اگر آپؐ اپنے گھر کے نزدیک ان کے لئے ایک حجرہ فراہم کر دیتے تو آپؐ آسودہ خاطر ہو جاتے۔ شاید اس کے لئے مدینہ کے مسلمانوں کو زحمت اٹھانا پڑے۔ آخر کار آپؐ نے بیٹی اور داماد کو اپنا حجرہ دینے کا فیصلہ کیا، لیکن یہ کام بھی مشکل ہے۔ کیونکہ آپؐ کے گھر میں پہلے دو بیویاں (حضرت سودہ اور حضرت عائشہ) موجود ہیں۔ حارثہ بن نعمان کو اس امر کی خبر ملتی ہے۔ وہ آنحضرتؐ کے پاس آتے ہیں اور کہتے ہیں:

میرا گھر آپؐ سے زیادہ نزدیک ہے۔ میں بذات خود اور جو کچھ میرے پاس ہے وہ سب آپؐ کے اختیار میں ہے۔ خدا کی قسم! میں یہ زیادہ پسند کرتا ہوں کہ میرا مال آپؐ کے پاس رہے بجائے اس کے کہ وہ میرے پاس رہے۔ آپؐ نے جواب میں فرمایا: اللہ سبحانہ آپؐ کو اجر عنایت فرمائے۔

اس دن کے بعد علیؑ اور فاطمہ (س) حارثہ کے گھروں میں سے ایک گھر میں منتقل ہو گئے (۲) ہجرت کے بعد پہلے دو سال اور اس کے بعد کا کچھ عرصہ پیغمبر اکرمؐ اور مسلمانوں کے لئے انتہائی سخت اور مشکل دور تھا۔ سیاسی حالات کے حوالے سے بھی اور معاشرتی و معاشی حوالے سے بھی۔ جس دن میثاق مدینہ کا بیان باندھا گیا (۳) اگرچہ یہودی سیاسی اور معاشرتی لحاظ سے تمام سہولیات سے بہرہ مند تھے، لیکن انہوں نے بعض وجوہات کی بنا پر (جن کی تفصیل بیان کرنے کی اس کتاب میں گنجائش نہیں ہے) (۴) پیغمبر اکرمؐ سے اپنی مخالفت اور دشمنی کا آغاز کر دیا اور وہ مخالفت میں اس حد تک آگے بڑھ گئے کہ مسلمانوں نے قرآن کے حکم سے یہودیوں سے ہر قسم کے روابط و تعلقات یکسر ختم کر دیئے۔ مسجد اقصیٰ سے خانہ کعبہ کی طرف قبلہ کی تبدیلی نے رسول اکرمؐ سے ان کے بغض و کینہ میں اضافہ کر دیا۔ یثرب میں ایک اور گروہ بھی تھا جو مسلمانوں کے بھیس میں مسلمانوں کے خلاف سرگرم تھا۔

اس گروہ کا سرغنہ عبداللہ بن ابی بن ابی سلول تھا۔ پیغمبر اکرمؐ کے مدینے میں تشریف لانے سے پہلے یثرب شہر کی سرداری کا سودا عبداللہ ابن ابی کے سر میں تھا۔ اس کی حکومت کے مقدمات

(۱) بخاری ج ۳ ص ۱۳۱

(۲) ابن سعد، طبقات ج ۸ ص ۱۲ نیز رجوع فرمائیں اسباب ج ۸ ص ۱۵۸ حصہ اول اور الاخبار الموقفات ص ۳۷۶۔

(۳) تحفلی از تاریخ اسلام از ذاکر جعفر شہیدی ص ۳۹-۵۳

(۴) ایضاً ص ۵۵

فراہم ہو چکے تھے لیکن رسول اللہ کی مکہ سے مدینہ ہجرت نے اسے معاشرہ میں رعب و دبدبہ و بزرگی سے محروم کر دیا۔

عبداللہ اور اس کے طرفدار بظاہر مسلمان ہو گئے اور رسول اللہ کے حمایتی بن گئے۔ لیکن ان کے دل آپ کے ساتھ نہ تھے۔ خصوصاً عبداللہ کو جب بھی موقع ملا وہ اسلام اور مسلمانوں پر کاری ضرب لگاتا۔ جیسا کہ جنگ احد میں (درے سے) عقب نشینی مسلمانوں کی شکست کا موجب بنی۔ اسی طرح رجب اور بزمعہ (۱) کا حادثہ جس میں چالیس سے زیادہ ممتاز مسلمان شہید ہو گئے، بھی دشمنوں کی زبان درازی کا سبب بنا اور اس کی وجہ سے دنیا طلب قبائل اسلام کے دشمنوں سے مل گئے۔

مسلمانوں کی اقتصادی حالت بھی نہایت اتر تھی۔ مدینے کے مسلمانوں اور انصار نے جہاں تک ہو سکا مہاجرین کے ساتھ تعاون کیا۔ بلکہ تمام تر مشکلات اور تنگدستی کے باوجود انہوں نے مہاجرین کو اپنے پر ترجیح دی۔ لیکن غریب کسانوں اور ٹھیلے والے دکانداروں کی مالی توانائی کس قدر ہو سکتی ہے؟ جنگی مال غنیمت بھی اتنی مقدار میں نہ تھا کہ نئے مسلمانوں کی ضروریات پوری کی جاسکیں۔ آنحضرت کے ذمے ان لوگوں کی ہدایت اور ان کے امور کا انتظام تھا، آپ ان مسلمانوں کو اپنے آپ اور اپنے رشتہ داروں پر مقدم رکھتے تھے۔ اگر کہیں سے کوئی راہ کھلتی تو وہ ضرورت مند مہاجرین اور انصار کا حق ہوتی۔ یہ سبق آپ کو اور آپ کے خاندان والوں کو قرآن نے سکھایا کہ اگر وہ خدا سے محبت رکھتے ہیں اور خدا کو دوست رکھتے ہیں تو اپنے منہ سے لقمہ بچا کر فقیروں، یتیموں، اور اسیروں کو کھلائیں اور ان پر منت بھی نہ بتائیں اور جان لیں کہ یہ لقمہ ان ضرورت مندوں کا حق ہے جو خدا نے ان کے لئے معین فرمایا ہے اور اس حق کی ادائیگی کے بعد کسی جزا اور شکرے کی امید بھی نہیں رکھنی چاہیے۔ وہ اس نیک عمل کی جزا دوسرے جہان میں پائیں گے جس دن تمام چہرے مرجھائے اور اترے ہوئے ہوں گے۔ ان کے چہرے خوش و خرم ہوں گے۔ ان کے لبوں پر مسکراہٹ ہو گی۔ (۲)

یہ امر مسلم ہے کہ پیغمبر اکرم کے چچا زاد بھائی علی علیہ السلام اور آپ کی بیٹی فاطمہ زہرا (س) اس حکم کے بجالانے میں دوسروں کی نسبت زیادہ حقدار تھیں۔ یعنی اس حکم پر عمل کرنے میں ان سے بڑھ کر کون سزاوار تھا۔ یہ آیات ان کے گھر میں اور ان پر نازل ہوئیں۔ یہ اسی اخلاقی حکم کی

(۱) حادثہ رجب کا خلاصہ یہ ہے کہ کنانہ کا ایک گروہ رسول اکرم کے پاس آیا اور ان سے درخواست کی کہ کچھ آدمیوں کو ان کے قبیلہ میں اسلام کے احکام کی تعلیم دینے کے لیے بھیج دیں۔ آپ نے چچا آدمی ان کے ہمراہ بھیج دیئے۔ لیکن ان لوگوں نے ان چچا آدمیوں پر رجب کے مقام پر حملہ کر دیا اور ان میں سے چار کو قتل کر دیا اور بقیہ دو کو مکہ کے مشرکین کے ہر د کر دیا۔ ان لوگوں کو قریش نے اپنے متولوں کے بدلہ میں قتل کر دیا۔ بزمعہ کے حادثہ میں رسول اللہ کے ۳۸ مہاجرین شہید ہوئے۔

بجآوری تھی کہ ان میاں بیوی نے عام انسان کی توانائی سے بڑھ کر سختیوں اور مشکلات کو برداشت کیا۔ ان ایام کے چالیس سال بعد جب علی علیہ السلام نے اس پر مشقت اور پر رنج دنیا سے آنکھیں بند کیں اور ان کی روح نے ملکوت اعلیٰ کی طرف پرواز کی تو باوجود اس کے کہ انہوں نے اپنی زندگی کے آخری پانچ سال عالم اسلام کے حکمران کی حیثیت سے گزارے تھے، ان کے بیٹے امام حسن علیہ السلام نے اپنے پہلے خطبے میں ان کی یوں تعریف کی:

اے لوگو! ایک ایسا انسان اپنے خالق سے جا ملا ہے کہ پہلے والوں میں سے کوئی ان سے سبقت نہیں لے سکا اور آئندہ آنے والوں میں سے کوئی ان کے مرتبے پر نہ پہنچ سکے گا۔ جب رسول اللہ انہیں کوئی مہم سر کرنے کے لیے بھیجتے تھے تو جبرائیل ان کے دائیں طرف سے اور میکائیل ان کے بائیں طرف سے محافظت کرتے تھے یہاں تک کہ وہ کامیاب لوٹتے۔ جو کچھ انہوں نے چھوڑا ہے وہ سات سو درہم ہیں۔

اس سند کو ابن سعد نے طبقات الکبریٰ میں بیان کیا ہے۔ یہ قدیم ترین تاریخی اسناد میں سے ہے اور تمام مؤرخین نے اس سے استناد کیا ہے۔ (۱)

ابن عبد ربہ اندلسی جس کی وفات چوتھی صدی ہجری کے آغاز میں ہوئی اور اس نے یہ کتاب تیسری صدی ہجری کے آخر میں لکھی ہے، اپنی کتاب میں اس نے علی علیہ السلام کا باقی ترکہ تین سو درہم لکھا ہے۔ (۲)

یہ بڑی بے انصافی ہو گی کہ اگر کوئی اپنے خیال کے مطابق یا نا آگاہ لوگوں کو گمراہ کرنے کی خاطر ایک کتاب تحریر کرے اور اسلام کا تعارف فلسفہ کی روشنی میں کرنا چاہے، پھر ابن سعد اور ابن عبد ربہ سے بھی چند صدیوں بعد کے منافع اور مآخذوں کے غلط ترجموں پر اعتماد کرتے ہوئے علی علیہ السلام کو اپنے زمانہ کے سرمایہ دار کے طور پر پیش کرے۔

یہ بے انصاف افراد اپنے کوتاہ بین افکار کی وجہ سے ہر واقعے کو اپنی غلط، بے جا اور غیر منطقی تاویلات کے ذریعے اپنے خود ساختہ اور نادرست نتائج پر منطبق کرنا چاہتے ہیں۔ وہ اس مختصر زحمت کو بھی تحمل نہیں کرتے کہ پہلے تمام اسناد اور روایات کی تحقیق کریں، ان کی درجہ بندی کریں اور پھر کوئی نتیجہ اخذ کریں۔ کیا یہ افراد ایسا نہیں کر سکتے یا کرنا نہیں چاہتے؟ اللہ بہتر جانتا ہے ”وَمَنْ يُضْلِلِ اللَّهُ فَمَا لَهُ مِنْ هَادٍ (الرعد: ۳۳)“

(۱) الطبقات ج ۳ ص ۲۶

(۲) العقد الفرید ج ۵ ص ۱۰۳

إِنْ يَمْسَسْكُمْ قَرْحٌ فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ قَرْحٌ مِثْلُهُ ط

(آل عمران: ۱۳۰)

اگر تمہیں کوئی زخم لگا ہے تو تمہارے دشمن کو بھی ویسا ہی زخم لگ چکا ہے۔

ہجرت کے تیسرے سال کا رمضان آ پہنچا ہے۔ ایک نومولود ”حسن“ کی ولادت نے، جنگ بدر کی کامیابیوں کی حسین و شیریں یادوں کو، جو پچھلے رمضان میں مسلمانوں کو حاصل ہوئی تھیں، مزید شیریں کر دیا ہے۔ لیکن اس فرخندہ ولادت کے چند دن بعد غم و اندوہ کے بادل اس شہر پر چھا جاتے ہیں۔ مکہ اور مدینہ ایک بار پھر ایک دوسرے کے مد مقابل کھڑے ہیں۔ قریش اور ابوسفیان جنگ بدر میں اپنی شکست برداشت نہ کر سکے تھے، لہذا انہوں نے اپنی شکست کا بدلہ لینے کے لئے سپاہیوں کے ایک بڑے لشکر کے ساتھ مدینے کا محاصرہ کر لیا ہے۔ گزشتہ سال کے برخلاف اس دفعہ مکہ نے یثرب پر کاری ضرب لگائی ہے۔ کیوں؟ چونکہ جنگ بدر میں مسلمانوں کی تمام تر توجہ خدا کی طرف تھی لیکن جنگ احد میں سپاہیوں کے ایک دستے نے اللہ تعالیٰ کو فراموش کر دیا اور دنیا کے لالچ میں آ گئے۔ انہوں نے پیغمبر کے فرمان پر عمل نہ کیا اور مال غنیمت لوٹنے لگے۔ کمین گاہ میں چھپے دشمن نے مسلمانوں پر حملہ کر دیا۔ ایک اور گروہ نے جو عبداللہ بن ابی کے ساتھ تھا، جنگ سے پہلے میدان کارزار چھوڑ دیا اور اپنے گھروں کو واپس چلا گیا۔ عبداللہ بن ابی پیغمبر اکرمؐ کی مدینہ تشریف آوری کے دن سے ہی دلی طور پر خوش نہیں تھا۔ کیوں؟ اس لئے کہ مدینے کے لوگ اسے شہر کا حکمران بنانا چاہتے تھے۔ جب اس کی خواہش پوری نہ ہوئی تو اس نے رسول خداؐ سے ہمیشہ منافقانہ رویہ اپنایا۔ جنگ احد کی شور مچائی، مدینے میں رہ کر دفاع کرنے کی اس کی تجویز بھی نہ مانی گئی۔ بہر حال اس جنگ میں کچھ عورتیں بیوہ ہو جاتی ہیں، کچھ بچے یتیم ہو جاتے ہیں۔ کچھ خاندان بے سہارا ہو جاتے ہیں۔ پیغمبر اسلامؐ کے چچا اور اسلام کے شجاع اور دلیر کمانڈر حضرت حمزہ جو ہتر دیگر مسلمانوں کے ساتھ شہید ہو جاتے

ہیں۔ اگرچہ یہ تعداد زیادہ قابل توجہ اور کثیر نہیں ہے، لیکن مدینہ کی نو مسلم آبادی بالخصوص ان مسلمانوں کے لئے جو دو منظم گروہوں، یہودیوں اور منافقوں کے درمیان زندگی گزار رہے ہوں تا قابل تلافی نقصان تھا۔ یہ صدمہ مسلمانوں کے لئے اس قدر شدید تھا کہ اللہ تعالیٰ نے چند آیات ان کی تسلی و تشفی کے لئے نازل فرمائیں۔ ارشاد ہوا:

إِنْ يَمْسَسْكُمْ قَرْحٌ فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ قَرْحٌ مِثْلُهُ ۖ وَتِلْكَ الْأَمْثَلُ
نُذَارٌ لِّهَا بَيْنَ النَّاسِ ۚ ... وَلَقَدْ كُنتُمْ تَمَنَّوْنَ الْمَوْتَ مِنْ قَبْلِ أَنْ
تَلْقَوْهُمْ فَقَدْ دَانَتْ مَوَاجِدُكُمْ فَاتُّمِرْتُمْ نَظَرُونَ ۝ (ال عمران ۱۳۰... ۱۳۳)

اگر تمہیں کوئی زخم لگا ہے تو تمہارے دشمنی کو بھی ویسا ہی زخم لگ چکا ہے اور یہ ہیں وہ ایام جنہیں ہم لوگوں کے درمیان گردش دیتے رہتے ہیں.... اور موت کے سامنے آنے سے قبل تو تم مرنے کی تمنا کر رہے تھے سو اب وہ تمہارے سامنے ہے جسے تم دیکھ رہے ہو۔

جناب زہرا سلام اللہ علیہا کو خبر ملتی ہے کہ جنگ میں آپ کے بابا زخمی ہو گئے ہیں۔ آپ کے چہرہ اقدس پر پتھر لگا ہے اور خون سے رنگین ہو گیا ہے۔ حضرت زہرا فوراً چند عورتوں کو ساتھ ملاتی ہیں۔ پانی اور خوراک اٹھاتی ہیں اور میدان جنگ کی طرف جاتی ہیں۔ خواتین زخموں کو پانی پلاتی ہیں ان کے زخموں کی مرہم پٹی کرتی ہیں اور جناب فاطمہ (س) اپنے باپ کے زخم صاف کرتی ہیں (۱) خون نہیں رکتا۔ وہ بوری کے ایک ٹکڑے کو جلاتی ہیں اور اس کی راکھ زخم پر رکھتی ہیں تاکہ خون رک جائے (۲)۔ ان با ایمان مسلمانوں خصوصاً حضرت حمزہ کی شہادت، پیغمبر اکرم آپ کے خاندان، آپ کی بیٹی اور تمام مسلمانوں پر بڑی گراں گزری۔ واقدی نے لکھا ہے کہ پیغمبر اسلام حضرت حمزہ کے غم میں گریہ کرتے رہے۔ حضرت زہرا (س) بھی روتی رہیں (۳)۔

ستر سے زیادہ پاک دل مجاہدوں کی شہادت نے تمام مسلمانوں کو غزدہ کر دیا تھا لیکن دشمنوں (یہودیوں اور منافقوں) کے طعنے اور باتیں ان سے زیادہ رنج آور تھیں۔ یہود نے زبان درازی شروع کی اور مسلمانوں کی سرزنش کرنے لگے کہ اگر تمہارا رہبر پیغمبر ہوتا تو اسے ایسی شکست نہ کھانا پڑتی۔ منافقین نے بھی مختلف قبائل کو پیغمبر اکرم سے علیحدہ کرنے کی بہت کوشش کی۔ رسول خدا نے ایک طرف قرآن کی آیات تلاوت فرما کر اور دوسری جانب شہدا کے پسماندگان سے دلجوئی

(۱) مخازی ص ۲۳۹۔ نیز رجوع فرمائیے: انساب الاشراف ص ۳۲۳۔ واقدی نے عورتوں کی تعداد چودہ لکھی ہے۔

(۲) مخازی ص ۲۵۰

(۳) ایضاً ص ۲۹۰

کر کے اس منافقانہ پروپیگنڈے کا اثر زائل کیا۔ آپؐ کبھی کبھی شہدا کی قبروں پر تشریف لے جاتے اور خدا سے ان کے لئے مغفرت طلب فرماتے۔ آپؐ کی دختر بھی اپنے باپ کے نقش قدم پر چلتے ہوئے شہدا کے لواحقین کی دلجوئی کرتیں۔

واقعی نے لکھا ہے کہ جناب فاطمہ سلام اللہ علیہا ہر دوسرے یا تیسرے دن احد جاتیں، شہیدوں کے مزاروں پر گریہ کرتیں اور ان کے لئے دعا فرماتیں۔ (۱)

☆☆☆☆☆

...وَيُؤْتُونَ عَلَى أَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ

(البقرہ ۹۰)

...اور وہ اپنے آپ پر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں اگرچہ وہ خود محتاج ہوں۔

رفتہ رفتہ جنگ احد کا تلخ واقعہ فراموش ہو جاتا ہے۔ درہم برہم گھرنے سرے سے آباد ہونا شروع ہوتے ہیں۔ بیوہ عورتیں نکاح کر لیتی ہیں۔ موقع پرستوں پر حملوں کا آغاز ہوتا ہے اور مدینے سے باہر بھیجے ہوئے دستوں کو کامیابیاں حاصل ہوتی ہیں۔

ہجرت کے چوتھے سال ماہ شعبان میں حسین علیہ السلام کی ولادت سے علی علیہ السلام کا گھر ایک بار پھر منور ہوتا ہے۔ ان کی پیدائش سے علی علیہ السلام کے گھر میں خوشی کی لہر دوڑ جاتی ہے۔ ان کے دو بیٹوں کے بعد حضرت علیؑ کے ہاں جناب فاطمہ (س) کے بطن پاک سے زینب، ام کلثوم اور محسن پیدا ہوئے۔

بلاذری نے لکھا ہے کہ پہلے جناب حسنؑ کا نام حرب رکھا گیا، لیکن حضورؐ نے فرمایا ان کا نام حسنؑ ہے۔ اس کے بعد حسینؑ اور محسنؑ کا نام بھی حرب رکھا گیا، لیکن حضور اکرمؐ نے فرمایا کہ میں ان کے نام حضرت ہارون علیہ السلام کے بیٹوں کے نام پر رکھنا چاہتا ہوں۔ (۱) البتہ اہل بیت کی روایات میں آیا ہے کہ علیؑ اور فاطمہ (س) نے اپنے بچوں کے نام آنحضرتؐ کے سپرد کیے کہ آپ ہی ان کے نام تجویز فرمائیں اور انہوں نے بچوں کے نام اس ترتیب سے رکھے: حسن، حسین، اور محسن۔ (۲)

جنگ دست مسلمانوں کی مالی حالت بھی بتدریج بہتر ہونے لگی۔ وہ قبائل جو جنگ احد کے بعد مسلمانوں سے الگ ہو گئے تھے، جب انہوں نے مسلمانوں کی ثابت قدمی اور بعد کی کامیابیوں کو دیکھا

(۱) انساب الاشراف ص ۳۰۳ و فاطمۃ الزہراء ص ۳

(۲) ارشاد مفید ج ۲ ص ۳۰۳

تو انہوں نے مکے سے منہ موڑ کر دوبارہ مدینے کی طرف رخ کیا یا کم از کم مکے کے مقابلے میں غیر جانبداری اختیار کی۔ جنگی غنائم کی وجہ سے مسلمانوں کے امور میں کچھ آسانی پیدا ہو گئی تھی۔ نبی زادی کا گھر اسی طرح خالی اور ضروریات زندگی سے محروم تھا۔ علیؑ اور فاطمہ (س) نے زہد، قناعت ایثار اور بھوک کو اپنا شعار بنا لیا تھا۔

ابن شہر آشوب بیان کرتے ہیں: ایک دن علیؑ علیہ السلام نے فاطمہ (س) سے پوچھا کیا کھانے کی کوئی چیز ہے؟

جواب ملتا ہے: ! خدا کی قسم دو دن سے میں اور میرے دونوں فرزند حسن اور حسین (علیہما السلام) بھوکے ہیں۔

علیؑ فرماتے ہیں: آپ نے مجھے کیوں نہیں بتایا؟

فاطمہؑ فرماتی ہیں: مجھے خدا سے شرم آتی تھی کہ آپ سے اس چیز کا مطالبہ کروں جسے آپ مہیا نہیں کر سکتے۔

حضرت علیؑ گھر سے باہر جاتے ہیں۔ ایک دینار قرض لیتے ہیں۔ گرمی بہت زیادہ ہے۔ بچے ہوئے سورج نے ہر چیز کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے۔ اس گرمی کے عالم میں مقداد بن اسود پریشان حالت میں کھڑے نظر آتے ہیں۔

علیؑ پوچھتے ہیں: مقداد کیا ہوا؟ کیوں اس گرمی میں گھر سے باہر نکلے کھڑے ہو؟

مقداد: اس کا جواب دینے سے مجھے معاف رکھیں۔

علیؑ: یہ نہیں ہو سکتا۔ آپ کو مجھے بتانا ہو گا۔

مقداد: اگر ایسا ہے تو سنیے! بات یہ ہے کہ بھوک نے مجھے گھر سے باہر نکلنے پر مجبور کر دیا ہے۔ مجھ سے بچوں کا رونا برداشت نہیں ہو سکتا۔

علیؑ: خدا کی قسم! میں بھی اسی خاطر گھر سے نکلا تھا۔ یہ دینار قرض لیا ہے لیکن تجھے اپنے آپ پر مقدم سمجھتا ہوں۔ یہ کہہ کر قرض لی ہوئی رقم مقداد کے حوالے کر دیتے ہیں۔^(۱)

اس مساوات میں پیغمبر اکرمؐ کی دختر کا بھی برابر کا حصہ تھا بلکہ کبھی کبھار ان کا حصہ بڑھ جاتا تھا۔ ایک دن، دو دن یا تین دن وہ خود اور ان کے بچے بھوکے رہتے تھے، لیکن فاطمہ زہرا (س) علیؑ علیہ السلام کو نہیں بتاتی تھیں۔ جب علیؑ علیہ السلام آگاہ ہوتے تو فرماتے کہ مجھے کیوں نہیں بتایا کہ بچے بھوکے ہیں؟ فاطمہ زہرا (س) جواب میں فرماتیں:

میرے بابا نے فرمایا ہے۔ علیؑ سے کوئی چیز طلب نہ کر مگر یہ کہ وہ خود

(۱) کشف الغمہ ج ۱ ص ۲۶۹ (آ خر حدیث تک)

آپ کے لئے مہیا کریں (۱)

ابن شہر آشوب کی روایت میں ہے کہ انہوں نے فرمایا:
مجھے خدا سے شرم آتی ہے کہ آپ سے ایسی چیز مانگوں جسے پورا کرنے کی طاقت آپ میں نہ ہو۔ (۲)

ابو نعیم اصفہانی علمائے اہل سنت والجماعت میں سے ہیں۔ سنہ ۴۳۰ھ میں فوت ہوئے۔ انہوں نے خدا کے برگزیدہ بندوں کے اوصاف کے متعلق ایک کتاب بنام حلیۃ الاولیاء وطبقات الاصفیاء چند جلدوں میں تحریر کی ہے۔ اس میں انہوں نے ایک فصل جناب فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا سے مختص کی ہے۔ اس فصل میں وہ اپنی اسناد کے ساتھ عمران بن حصین سے یوں بیان کرتے ہیں:
ایک دن پیغمبر اکرمؐ نے مجھ سے فرمایا: کیا تم فاطمہ زہرا سے ملنے میرے ساتھ نہیں چلتے؟

عمران: کیوں نہیں۔ ہم اکٹھے فاطمہ زہرا (س) کے گھر گئے۔ حضورؐ نے اجازت مانگی۔ آپ کی بیٹی نے گھر آنے کی اجازت دی۔ رسول اللہؐ: میرے ساتھ ایک اور آدمی ہے، کیا اس کے ساتھ اندر آجاؤں؟
فاطمہ (س): بابا جان! خدا کی قسم ایک عبا کے علاوہ دوسرا کپڑا نہیں ہے۔ رسول اللہؐ: میری بیٹی عبا سے اپنے آپ کا اس طرح سے پردہ بنالے۔ (آپ نے پردہ کرنے کا حکم دیا) فاطمہ (س): میرے پاس اوڑھنی نہیں ہے۔ پیغمبر اکرمؐ نے کاندھے پر جو پرانی چادر تھی وہ فاطمہ زہرا (س) کے سامنے رکھ دی اور کہا اس سے اپنے سر ڈھانپ لیں۔ عمران نقل کرتے ہیں: ہم اکٹھے حجرے میں داخل ہوئے۔
رسول اللہؐ: بیٹی کیسی ہو؟

فاطمہ (س): بابا جان تکلیف سہنے کے ساتھ خالی پیٹ بھی ہوں۔
رسول اللہؐ: کیا آپ راضی نہیں ہیں کہ آپ جہان کی عورتوں کی سردار ہوں؟

فاطمہ (س): بابا جان کیا مریم بنت عمران عورتوں کی سردار نہیں ہیں۔
رسول اللہؐ: وہ اپنے زمانے کی عورتوں کی سردار تھیں۔ تم سب جہان کی

(۱) بحار ج ۳۳ ص ۱۳۱ از تفسیر عیاشی

(۲) مناقب ج ۱ ص ۲۶۹

عورتوں کی سردار ہو اور تمہارا شوہر دنیا و آخرت میں صاحب عظمت و
بزرگی ہے۔ (۱)

یہ عمران نامی صحابی جو پیغمبر اکرمؐ کے ہمراہ حضرت زہرا (س) کے گھر گئے اور اس واقعہ کا
مشاہدہ کیا، قبیلہ خزاعہ سے تعلق رکھتے تھے اور ان افراد میں سے تھے جو جنگ خیبر کے بعد مسلمان
ہوئے تھے۔ (۲) ان کی روایت سے ایک نہایت اہم نکتہ اخذ ہوتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ یہ ملاقات تقریباً فتح
مکہ کے بعد یا اس سے کچھ پہلے ہوئی ہے۔ اس مدت تک مسلمانوں کی معاشی حالت پہلے سے کہیں
زیادہ بہتر ہو چکی تھی، لیکن پیغمبر اکرمؐ کے گھر والے اب بھی انہی مشکل حالات میں زندگی گزار
رہے تھے۔ رسول زادی (س) کے پاس اپنے آپ کو چھپانے کے لئے عبا کے سوا کوئی دوسرا کپڑا نہ تھا
اور وہ باپ کی طرف سے دی گئی چادر سے اپنا سر چھپاتی ہیں۔

ابو نعیم اپنی کتاب میں رسول اللہؐ کی دختر کے حالات زندگی پر مشتمل باب کے آغاز میں
حضرت زہرا (س) کا تعارف ان الفاظ میں کراتے ہیں:

انہوں نے اس دنیا کی برائی اور آفتوں کو دیکھا اور اپنے آپ کو دنیا اور
مافیہا سے جدا کر لیا۔ (۳)

ایک دن حضرت سلمانؓ رسول زادی (س) کے گھر جاتے ہیں۔ کیا دیکھتے ہیں کہ فاطمہ زہرا
سلام اللہ علیہا کے سر پر جو چادر ہے، اسے کئی پیوند لگے ہوئے ہیں۔ سلمان حیرانگی کے ساتھ اس چادر
کو دیکھتے ہیں اور غمگین ہو جاتے ہیں۔ ایسا کیوں ہے؟ کیا پیشوائے عرب کی بیٹی اور رسول خداؐ کے چچا
زاد بھائی کی زوجہ نہیں ہیں؟ مسلمان ایسا سوچنے میں حق بجانب ہیں۔ کیونکہ انہوں نے ایران کے
شاہزادوں کی زندگیوں اور ان کا شکوہ و جلال اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ اس لیے جب فاطمہ زہرا
رسول اللہؐ سے ملنے گئیں تو آپؐ سے عرض کی:

بابا جان! سلمان نے میری پھٹی ہوئی چادر دیکھ کر اظہار تعجب کیا ہے۔ خدا
کی قسم! علیؑ کے گھر میں آئے ہوئے پانچ سال ہو چکے ہیں۔ ہمارے پاس
ایک بھیڑ کی کھال ہے، جس پر دن کو اونٹ کو چارہ ڈالتے ہیں اور رات
کو اسی پر ہم سوتے ہیں۔ (۴)

وہ نہ صرف لباس اور خوراک میں کم سے کم پر قناعت کرتیں اور مشکلات کو برداشت

(۱) حلیۃ الاولیاء ج ۳ ص ۴۲ نیز رجوع کیجئے: بحار ج ۴۳ ص ۳۷ اور مناقب ابن شمر آشوب ج ۳ ص ۳۲۳۔ الاستیعاب ص ۵۵۔

(۲) الاصابہ ج ۵ ص ۲۶۔ الاعلام ذر کلی ج ۵ ص ۲۳۲

(۳) حلیۃ الاولیاء و طبقات الامتلاء ج ۲ ص ۳۹۔ (۴) بحار ج ۸۸

کرتی تھیں بلکہ گھر کا کام کاج بھی کسی دوسرے سے نہیں کراتی تھیں۔ پانی لانے سے لے کر گھر کی صفائی، مکئی یا گیہوں پیسنے اور بچوں کی دیکھ بھال تک سب کچھ خود کرتی تھیں۔ کبھی کبھار ایک ہاتھ سے چکی چلاتی تھیں اور دوسرے ہاتھ سے بچے کو تھکیاں دے کر سلاتی تھیں۔ ابن سعد اپنی روایت میں حضرت علیؑ سے نقل کرتے ہیں:

جب فاطمہؑ سے شادی کی تو ہمارے پاس بھیڑ کی ایک کھال تھی جسے رات کو ہم بچھونا بنا کر سوتے اور دن کو پانی ٹکالنے والے اونٹ کو چارہ ڈالتے اور اس اونٹ کے علاوہ ہمارے پاس کوئی اور خدمت گزار نہ تھا (۱)

اتنی خود داری اور اتنے زہد کے باوجود، جب ایک دن رسول اکرمؐ حضرت زہرا کے گھر تشریف لے گئے تو جناب زہرا کی گردن میں ایک گلوبند دیکھا جسے حضرت علیؑ نے اپنے حصے (فنی) سے خریدا تھا۔ آپؐ فرماتے ہیں:

میری بیٹی کیا دنیا پر فریفتہ ہو گئی ہو! لوگ کیا کہیں گے کہ محمدؐ کی بیٹی ہو اور جہاروں جیسا لباس پہنتی ہو۔ حضرت فاطمہ (س) نے گلوبند بیچ دیا اور اس کی قیمت سے ایک غلام کو آزاد کرادیا۔ (۲)
علی علیہ السلام بنی سعد کے ایک شخص سے فرماتے ہیں:

کیا تم چاہتے ہو میں اپنا اور فاطمہ (س) کا قصہ سناؤں؟ فاطمہ زہرا (س) اپنے باپ کی نظروں میں سب سے محبوب ترین شخصیت تھیں، لیکن وہ میرے گھر میں اس قدر مشکیزہ کے ذریعے پانی لائیں کہ مشکیزہ کے داغ ان کے سینہ پر پڑ گئے۔ انہوں نے اتنی چکی چلائی کہ ان کے ہاتھوں پر گئے پڑ گئے اور گھر میں اتنی جھاڑو دی کہ ان کے لباس کا رنگ خاک آلود ہو گیا۔ اور اسقدر... (۳)

ایک دن میں نے ان سے کہا کہ کیا ہو گا اگر آپ اپنے والد سے ایک خادم کا تقاضا کریں تاکہ وہ کاموں میں آپ کا ہاتھ بٹا سکے اور آپ کی مدد کر سکے؟ سیدہ زہرا (س) اپنے بابا کی خدمت میں تشریف لے گئیں، لیکن بابا سے کچھ مانگنے سے شرم محسوس کی اور بغیر کچھ کہے گھر واپس

(۱) طبقات ج ۸ ص ۱۴

(۲) بحار ج ۲۳ ص ۲۷

(۳) مسند احمد ج ۲ ص ۳۲۹

آگئیں۔ پیغمبر اکرمؐ سمجھ گئے کہ ان کی لخت جگر کسی کام سے آپؐ کے پاس آئی تھیں۔ دوسرے دن رسول خداؐ ہمارے گھر تشریف لائے۔ آپؐ نے سلام کیا۔ ہم خاموش رہے۔ آنحضرتؐ کا معمول یہ تھا کہ تین مرتبہ سلام کرتے، اگر جواب نہ ملتا تو واپس چلے جاتے۔ ہم نے آپؐ کے دوسرے سلام کا جواب دیا اور آپؐ سے گزارش کی کہ اندر تشریف لے آئیں۔ آپؐ گھر میں تشریف فرما ہوئے اور فرمایا: فاطمہ (س) کل باپ سے تمہیں کیا کام تھا؟ مجھے خوف لاحق ہوا کہ جو کچھ میں نے ان سے کہا ہے وہ اپنے باپ سے نہ کہیں۔ میں نے عرض کی فاطمہؓ کی صورتحال یہ ہے کہ گھر کے کام کاج کی سختی سے انہیں اذیت ہوتی ہے اور اس تکلیف کے اثرات ان کے جسم پر نمایاں ہیں۔ میں نے ان سے کہا کہ آپؐ کے پاس جا کر ایک خادمہ کا مطالبہ کریں۔ آپؐ نے فرمایا کیا میں آپؐ کو ایسی چیز نہ بتاؤں جو ایک خادم سے بہتر ہے؟ جب آپؐ سونے لگیں تو تینتیس مرتبہ خدا کی تسبیح ”سبحان اللہ“ تینتیس (۳۳) مرتبہ خدا کی حمد ”الحمد للہ“ اور تینتیس مرتبہ ”اللہ اکبر“ پڑھیں۔ فاطمہ زہرا (س) نے سر اوپر اٹھایا اور تین مرتبہ کہا میں اللہ اور اس کے رسولؐ سے راضی ہوں۔ (۱)

ابن سعد نے اپنی کتابوں میں لکھا ہے کہ جب فاطمہ زہراء (س) نے اپنے والد گرامی سے خادم کا تقاضا کیا تو آپؐ نے جواب میں فرمایا:

خدا کی قسم جب تک اصحاب صفہ بھوک کی حالت میں ہیں۔ میں آپؐ کو خادم نہیں دوں گا۔ (۲)

شیخ صدوق امالی میں ذکر کرتے ہیں کہ جب پیغمبر اکرمؐ کسی سفر سے واپس آتے سب سے پہلے فاطمہ زہرا (س) سے ملنے جاتے اور کافی دیر تک ان کے پاس بیٹھے رہتے۔ پیغمبر اکرمؐ کے ایک سفر کے دوران حضرت فاطمہ (س) نے اپنے لئے چاندی کے گوشوارے، گلوبند اور کنکن بنوائے اور گھر کے دروازے پر ایک پردہ لٹکادیا۔ حسب معمول سفر سے واپسی پر آپؐ اپنی بیٹی کے گھر تشریف لے گئے۔ تھوڑی دیر رکنے کے بعد ناراضگی کے تاثرات لئے وہاں سے آگئے اور مسجد نبویؐ کا رخ کیا۔ تھوڑی دیر نہ گزری تھی کہ فاطمہ (س) کی طرف سے ایک شخص، گلوبند، گوشوارے، کنکن اور پردہ

(۱) بحار ص ۸۲۔ سند احمد ج ۲ ص ۳۹ و ۱۰۵

(۲) طبقات ج ۸ ص ۱۶

لے کر آنحضرتؐ کی خدمت میں آ پہنچا اور کہا کہ فاطمہ (س) کہہ رہی ہیں کہ ان چیزوں کو فروخت کر دیں اور راہ خدا میں استعمال کریں۔ پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا: اس پر باپ قربان ہو جو اسے کرنا چاہیے تھا اس نے کر دیا۔ دنیا محمدؐ و آل محمدؐ کے لئے نہیں ہے۔ (۱)

جب رسالتؐ ان میں اعلیٰ انسانی صفات دیکھتے اور اسلامی تربیت کے اثرات کا مشاہدہ ان کے کردار اور گفتار میں کرتے تو خوش ہوتے۔ ان کی تعریف کرتے۔ ان کے لیے دعائے خیر فرماتے۔ مسلمانوں کو ان کی شان و منزلت اور اعلیٰ مرتبے کی پہچان کرانے کے لئے فرماتے تھے:

فاطمہ (س) میرا کلڑا ہے جس نے اسے تکلیف پہنچائی اس نے مجھے تکلیف

پہنچائی۔ (۲)

آنحضرتؐ جناب فاطمہ (س) سے اپنی محبت کا اظہار کبھی ان کے آنے پر کھڑے ہو کر کرتے اور کبھی ان کے سر اور ہاتھوں کے بوسے لے کر فرماتے۔ (۳) جب بھی آپ سفر سے واپس لوٹتے سب سے پہلے مسجد میں دو رکعت نماز ادا فرماتے، پھر فاطمہ زہرا (س) سے ملنے جاتے، پھر اپنی زوجات کے پاس تشریف لے جاتے۔ (۴)

دوسروں کو آگاہ کرنے کے لئے آپؐ مختلف مواقع پر اہم ارشادات فرماتے رہے کہ اس محبت کا سرچشمہ پداری جذبات و احساسات نہیں بلکہ آپؐ فاطمہ (س) کو ان صفات کی حامل ہونے کی بناء پر چاہتے ہیں جو ان جیسی بلند مرتبہ خاتون میں ہونی چاہیے تھیں۔ جہاں تک ان کی سنگین ذمہ داری کا تقاضا تھا، آپؐ حضرت فاطمہ کو ہمیشہ متوجہ کرتے رہتے اور اجر کے حوالے سے اخروی پاداش اور اللہ تعالیٰ کے لطف کا یقین دلاتے رہتے۔

ایک دن آنحضرتؐ جناب زہرا (س) کے گھر تشریف لائے۔ دیکھا کہ ایک ہاتھ سے بچی چلا رہی ہیں اور دوسرے ہاتھ سے بچے کو دودھ پلا رہی ہیں۔ یہ دیکھ کر آپؐ نے فرمایا:

بٹی دنیا کی تلخی برداشت کرو تا کہ آخرت کی شیرینی تمہارا مقدر بن سکے۔

جناب زہرا (س) نے جواب میں فرمایا:

خدا کی نعمتوں پر اس کی حمد کرتی ہوں۔

(۱) بحار ج ۳۳ ص ۲۰ نیز ملاحظہ فرمائیں مناقب ج ۲ ص ۷۱۔ مسند احمد حدیث ۴۷۲۷۔

(۲) بحار ص ۸۱۔ بلاذری ص ۳۰۳ اور صحیح بخاری باب فضائل اصحاب الہی ج ۵ ص ۲۶ و دیگر مآخذ

(۳) مناقب ج ۳ ص ۳۳۳ و دیگر مآخذ

(۴) الاستیعاب ص ۷۰

آنحضرتؐ فرماتے ہیں:

اللہ نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ وہ مجھے اتنا عطا فرمائے گا کہ میں راضی

ہو جاؤں گا۔ (۱)

آنحضرتؐ نے گھر کے کام کاج کی ذمہ داری جناب زہرا کے سپرد کی تھی اور گھر سے باہر کے کاموں کی ذمہ داری علی علیہ السلام کے کندھوں پر ڈالی تھی۔

☆☆☆☆☆

(۱) تفسیر مجمع البیان ج ۵ ص ۵۰۱۵

فِي قُلُوبِهِمْ مَرَضٌ ۖ فَزَادَهُمُ اللَّهُ مَرَضًا... (مقرہ ۱۰۰)
ان کے دلوں میں ایک بیماری ہے سو اللہ نے ان کی بیماری اور
بڑھا دی...

شیعہ و سنی روایات میں چند ایسی احادیث سے بھی ہمیں واسطہ پڑتا ہے جو یہ بیان کرتی ہیں کہ
کبھی کبھی جناب فاطمہ (س) اور ان کے شوہر کے درمیان کدورت پیدا ہو جاتی۔ یہاں تک کہ فیصلے کے
لئے حضور اکرمؐ کی خدمت میں چلے جاتے تھے۔

ابن سعد نے لکھا ہے کہ ایک دن علیؑ فاطمہ (س) کے ساتھ سختی سے پیش آئے۔ (۱) جناب
فاطمہ (س) نے کہا خدا کی قسم تمہاری شکایت آنحضرتؐ سے کروں گی۔ یہ کہہ کر وہ رسول اللہؐ کے
پاس چلی گئیں۔ علیؑ بھی ان کے پیچھے پیغمبرؐ کے گھر چلے گئے اور ایسی جگہ پر جا کر کھڑے ہو گئے جہاں
سے فاطمہ (س) کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔

سیدہ فاطمہ (س) نے اپنے باپ سے علیؑ کی سختی اور زیادتی کی شکایت کی۔ پیغمبر اکرمؐ نے ان
کے جواب میں کہا:

میری پیاری بیٹی! ایک عورت کو یہ توقع نہیں کرنی چاہیے کہ شوہر اسے
جو کام کہے، وہ انجام نہ دے اور پھر اس کی نافرمانی کے بدلے شوہر
خاموش رہے۔

علی علیہ السلام نے کہا: میں نے زہرا (س) سے کہا ہے کہ خدا کی قسم آج کے بعد ایسی بات
آپ سے نہیں کہوں گا جو آپ کو اچھی نہ لگے۔ (۲)
ابن حجر نے لکھا ہے:

(۱) کان فی علی علی فاطمة شدة

(۲) طبقات ج ۳ ص ۱۶

علیٰ اور فاطمہ (س) کے درمیان سخت گفتگو ہوئی۔ رسول خدا اصلاح کے لئے ان کے گھر تشریف لے گئے۔ جب باہر آئے تو لوگوں نے آپؐ سے پوچھا کہ جب آپؐ اندر تشریف لے گئے تو اداس و پریشان تھے لیکن جب باہر آئے ہیں تو خوش و خرم ہیں۔ اس کی کیا وجہ ہے؟ آپؐ نے فرمایا کہ میں نے دو شخصیات کے درمیان صلح کرا دی ہے جو مجھے سب سے زیادہ محبوب ہیں۔^(۱)

اس قسم کی روایات کے برعکس علی بن عیسیٰ اربلی حضرت علی علیہ السلام کے قول کو یوں نقل کرتے ہیں:

پیغمبر اکرمؐ نے شادی کی رات مجھے فرمایا کہ اپنی زوجہ کے ساتھ مہربانی کے ساتھ پیش آنا اور ان سے اچھا سلوک کرنا کیونکہ وہ میرا نکلا ہے۔ جس نے اسے ناراض کیا اس نے مجھے ناراض کیا۔ اس کے بعد فرمایا: میں آپؐ دونوں کو خدا کے سپرد کرتا ہوں۔ خدا کی قسم جب تک فاطمہ (س) زندہ رہیں میں نے کبھی انہیں ناراض نہیں کیا۔ انہوں نے بھی ساری زندگی ایسا کوئی کام نہ کیا جو میری ناراضگی کا باعث بنتا۔ جب بھی میں ان کی طرف نظر کرتا میرا غم اور پریشانی دور ہو جاتی تھی۔^(۲)

اگرچہ یہ ایک فطری امر ہے کہ کبھی کبھار قریبی دوستوں کے درمیان بھی تلخی پیدا ہو جاتی ہے۔ لیکن شیعہ عقائد کے مطابق علی علیہ السلام اور فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہما مقام عصمت پر فائز ہیں۔ لہذا ان کے درمیان اختلاف کی نسبت اور وہ بھی اس حد تک کہ معاملہ فیصلے کے لئے نبی کریمؐ تک جا پہنچے، ان کے اس مقام و منزلت کے سازگار نہیں ہے۔

یہی وجہ ہے کہ علامہ مجلسی نے شیخ صدوق کے قول کے بارے میں یوں لکھا ہے:

یہ روایت میرے نزدیک درست نہیں ہے۔ کیونکہ ان کے آپس میں تعلقات اس طرح نہیں تھے کہ ان میں ناچاتی پیدا ہو جائے اور معاملہ ثالثی تک جا پہنچے۔^(۳)

جناب فاطمہ (س) کی علی علیہ السلام سے ناراضگی کے ان واقعات میں سے ایک واقعہ یہ بیان

(۱) الاصابہ ج ۸ ص ۱۶۰۔ بحار ص ۱۳۶

(۲) کشف الغمہ ج ۱ ص ۳۶۳۔ بحار ص ۱۳۳۔ ۱۳۴ ج ۱۳۳

(۳) بحار ص ۱۳۶۔ ۱۳۷

کیا گیا ہے کہ علی علیہ السلام نے ابو جہل کی بیٹی جویریہ سے خواستگاری کی۔ جس پر جناب فاطمہ (س) رنجیدہ خاطر ہوئیں۔

مُسُوذُ بْنُ مَخْرَمَةَ کے بقول یہ واقعہ اس طرح بیان ہوا ہے:

علیؑ نے ابو جہل کی بیٹی سے شادی کی خواہش کا اظہار کیا۔ جب فاطمہ (س) نے سنا تو پیغمبر اکرمؐ کی خدمت میں چلی گئیں اور کہا آپؐ کے رشتے دار یہ سمجھتے ہیں کہ آپؐ اپنی بیٹی کا خیال نہیں رکھتے اور ان کی طرفداری نہیں کرتے۔ علیؑ نے ابو جہل کی لڑکی سے خواستگاری کی ہے۔ رسول اللہؐ اٹھ کھڑے ہوئے، مسجد تشریف لے گئے۔ جب نماز سے فارغ ہوئے تو میں نے سنا، آپؐ فرما رہے تھے کہ فاطمہ میرا کلڑا ہے۔ جو بات اسے رنجیدہ کرے میں اسے پسند نہیں کرتا۔ خدا کی قسم! رسول خدا کی بیٹی اور دشمن خدا کی بیٹی ایک گھر میں جمع نہیں ہو سکتیں۔ اس کے بعد علیؑ نے شادی کا ارادہ ترک کر دیا۔ (۱)

اس بات کو بخاری اور مسلم کے علاوہ دیگر راویوں میں سے ایک یا دو نے نقل کیا ہے۔ بلاشبہ و شبہ یہ روایت جھوٹی ہے۔ سند کے ضعف کے علاوہ حدیث کے الفاظ اس مضمون اور مفہوم کی تکذیب کرتے ہیں۔

پہلی بات یہ کہ روایت بیان کرتی ہے کہ پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا کہ رسول خدا کی بیٹی اور دشمن خدا کی بیٹی ایک فرد کے ہاں جمع نہیں ہو سکتیں۔ عبارت سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس وقت ابو جہل زندہ تھا۔ حالانکہ ہجرت کے دوسرے سال رمضان میں جنگ بدر میں مارا گیا تھا اور جیسا کہ ہم بیان کریں گے سور ماہ ذوالحجہ سنہ ۲ ہجری میں پیدا ہوا ہے۔

اگر ہم یہ کہیں کہ یہ واقعہ جنگ بدر اور ابو جہل کے مارے جانے کے کئی سال بعد ہوا ہے تو اس وقت یہ عبارت ”دختر رسول اور دشمن خدا کی بیٹی ایک مرد کے ہاں اکٹھی نہیں ہو سکتیں“ بے معنی اور بے مقصد رہ جائے گی۔ کیونکہ مشرک ابو جہل سالہا سال پہلے اپنے کیفر کردار کو پہنچ چکا تھا۔ اسلامی فقہ کی رو سے اس کا شرک اس کی بیٹی کے معاملات پر اثر انداز نہیں ہو سکتا۔

دوسری بات یہ کہ اتنا اہم واقعہ رونما ہوا کہ حضور اکرمؐ اس کا شکوہ مسجد میں اصحاب کے سامنے کرتے ہیں تو پھر یہ متعدد طریقوں سے منقول ہونا چاہیے تھا اور حد تو اترا یا کم از کم شہرت کی حد کو پہنچتا، نہ یہ کہ اس کا راوی صرف مُسُوذُ بْنُ مَخْرَمَةَ ہوتا۔

(۱) صحیح بخاری ج ۵ باب ذکر مصار التبی من ۲۸ نیز ملاحظہ فرمائیں۔ نسب قریش ص ۳۱۲ اور الاسابہ ص ۲۳ جز ۲۳ و ص ۷۳ جز ۵

چوتھی بات یہ کہ مسووز پیغمبر اکرمؐ کی مدینہ ہجرت کے دو سال بعد مکہ میں پیدا ہوا۔ آٹھ ہجری میں ماہ ذوالحجہ کے بعد اپنے والد کے ساتھ مدینے آیا اور نبی کریمؐ کی رحلت کے وقت اس کی عمر آٹھ سال تھی۔ سن چوتھ ہجری ماہ ربیع الاول میں حصین بن نمیر کی طرف سے محاصرہ مکہ کے دوران منجیق کے ذریعے پھینکے گئے، پتھر کے لگنے سے یہ فوت ہوا (۱) ابن ہجر نے بھی اس کی پیدائش کو ہجرت کے دو سال بعد لکھا ہے اور وہ بیان کرتا ہے کہ سب اس امر پر متفق ہیں۔ اس کے بعد اس کی اس حدیث (پیغمبر اکرمؐ سے میں نے سنا جبکہ میں تعلم تھا) کے بارے میں لکھتا ہے کہ بعض کے نظریے کے مطابق یہ صیغہ مادہ علم سے ہے یعنی میں عاقل تھا اور حدیث کو سنتا اور محفوظ کرتا تھا۔ (۲) پس یہ بات اس کے بچہ ہونے سے تضاد نہیں رکھتی ہے۔

اسی طرح اس کے پتھر اٹھانے اور اس دوران اس کی شلوار گرنے کا جو واقعہ نقل کیا گیا ہے وہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ وہ پیغمبر اکرمؐ کی زندگی میں بچہ تھا اور پتھر اٹھانے کی طاقت نہیں رکھتا تھا۔ اس بناء پر اس کا ابو جہل کی لڑکی سے حضرت علیؓ کی خواستگاری والی روایت نقل کرنا اعتبار سے خالی ہے۔ یعنی اس پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔

اس پر اس جملے کا اضافہ کیا جانا چاہیے کہ سابقہ علمائے اخبار اور روایات کی تحقیق میں زیادہ تر ان کی نقل کی طرف توجہ دیتے تھے اور روایت کے لحاظ سے بہت کم تنقیدی جائزہ لیتے تھے۔ اگر انہوں نے کہیں پر حدیث پر تنقید کی ہے تو یہ جاننے کے لیے کی ہے کہ گزشتہ علماء نے ان راویوں کو سچا اور نیک کردار کہا ہے یا نہیں۔ اگر انہوں نے ان راویوں کو سچا سمجھا ہے تو جو کچھ انہوں نے روایت کیا ہے، سب قبول کر لیتے۔ لیکن ایک نکتے کو ہر گز فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ وہ افراد جو حدیثیں گھڑتے اور لوگوں کے درمیان پھیلاتے ہیں، وہ ان تمام پہلوؤں کا خیال رکھتے ہیں تا کہ ان کی جعلی حدیثیں قابل قبول ہوں۔ اس مقام پر علم حدیث کے ساتھ دوسرے خارجی قرائن کو بھی مد نظر رکھنا چاہیے۔ حدیث کی جعل سازی پہلی صدی ہجری کے دوسرے چوتھائی حصے میں ہو گئی تھی اور تقریباً دو صدیوں تک یہ کام جاری رہا۔ بنی امیہ کی ستر سالہ حکومت اور بنی عباس کی حکومت میں سو سال سے زیادہ عرصہ تک (یعنی روایات و احادیث کو تحریری صورت میں لانے تک) دشمنان علیؓ سے جہاں تک بن پڑا انہوں نے ان کی مذمت میں جعلی حدیثیں بیان کیں۔ قدرتی امر ہے کہ انہیں ایسی روایات بھی بنانی چاہیے تھیں جو اس بات کی نشاندہی کرتیں کہ نہ صرف گھر سے باہر لوگ علیؓ سے نالاں تھے بلکہ گھر کے اندر اور ان کے قریب ترین افراد بھی ان سے خوش نہ تھے۔ بالفرض اگر یہ

(۱) الاستیعاب ص ۲۶۱ ج ۱

(۲) الاستیعاب ص ۹۹ ج ۲ ششم

روایات صحیح بھی ہوں پھر بھی ان کی شان و عظمت میں کوئی نقص یا کمی پیدا نہیں ہوتی۔ کیونکہ وہ بھی انسان تھے اور ہر انسان مختلف حالات سے گزرتا ہے۔

جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے، یہ جعلی حدیثیں سادہ دل محدثین کی کتب میں لکھی گئیں اور ان کتابوں سے ان افراد کی کتب میں منتقل ہوئی ہیں جو اپنے خیال میں ”تاریخ اسلام“ کو سائنسی بنیادوں پر لکھنا چاہتے ہیں۔ اس بناء پر اگر ہم ”امیل ڈور منٹم“ کی کتاب میں پڑھتے ہیں کہ فاطمہ سے جھگڑے کے بعد علیؑ مسجد میں جا کر پناہ لیتے اور وہیں پر سوتے ہیں۔ ان کے چچا زاد بھائی ان کے پاس جاتے، انہیں نصیحت کرتے اور ان کی بیوی سے صلح کرا دیتے ہیں تو یہ قدرتی بات ہے۔ (۱)

بہر حال اس قسم کی روایات ایسے مؤرخین کے لئے ثبوت فراہم کرتی ہیں۔ جیسا کہ ہم نے لکھا ہے ان روایات کی بنیاد نہیں ہے اور اگر ان میں سے بعض کو ہم درست مان بھی لیں تو ان سے صرف میاں بیوی کے درمیان قدرتی نوک جھونک کا پتہ چلتا ہے اور یہ کسی لحاظ سے بھی ان عظیم ہستیوں کے اعلیٰ اور بلند اخلاق کے دامن کو گرد آلود نہیں کر سکتا۔



(۱) حیات محمد (ترجمہ عربی) ص ۱۹۹۔ الفہریرج ۳ ص ۱۷

وَالَّذِينَ يَبْتُغُونَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَقِيَامًا (الفرقان: ۶۴)
اور جو اپنے پروردگار کے حضور سجدے اور قیام کی حالت میں
رات گزارتے ہیں۔

دختر رسول جس طرح ازدواجی زندگی میں نمونہ تھیں اسی طرح اطاعت الہی کا بھی اعلیٰ مظہر
تھیں۔ اگر ازدواجی زندگی کی بنیاد تقویٰ اور حسن سلوک پر ہو تو یہ بھی اطاعت خداوندی ہے۔ لیکن
یہاں پر اطاعت الہی سے مراد نماز کا قیام اور خدا کی طرف متوجہ ہونا ہے۔ جب حضرت زہرا (س) گھر
یلو کام کاج سے فارغ ہو جاتیں تو عبادت الہی میں مشغول ہو جاتیں۔ نماز تضرع اور خدا کی بارگاہ میں
دعا، دعا بھی دوسروں کے لئے، نہ اپنے لئے (ان کا روزانہ کا معمول تھا)۔

امام صادق علیہ السلام اپنے والد اور آنجناب اپنے والد محترم سے اور آنجناب اپنے چچا حسن بن
علی (علیہما السلام) سے روایت کرتے ہیں:

والدہ گرامی جمعہ کی راتوں میں اول شب سے لے کر صبح تک محراب عبادت میں مصروف رہتیں اور
جب دست دعا بلند کرتیں تو سب مومن مرد اور مومنہ عورتوں کے لئے دعا فرماتیں، لیکن اپنے لئے
دعا نہ کرتیں۔ ایک دن میں نے ان سے عرض کیا: اماں جان! آپ دوسروں کی طرح اپنے لئے دعائے
خیر کیوں نہیں کرتیں؟ انہوں نے فرمایا: بیٹا! ہمسائے کا حق زیادہ ہے۔ (۱)

آپ کی تسبیحات جو تسبیحات زہرا (س) کے نام سے مشہور ہیں، شیعہ و سنی کی تمام معتبر کتب
اور احادیث کی کتابوں میں مذکور ہیں۔ (۲) یہ تسبیحات سب کے نزدیک معروف ہیں۔ سنت کے پابند
افراد ان تسبیحات کو ہر نماز کے بعد پڑھتے ہیں: چونتیس مرتبہ اللہ اکبر، تینتیس مرتبہ سبحان اللہ اور
تینتیس مرتبہ الحمد للہ۔

(۱) کشف الغمۃ ج ۱ ص ۴۶۸

(۲) بحار ج ۳ ص ۸۲ نیز رجوع کیجئے سند احمد ج ۲ ص ۳۹ اور ۱۰۵

نیز سید ابن طاووس نے دعاؤں کے قبول ہونے کے بارے میں ان سے ایسی دعائیں روایت کی ہیں جو آپ ظہر، عصر، مغرب، عشاء اور صبح کی نمازوں کے بعد باقاعدگی سے پڑھتی تھیں۔ اسی طرح آپ سے اور بھی دعائیں منقول ہیں جن میں سے کچھ مشکلات کے وقت پڑھی جاتی ہیں۔ جو افراد دعائیں پڑھنے اور مستحبات ادا کرنے کے پابند ہیں وہ ان دعاؤں سے واقف ہیں۔



وَأَتِذَا الْقُرْيُوبِيُّ حَقَّهُ (الروم: ۳۸)
پس تم قرابتدار کو اس کا حق دے دو۔

دین خدا، حکومت اسلام اور مدینہ والوں کے خلاف مکہ والوں کی آخری کوشش جنگ خندق تھی۔ ابوسفیان نے بہت زیادہ بھاگ دوڑ کر کے منتشر قبائل کو اکٹھا کیا۔ یہاں تک کے وہ یہودیوں کو بھی اپنے ساتھ ملانے میں کامیاب ہو گیا۔ دس ہزار کے لشکر نے مدینے کا محاصرہ کر لیا۔ دشمن کے مقابلے میں مسلمانوں کی تعداد کم تھی لیکن اگر ایمان کی قوت بروئے کار لائی جائے تو لشکر شیطان کے پاؤں اکھڑ جائیں گے۔ حملہ آوروں نے کچھ حاصل کئے بغیر مکے کی جانب عقب نشینی کی۔

اس کے بعد قریش مکہ کو تقریباً یقین ہو گیا کہ اسلامی طاقت کو ختم نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن ابوسفیان اور ایک دو دوسرے تاجروں نے جب اپنی ذلت و رسوائی کو سامنے دیکھا تو اپنے آپ سے انہوں نے عہد کیا کہ آئندہ سال وہ اس شکست کا بدلہ لیں گے۔

ادھر جب مدینے کو چھوڑ کر حملہ آور واپس چلے گئے تو پیغمبر اکرمؐ نے فوراً عہد شکنی کرنے والوں کی خبر لی۔ بنی قریظہ کے یہودیوں نے مسلمانوں سے وعابازی اور مشرکین کا ساتھ دینے کی سزا پالی۔ (۱) ایک سال بعد رسول اللہؐ پندرہ سو مسلمانوں کے ہمراہ عازم مکہ ہوئے۔ قریش نے حرم کے نزدیک آنحضرتؐ کا راستہ روک لیا اور آپؐ کو مکہ جانے سے منع کر دیا۔ دونوں طرف سے مذاکرات ہوئے اور آخر کار فریقین کے درمیان ایک معاہدہ طے پا گیا جس کی رو سے (طے پایا کہ) پیغمبر اکرمؐ اس سال مکہ نہیں جائیں گے۔ لیکن آئندہ سال مشرکین تین دن تک شہر مکہ کو رسول اکرمؐ اور ان اصحاب کے اختیار میں دے دیں گے تاکہ وہ خانہ کعبہ کی زیارت کر سکیں۔ پیغمبرؐ کے چند اصحاب جن کی نظریں فقط ظاہر امر پر تھیں، غصے میں آ گئے اور اس معاہدہ پر برہم ہوئے۔ کیونکہ اس معاہدہ کی اہمیت جسے قرآن نے فتح مبین کہا ہے، اس وقت ان کی نگاہوں سے پوشیدہ تھی۔ لیکن قریش

(۱) تھیلی از تاریخ اسلام حصہ اول ص ۷۳ و ۷۴ بعد

کے سیاسی ماہروں نے جان لیا کہ اس کے بعد عربوں کی سیادت اب مدینے کے پاس آجائے گی اور قریش اسلام اور پیغمبر کا بال بھی بیکا نہ کر سکیں گے۔ اسی لئے عمرو بن عاص اور خالد بن ولید فتح مکہ سے پہلے مدینہ آئے اور اسلام قبول کر لیا۔ چونکہ مشرکین مکہ نے جس مقام پر آنحضرتؐ کا راستہ روکا تھا اور پھر وہیں پر معاہدہ صلح طے پا گیا اس کا نام حدیبیہ تھا، اس لیے یہ معاہدہ صلح حدیبیہ کے نام سے مشہور ہوا۔

صلح حدیبیہ کے ایک سال کے بعد حضرت محمدؐ مسلمانوں کے ساتھ خانہ کعبہ کی زیارت کے لیے مکہ تشریف لے گئے۔ اس دوران شہر کے لوگوں نے مسلمانوں کے نزدیک پیغمبر اکرمؐ کی عظمت و احترام کو قریب سے دیکھا۔

اس معاہدہ کے بعد ہی مختلف قبائل کے سرداروں نے سمجھا کہ اب قریش کی خیالی قدرت و طاقت میں دم خم نہیں رہا۔ خصوصاً جب انہوں نے یہ سنا کہ یہودیوں کی مزاحمت کا آخری مرکز (خیبر) بھی چند روز کے محاصرے کے بعد مسلمانوں کے زیر تسلط آ گیا ہے اور ان کی زمینیں قانون اسلام کے مطابق مجاہدین جنگ کے درمیان تقسیم ہو چکی ہیں۔ ہجرت کا ساتواں سال اسلام کی جنگی اور دفاعی تاریخ میں تقدیر ساز تھا۔ غیر مسلموں کی نظروں میں فتح خیبر کا اثر خود فتح سے زیادہ اہمیت کا حامل تھا

خیبر کے نزدیک ایک سرسبز دیہات تھا۔ جس کا نام فدک تھا۔ اس آبادی کے لوگوں نے جب قلعہ خیبر کے انجام کو دیکھا تو پیغمبر اکرمؐ سے اس شرط پر صلح کر لی (۱) کہ اس دیہات کا نصف حصہ آنحضرتؐ کو دے دیا جائے گا اور وہ خود اپنی زمینوں پر باقی رہیں گے۔ چونکہ اس فتح میں مجاہدین اسلام شریک نہ تھے اس لئے قرآن (حشر: ۵۹) کی رو سے فدک خالصتاً پیغمبر اکرمؐ کی ملکیت قرار پایا۔ آنحضرتؐ اس زمین کی آمدن بنی ہاشم کے ضرورت مندوں کو دیا کرتے تھے۔ بعد میں آپؐ نے اسے اپنی بیٹی فاطمہ (س) کو ہبہ دیا۔

محدثین اور مفسرین کی ایک جماعت نے آیت: وَآتِ ذَٰلَ الْفُرْبٰی حَقَّہ (روم: ۳۸) کے ذیل میں لکھا ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو رسول اللہؐ نے فدک فاطمہ زہرا (س) کو ہبہ کر دیا۔ (۲)

حدیبیہ کے مقام پر نبی اکرمؐ اور قریش کے مابین طے پانے والے معاہدہ کی رو سے تمام عرب قبائل میں سے ہر قبیلے کو اختیار تھا کہ وہ چاہے تو مکہ والوں کا ساتھ دے اور چاہے تو مدینہ والوں کے ساتھ ہو جائے۔ قدرتی طور پر دونوں فریق اس بات کے پابند تھے کہ اپنے ہم بیان قبائل کی حمایت اور

(۱) یاقوت۔ معجم البلدان۔ ذیل فدک

(۲) در المنثور ج ۳ ص ۱۱۷۔ تفسیر تبیان ج ۸ ص ۲۲۸ نیز ملاحظہ فرمائیں مناقب ج ۱ ص ۲۷۶

مدد کریں۔ قبیلہ بکر قریش کے ساتھ ہو گیا اور قبیلہ خزاعہ پیغمبر اکرمؐ کا طرفدار بن گیا۔ جنگ موتہ کے بعد آنحضرتؐ جمادی الاول سے رجب تک مدینہ میں رہے۔ اس دوران میں یہ خبر پہنچی کہ قبیلہ بنی بکر نے قبیلہ خزاعہ پر حملہ کر دیا ہے اور قریش نے اپنے ہم پیمان قبیلے کی مدد کی ہے۔ اس امر سے صلح حدیبیہ کا معاہدہ عملی طور پر ٹوٹ گیا۔ ابوسفیان نے سمجھ لیا کہ قریش نے بنی بکر کی مدد کر کے بہت بڑی غلطی کا ارتکاب کیا ہے۔ وہ فوراً مدینے آیا تا کہ اس معاہدہ کی ایک لمبی مدت تک تجدید کرا سکے۔ مدینے پہنچنے کے بعد وہ سب سے پہلے اپنی بیٹی ام حبیبہ جو رسول خداؐ کی زوجہ تھیں کے گھر گیا اور مسند پیغمبرؐ پر بیٹھنے کا ارادہ کیا تو انہوں نے مسند لپیٹ دی۔ ابوسفیان نے کہا: تم نے ایسا کیوں کیا ہے؟ جواب ملا: تم کافر اور ناپاک ہو۔ لہذا پیغمبرؐ کی مسند پر تمہیں نہیں بیٹھنا چاہیے۔ ابوسفیان نے کہا: میری عدم موجودگی میں تم بد اخلاق ہو گئی ہو۔

اس کے بعد وہ حضرت ابو بکر اور حضرت عمر کے پاس گیا تا کہ وہ اس کی سفارش کریں لیکن ان سے بھی اسے منفی جواب ملا۔

آخر کار وہ حضرت علیؑ کے گھر گیا۔ فاطمہ (س) گھر میں موجود تھیں حسن علیہ السلام بچے تھے اور ان کے سامنے چل رہے تھے۔ پہلے اس نے حضرت علیؑ سے کہا کہ وہ آنحضرتؐ کی خدمت میں اس کے بارے میں بات کریں۔ علی علیہ السلام نے فرمایا: خدا نے فیصلہ کر لیا ہے۔ لہذا میں ان کی مرضی کے خلاف ان سے بات نہیں کر سکتا۔

اس کے بعد ابوسفیان نے جناب زہرا (س) کو مخاطب کر کے کہا:

محمد کی بیٹی! کیا اپنے اس بیٹے سے کہے گی کہ وہ لوگوں کے درمیان ثالث بنے تا کہ آخر زمانہ میں عربوں کا سردار بنے؟

جناب زہرا نے جواب دیا:

خدا کی قسم میرا بیٹا ابھی اس قابل نہیں ہوا ہے کہ وہ ایسے کاموں میں اور وہ بھی پیغمبرؐ کی مرضی کے خلاف مداخلت کرے۔ (۱)

اس بات کا مطلب یہ تھا کہ میرے باپ جو کچھ کہتے ہیں یا کرتے ہیں وہ سب حکم خدا ہے۔ وہ اپنی خواہشات اور ارادے سے کچھ انجام نہیں دیتے اور جب حکم خدا درمیان میں ہو تو باپ اور اولاد کی محبت کو آڑے نہیں آنا چاہیے۔ ابوسفیان مایوس اور نامراد مکہ واپس چلا گیا۔

☆☆☆☆☆

(۱) ابن ہشام ج ۳ ص ۱۳ نیز رجوع فرمائیے: طبری ج ۳ ص ۲۴ - ۱۶۲۳

وَقُلْ جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ (الاسراء: ۸۲)
اور کہہ دیجئے: حق آ گیا اور باطل مٹ گیا۔

فتح خیبر کو ایک سال بیت گیا۔ اب قریش اور مکہ والوں کو اسلام کی عظمت و بیت دکھانے کا وقت آ پہنچا تھا۔ قریش کے لوگ بڑے تجربہ کار اور بال بصیرت تھے۔ انہوں نے سوچا کہ اگر مزاحمت کے بغیر تسلیم ہو جائیں اور اسلام قبول کر لیں تو اسلام کا مستقبل ان کے ہاتھوں میں ہو گا۔ پیغمبر اکرمؐ ماہ رمضان سن آٹھ ہجری میں مجاہدین کے بڑے لشکر کے ساتھ جس کی تعداد مؤرخین نے دس ہزار لکھی ہے مکہ کی طرف روانہ ہوئے۔ لیکن اس خدشہ کے پیش نظر کہ جاسوس قریش تک یہ خبر پہنچا نہ دیں، آپؐ نے اپنا پروگرام خفیہ رکھا مگر الظہران کے مقام پر آنحضرتؐ کے چچا حضرت عباسؓ کو علم ہوا کہ یہ لشکر مکہ کی طرف جا رہا ہے۔ انہوں نے اپنے تئیں خیال کیا کہ پیغمبر اکرمؐ نے قریش سے اس قدر دکھ اور تکلیفیں اٹھائی ہیں، اب آپؐ انتقام لینے جا رہے ہیں اور اتنا بڑا لشکر حملہ کر کے شہر مکہ کی اینٹ سے اینٹ بجا دے گا۔

رات کے سنائے میں حضرت عباسؓ خیمے سے باہر نکلے تاکہ شہر کا کوئی آدمی مل جائے تو اس سے شہر کے حالات معلوم کیے جائیں۔ اتفاق سے ابو سفیان لشکر کے بارے میں اطلاع حاصل کرنے کے لئے شہر سے باہر آیا ہوا تھا۔ حضرت عباسؓ اس سے ملے اور حقیقت حال اسے بتائی۔ اسے اپنی پناہ میں رسول اللہؐ کی خدمت میں لے آئے۔ دوسرے دن لشکر اسلام مکہ میں داخل ہوا۔ آنحضرتؐ کی طرف سے یہ اعلان ہوا کہ جو بھی مسجد الحرام یا ابو سفیان کے گھر میں داخل ہو جائے گا امان میں ہے۔ بیس سال کی دشمنی و مخالفت اور جنگ و جدال کے بعد مکہ مغلوب ہو گیا۔

قریش کے سردار اس خوف سے لرز رہے تھے کہ ان سب اذیتوں، تکلیفوں اور مسلمانوں کی قتل و غارت کی سزا کیسے بھگتیں گے۔ لیکن سرپا رحمت پیغمبرؐ سے عفو و درگزر کے سوا کیا امید کی جاسکتی تھی؟

جاؤ! تم سب کو میں نے آزاد کیا
 اس دن کے بعد سے ان خود غرضوں کو طلقاء (آزاد شدہ) کے لقب سے یاد کیا جانے لگا۔
 مکہ کی فوجی طاقت اور مالی قوت جس نے سالوں تک عرب قبائل پر رعب جمائے رکھا، چکنا چور ہو
 گئی۔ وہ تمام رعب و دبدبہ اور ہیبت و جلال افسانہ بن کر رہ گیا۔
 اس عظیم الشان کامیابی کے بعد ہر قبیلے کے سردار نے یہ کوشش کی کہ وہ جلد اپنے آپ کو
 مدینہ پہنچائے اور حضرت محمدؐ سے اپنی تابعداری کا جلد اعلان کرے۔
 تاریخ اسلام میں نویں ہجری کو سنۃ الوفود (نمائندوں یا وفود کے آنے کا سال) کہا گیا ہے
 یعنی وہ سال جس میں قبائل کے نمائندے اسلام قبول کرنے کے لئے رسول اللہؐ کے پاس آئے۔ اس
 عرصہ میں عوام کی ضروریات کے مطابق سیاسی، معاشرتی اقتصادی اور جزا و سزا کے احکامات کی تشریح
 کی گئی۔ اب ایک مرتبہ پھر قریش کو مسلمانوں کی قدرت و توانائی کا مشاہدہ کرنا چاہیے۔ فریضہ حج کی
 ادائیگی بھی لوگوں کو بتادی جائے وہ آخری امتیازات جو اسلام سے پہلے قریش نے اپنے لئے مختص کئے
 ہوئے تھے، ختم ہو جائیں اور اس سے اہم تر یہ کہ اسلام کے مستقبل کا تعین ہو جائے۔

☆☆☆☆☆

بَلِّغْ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ (المائدہ: ۶۷)
 جو کچھ آپ کے پروردگار کی طرف سے آپ پر نازل کیا گیا
 ہے اسے پہنچا دیجئے۔

ہجرت کے دسویں سال رسول اکرمؐ مسلمانوں کے جمع غنیمت کے ساتھ مکہ کے لیے روانہ ہوئے۔ اس سفر میں مسلمانوں کی تعداد نوے ہزار سے لے کر ایک لاکھ چوبیس ہزار تک بیان کی گئی ہے۔ اس دوران میں آنحضرتؐ نے حج کے احکام اور آداب لوگوں کو سکھائے۔ جو کچھ بت پرست قربانی، طوائف اور حج کے حوالے سے مراسم انجام دیتے تھے، اسے منسوخ فرمایا۔ اس عبادت میں قریش نے جو خود ساختہ امتیازات اپنے لئے مخصوص کر لیے تھے، پیغمبر اکرمؐ نے انہیں ختم کر دیا۔ آپؐ نے مسلمانوں کو بتایا کہ بیت اللہ میں صرف خدا کی عبادت کرو اور خدا کے نزدیک سب لوگ برابر ہیں۔ کسی کو دوسرے پر کوئی برتری نہیں ہے۔ آپؐ نے اپنے مشہور خطبے میں ارشاد فرمایا:

اے لوگو! اللہ کے سوا کسی کی پرستش نہ کرو۔ تم سب آدم کی اولاد ہو اور آدم مٹی سے بنے ہیں پس خواہ قریش ہوں یا غیر قریش کسی کو بھی دوسرے پر فضیلت اور برتری حاصل نہیں ہے۔ لوگو! تمہارا خون اور مال ایک دوسرے پر ہمیشہ کے لیے حرام ہے۔ یہاں تک کہ تم اپنے پروردگار سے ملاقات کرو۔

واپسی کے موقع پر جحفہ (۱) کے مقام پر جہاں سے تمام قافلے ایک دوسرے سے جدا ہوتے تھے اپنی آخری ذمہ داری کو انجام دیا۔ ارشاد فرمایا:

لوگو! میں تمہارے درمیان دو چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں۔ اگر تم نے ان

(۱) مدینہ سے چار منزل کے فاصلے پر ایک گاؤں تھا۔ مصر اور شام کے لوگوں کے لیے یہ میقات گاہ تھا۔ یہاں کارواں ایک دوسرے سے جدا ہوتے اور ہر کوئی ایک ایک طرف چلا جاتا۔

دونوں کا دامن تھامے رکھا تو میرے بعد ہر گز گمراہ نہ ہو گئے۔ یہ دو چیزیں کتاب الہی یعنی قرآن اور میرے اہل بیت ہیں۔ لوگو! جس کا میں مولا ہوں اس کا علیؑ مولا ہے۔

اس قصہ کو سو سے زیادہ اصحاب رسولؐ نے نقل کیا ہے اور تابعین، محدثین اور مختلف اسلامی مکاتب کے بزرگ علماء میں سے سینکڑوں نے روایات اور کتب میں اسے بیان کیا ہے۔ ان کی اسناد کی تفصیل القدر کی پہلی جلد اور میر حامد حسین کی کتاب عبقات الانوار کے دوسرے منہج کے پہلے حصے نیز دیگر کتب میں موجود ہے۔ کتابوں کے سلسلے میں اس بارے میں بحث اپنے مقام پر آئے گی۔ رسول اللہؐ اس سفر سے واپس آتے ہیں۔ کچھ عرصے کے بعد اپنی بیٹی کو ناخوشگوار خبر سناتے ہیں:

میری بیٹی! پہلے جبرائیل علیہ السلام سال میں ایک مرتبہ مکمل قرآن مجھ پر پڑھتے تھے لیکن اس سال انہوں نے دو مرتبہ پڑھا ہے۔ جناب فاطمہ (س) نے پوچھا: بابا! اس کا کیا مطلب ہے؟ آپؐ نے فرمایا: میرا خیال ہے کہ یہ میری زندگی کا آخری سال ہے۔ جناب زہرا (س) کو جھٹکا لگا۔ وہ افسردہ ہو گئیں اور ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ آنحضرتؐ نے اپنی گفتگو کو اس جیلے پر ختم کیا: اور تم میری بیٹی! خاندان میں سے پہلی فرد ہو گی جو سب سے پہلے مجھ سے ملو گی۔ یہ سن کر حضرت زہرا (س) کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ حاضرین نے آنسوؤں اور پھر مسکراہٹ کا سبب پوچھا۔ لیکن فاطمہ زہرا (س) نے جواب کچھ عرصے بعد دیا۔ (۱)

باپ کی وفات کے بعد حضرت زہرا (س) پر زندگی کس قدر دشوار تھی کہ اپنی موت کی خبر سن کر مسکرا دیں۔ ہاں! فاطمہ زہرا (س) میں باپ کی جدائی برداشت کرنے کی سکت نہ تھی۔ گویا یہی ایام تھے جب آنحضرتؐ تک یہ الہی پیغام پہنچا کہ ”آپؐ بھی فوت ہو جائیں گے اور دوسرے لوگ بھی مر جائیں گے۔“ (۱۰۷: ۲۰)

لوگو! حضرت محمدؐ بھی دوسرے پیغمبروں کی طرح ہیں۔ جو ان سے پہلے آئے اور چلے گئے۔ آپؐ قبرستان بقیع جا کر مرحومین کے لیے خدا سے مغفرت طلب کرتے ہیں۔ یہ سب چیزیں اس بات کی علامت ہیں کہ کوئی افسوس ناک واقعہ ہونے والا ہے۔ آخر کار وہ عرصہ دن بھی آپؐ پہنچا جب یہ

(۱) طبقات ج ۸ ص ۷۱ طبری ج ۳ ص ۱۱۳۔ بحار از کشف الغمہ ص ۵۱

اندوہناک واقعہ رونما ہوا۔ پیغمبر خدا حضرت عائشہ کے گھر جاتے ہیں۔ آپؐ سخت تکلیف میں مبتلا ہوتے ہیں۔ شدت درد سے کراہ رہے ہوتے ہیں۔ آپؐ ایسے پر تلاطم سمندر کی مانند تھے، جس میں تینیس سال کے عرصے میں کبھی آرام نہ آیا۔ وہ کس طرح رک جائے؟ ابھی کئی سبق باقی ہیں جو لوگوں نے نہیں سیکھے۔ آپؐ نے ایک ہاتھ فضل بن عباس اور ایک ہاتھ علی ابن ابی طالب کی گردن میں ڈالا۔ اس حالت میں آپؐ پیروں کو گھسیٹتے (آہستہ آہستہ) مسجد میں پہنچے۔ آپؐ نے شہدائے احد کی مغفرت کے لئے دعا مانگی۔ اس کے بعد ارشاد فرمایا:

خدا نے اپنے بندوں میں سے ایک بندے کو دنیا اور آخرت میں سے ایک کو اپنانے کا اختیار دیا اور اس نے آخرت کو منتخب کیا۔ لشکر اسامہ جتنی جلدی ممکن ہو اپنے مشن پر جائے۔ اے لوگو! جس کا بھی مجھ پر حق ہے وہ اس وقت وصول کر لے۔ اگر میں نے کسی کی پشت پر تازیانہ لگایا ہے تو میری پشت حاضر ہے۔ وہ آئے اور اپنا بدلہ لے۔ میں نے کسی سے بغض و عداوت کو اپنا شیوہ نہیں بنایا۔ جان لو کہ تم میں سے سب سے زیادہ میرے نزدیک وہ ہے جو حق مجھ سے لے یا مجھے معاف کر دے تاکہ جب میں خدا سے ملاقات کروں تو آسودہ خاطر ہوں۔

میں سمجھتا ہوں کہ ایک دفعہ کہنا کافی نہیں ہے مجھے چند مرتبہ تکرار کرنا چاہیے۔ آپؐ منبر سے نیچے تشریف لاتے ہیں۔ نماز ظہر لوگوں کے ساتھ پڑھتے ہیں۔ دوبارہ منبر پر تشریف لے جاتے ہیں اور اسی تقاضے کو دہراتے ہیں۔ ایک شخص کھڑا ہو جاتا ہے۔ یا رسول اللہ! میں نے آپؐ سے تین درہم لینے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا: فضل! تین درہم اس شخص کو دے دیں۔

اے لوگو! اگر کسی کا حق کسی کے پاس ہو تو وہ اسے ادا کرے۔ یہ نہ کہے کہ یہ میری رسوائی ہے۔ وہاں (قیامت) کی ذلت و رسوائی سے یہاں (دنیا) کی ذلت آسان ہے۔ ایک شخص کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا: یا رسول اللہ! میں نے مال خدا میں تین درہم کی خیانت کی ہے۔ رسول اللہ! کیوں ایسا کیا؟ شخص: اس کی ضرورت تھی۔ رسول اللہ! فضل! اس سے تین درہم وصول کر لو۔ لوگو! جو بھی خیال کرتا ہے کہ دوسرا اس پر حق رکھتا ہے، کھڑے ہو کر بیان کرے۔ ایک شخص کھڑا ہوا اور کہنے لگا: یا رسول اللہ! میں جھوٹا، بد زبان اور زیادہ سونے والا ہوں۔ رسول خداؐ نے اس کے حق میں دعا فرمائی: پروردگار! راستگوئی اور ایمان اسے نصیب فرما اور اس کی نیند کو اس کے اختیار میں قرار دے۔ ایک اور شخص کھڑا ہو جاتا

ہے: اے اللہ کے رسول! میں منافق اور جھوٹا انسان ہوں۔ کوئی بھی برا کام ایسا نہیں ہے جو میں نے نہ کیا ہو۔ حضرت عمرؓ نے کہا: تم نے اپنے آپ کو ذلیل کر دیا۔ پیغمبر اکرمؐ عمر سے کہتے ہیں: اے خطاب کے بیٹے! دنیا کی ذلت آخرت کی ذلت و رسوائی سے زیادہ آسان ہے۔ (۱)

آپؐ مسجد سے واپس گھر تشریف لاتے ہیں اور بستر پر لیٹ جاتے ہیں۔ یہ کیسے ممکن ہے... جناب رسولؐ اور بستر خواب...؟ فاطمہ (س) نے ہمیشہ اپنے باپ کو راتوں کے وقت خدا کی بارگاہ میں کھڑے پایا ہے۔ یہ شب بیداری اور راز و نیاز اللہ نے آپؐ سے چاہا تھا فَمَرَّ اللَّيْلُ إِلَّا قَلِيلًا (المزمل: ۲) آپؐ کو آرام کم اور قیام زیادہ کرنا چاہیے۔ عام آدمیوں کے لئے رات آرام و سکون کا باعث ہے، لیکن آپؐ کے لیے نہیں۔ تقدیر ساز انسانوں کو ہمیشہ حالت قیام میں رہنا چاہیے۔ یہ دنیا ان کے آرام کی جگہ نہیں:

تِلْكَ الدَّارُ الْآخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِينَ لَا يُرِيدُونَ عُلُوًّا فِي الْأَرْضِ وَ
لَا فَسَادًا وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِينَ ۝ (القصص: ۸۳)

آخرت کا گھر ہم ان لوگوں کے لیے بنا دیتے ہیں جو زمین میں بالادستی اور فساد پھیلانا نہیں چاہتے اور (نیک) انجام تو تقویٰ والوں کے لیے ہے۔ حضرت محمدؐ جیسے انسانوں کو دن رات سمندر کی موجوں کی طرح متحرک رہنا چاہیے۔ آپؐ نے اس ریاضت کو اتنا بڑھا لیا کہ پھر کلام الہی ان کی دلجوئی اور ہمدردی کے لیے نازل ہوا مَا أُنْزِلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْآنَ لِتَشْقَى (م: ۲)

وہ انسان جو حرکت، سعی و کوشش اور جہد مسلسل کا نمونہ ہے وہ کیوں بستر پر جائے؟ سب پریشان ہیں۔ سب یہ چاہتے ہیں کہ ان کے محبوب پیغمبرؐ ہمیشہ کی طرح مسجد میں آئیں۔ ان کے ساتھ نماز پڑھیں، احکام اسلامی کی تعلیم دیں اور انہیں وعظ و نصیحت کریں۔ دس سال سے مدینہ اور اس کے لوگ رسول خداؐ سے مانوس ہیں۔ ان کی ذات بابرکت نے مدینہ سے دشمنی اور کینہ و عداوت کی جڑیں اکھاڑ دیں۔ انہی کے فیض سے وہ ایک دوسرے کے بھائی بھائی بن گئے۔ آپؐ ہی نے مدینہ والوں کو عربوں اور اس سے بڑھ کر قریش اور اہل مکہ کی نظروں میں محترم بنا دیا۔ آپؐ انھیں اور اسی طرح دست شفقت اس شہر کے بوڑھوں، جوانوں اور بچوں کے سر پر پھیریں۔

☆☆☆☆☆

(۱) طبری ج ۳ ص ۱۸۰-۱۸۰۳

وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ ۖ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ

(آل عمران: ۱۴۳)

اور محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تو بس رسول ہی ہیں۔ ان سے پہلے اور بھی رسول گزر چکے ہیں۔

اچانک حضرت عائشہ کے گھر سے نالہ و شیون بلند ہوا۔ رسول اللہ، خدا کے دیدار کے لئے چلے گئے۔ یہ خبر بجلی بن کر لوگوں پر گری کہ آنحضرتؐ رحلت فرما گئے۔ غم و اندوہ کے ان لمحات میں آہ و بکا اور گریہ و زاری کی آوازوں میں ایک خوفناک آواز کانوں سے ٹکرائی:

”نہیں! ہر گز نہیں! یہ جھوٹ ہے۔ یہ جھوٹ بول رہا ہے۔ محمدؐ نہیں مرے۔ وہ نہیں مر سکتے۔ جو ایسی بات کرے گا، وہ منافق ہے۔ آپؐ خدا سے ملاقات کرنے کے لئے گئے ہیں۔ آپؐ حضرت عیسیٰؑ مسیحؑ کی طرح ہیں جو آسمان پر چلے گئے تھے۔ آپؐ حضرت موسیٰؑ بن عمران کی طرح ہیں جنہوں نے چالیس راتیں کوہ طور پر گزاریں۔ خدا کی قسم جو بھی کہے گا کہ محمدؐ مر گئے ہیں، میں اس کے ہاتھ پاؤں کاٹ دوں گا۔“ (۱)

اے عمر کیا کہہ رہے ہو؟ یہ کس قسم کی باتیں کر رہے ہو؟ اے ابو بکر! کیا تم بھی یہ کہنا چاہتے ہو کہ محمدؐ فوت ہو گئے ہیں؟ ہاں! آپؐ رحلت فرما چکے ہیں۔ کیا تم کلام الہی کو بھول گئے ہو۔ جس میں آپؐ سے خطاب ہوا ہے: ”تم بھی فوت ہو جاؤ گے اور دوسرے بھی“ (الزمر: ۳۰) ایسا لگ رہا ہے جیسے پہلی مرتبہ یہ آیت سن رہا ہوں اب کیا کرنا چاہیے؟

معن بن عدی اور عوف بن ساعدہ کہہ رہے ہیں کہ سعد بن عبادہ اپنے قبیلہ والوں کے ساتھ

(۱) طبری ج ۳ ص ۱۸۱۵-۱۸۱۶ نیز رجوع فرمائیے ابن کثیر ج ۵ ص ۳۳۲

رسول اللہ کا خلیفہ منتخب کرنے کے لئے سقیفہ کی طرف گئے ہیں۔ ممکن ہے انصار سعد کی بیعت کر لیں اور ہم سے سبقت لے جائیں۔ معن کہتے ہیں فتنے کا آغاز ہو چکا ہے اور شاید خداوند اسے میرے وسیلے سے خاموش کر دے (۱) جتنی جلدی ہو ہمیں سقیفہ پہنچنا چاہیے۔

لوگو! جو بھی محمد پر ایمان رکھتا ہے، وہ جان لے کہ آپ رحلت فرما گئے ہیں اور دوبارہ زندہ نہیں ہوں گے! جو محمد کے خدا پر عقیدہ رکھتا ہے، وہ جان لے کہ وہ زندہ ہیں اور انہیں ہر گز موت نہیں آئے گی۔

سقیفہ بنی ساعدہ کی طرف

سقیفہ بنی ساعدہ میں کیا ہوا؟ یہ ایک داستان ہے جس کا ذکر کتاب ”زندگانی علی“ میں آئے گا۔ اس واقعہ کو آپ نے بہت دفعہ پڑھا ہو گا یا سنا ہو گا۔ یہ عجیب کہانی ہے۔ اس چھت کے نیچے جمع ہونے والوں نے کیا کہا اور کیا سنا۔ اسے تاریخ سے واقف تمام لوگ جانتے ہیں۔ یہ ایسا واقعہ تھا جس کے اثرات چودہ صدیاں گزرنے کے بعد بھی عالم اسلام پر موجود ہیں۔ انہوں نے ایسا کیوں کیا؟ آپ نے بارہا سنا یا مطالعہ کیا ہو گا کہ مسلمانوں میں افتراق کے خوف کے پیش نظر ایسا کیا گیا۔ اس واقعہ کے سر کردہ افراد کا کہنا تھا کہ فتنے کی آگ بھڑک اٹھی ہے اور ممکن ہے خدا ان کے توسط سے اسے ٹھنڈا کر دے۔ لیکن اگر وہ چند گھڑیاں یا ایک دن صبر کر لیتے اور حضرت عائشہ کے گھر رونے والوں کو بھی اجتماع میں بلا لیتے تو کیا ہو جاتا؟ کیا فتنہ اس قدر شدید تھا کہ ایک دن صبر نہیں کیا جاسکتا تھا؟ واللہ اعلم۔ شاید تاریخ بھی اس بات کو جانتی ہو۔

☆☆☆☆☆

(۱) مقدمہ الفریذ ج ۵ ص ۱۰

وَإِنَّهُ لَيَعْلَمُ أَنَّ مَحَلُّ مِنْهَا مَحَلُّ الْقُطْبِ مِنَ الرَّحَى (حضرت علی)
اور وہ ضرور جانتا ہے کہ میرا مقام اس میں چکی کی کیل کی
طرح ہے۔

حضرت عائشہ کا گھر ماتم کدہ بنا ہوا ہے۔ علی فاطمہ (س) عباسؓ زبیرؓ حسنؓ حسینؓ اور ام کلثوم
آنسو بہا رہے ہیں۔ علی علیہ السلام اسماء بنت عمیسؓ کی مدد سے پیغمبر اکرمؐ کو غسل دینے میں مصروف
ہیں۔ اللہ جانے اس غمناک اور پردرد لمحات میں ان چند افراد پر کیا گزری؟ پیغمبر اکرمؐ کو غسل دینے
کا مرحلہ ابھی تمام ہوا تھا یا نہیں کہ ”اللہ اکبر“ کی آواز آتی ہے۔

علی علیہ السلام نے حضرت عباسؓ سے پوچھا: چچا عباس اس تکبیر کا کیا مطلب ہے؟ اس کا
مطلب یہ ہے کہ جو نہیں ہونا چاہیے تھا وہ ہو چکا ہے۔^(۱)

ابھی تھوڑی دیر نہیں گزری تھی کہ حضرت عائشہ کے گھر کے باہر سے آوازیں آنا شروع ہو
گئیں۔ ہر لمحہ یہ آوازیں نزدیک ہوتی گئیں: باہر آؤ، باہر آؤ! ورنہ سب کو آگ لگا دیں گے۔
دختر نبی حجرے کے دروازے پر آتی ہیں، وہاں پر ان کا حضرت عمرؓ سے سامنا ہوتا ہے۔ جن
کے ہاتھ میں آگ ہوتی ہے۔

اے عمر کیا ہوا ہے؟

علیؓ عباسؓ اور بنی ہاشم مسجد میں آئیں اور خلیفہ رسول کی بیعت کریں۔
کونسا خلیفہ؟ امام مسلمین تو اس وقت عائشہ کے حجرے میں رسول خداؐ کے جسد اطہر کے سر ہانے
بیٹھے ہیں۔

اس وقت کے بعد سے مسلمانوں کے امام ابو بکر ہیں۔ لوگوں نے سقیفہ بنی ساعدہ میں ان کی

(۱) انساب الاشراف ص ۵۸۲

بیعت کر لی ہے۔ لہذا اب بنی ہاشم کو بھی ان کی بیعت کرنی چاہیے۔
اگر وہ نہ آئیں تو؟

پھر اس گھر میں موجود تمام افراد سمیت اسے جلا دیں گے۔ مگر یہ کہ جو لوگوں نے قبول کیا تم بھی وہی قبول کر لو۔
عمر! کیا تم گھر کو آگ لگانا چاہتے ہو؟
ہاں۔ (۱)

رسول خدا کی بیٹی اور اسلام میں پہلے ہجرت کرنے والے بزرگ صحابی کے درمیان یہ مکالمہ اسی صورت میں ہوا یا نہیں۔ اب اللہ بہتر جانتا ہے۔ اس وقت جب میں یہ واقعہ لکھنے میں مشغول ہوں تو ابن عبد ربہ اندلسی کی کتاب عقد الفرید اور بلاذری کی انساب الاشراف میرے سامنے موجود ہیں۔ مذکورہ واقعہ میں نے ان دو کتابوں سے نقل کیا ہے۔ یہ بات انتہائی بعید بلکہ ناممکن نظر آتی ہے کہ اس واقعہ کو مذکورہ صورت میں شیعوں یا ان کے حامی سیاسی گروہوں نے گھڑا ہو۔ کیونکہ اسلام کی ابتدائی صدیوں میں شیعہ یا ان کے طرفدار کمزور، سیاسی طاقت سے محروم اور اقلیت میں تھے۔ اسی طرح ہم دیکھتے ہیں کہ یہی واقعہ مغرب کی اسلامی اسناد و کتب میں بیان ہوا ہے۔ اس لحاظ سے اس کے جعلی ہونے کا احتمال نہیں ہے۔ دوسری کتابوں میں بھی اسی قسم کی باتیں نرم یا سخت انداز میں موجود ہیں طبری لکھتے ہیں:

انصار نے کہا ہم علیؑ کے علاوہ کسی کی بیعت نہیں کریں گے۔ عمر ابن خطاب علیؑ کے گھر گئے، طلحہ اور زبیر اور مہاجرین میں سے کچھ افراد بھی وہاں پر تھے۔ عمر نے کہا: خدا کی قسم! اگر ابو بکر کی بیعت کرنے کے لئے باہر نہ آئے تو اس گھر کو جلا کے راکھ کر دوں گا۔ زبیر تلوار کھینچ کر باہر نکلے تو ان کا پاؤں پھسلا اور گر پڑے۔ لوگوں نے ان پر دھاوا بول دیا۔ انہیں پکڑ لیا۔ (۲)

جی ہاں اس دن اصحاب رسولؐ کے درمیان اس قسم کی باتیں کیوں ہوئیں؟ یہی افراد تھے جنہوں نے انتہائی مشکل اور کشن حالات میں دین خدا کی نصرت کی تھی۔ کئی بار اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر دشمنوں سے نبرد آزما ہوئے تھے۔ آخر کیا ہوا کہ اتنی جلدی ایک دوسرے کی جانوں کے درپے ہو گئے؟

(۱) عقد الفرید ج ۵ ص ۱۲۔ انساب الاشراف ص ۵۸۶

(۲) طبری ج ۲ ص ۱۸۱۸

علی علیہ السلام اور خاندان رسالت نے کیا گناہ کیا تھا کہ انہیں آگ میں جلایا جاتا۔ فرض کریں کہ واقعہ غدیر صحیح نہیں ہے۔ فرض کریں کہ رسول اللہ نے اپنا جانشین کسی کو مقرر نہیں فرمایا تھا۔ فرض کریں کہ انتخاب ستیفہ پر کسی قسم کا اعتراض قابل قبول نہیں ہے۔ لیکن بیعت سے انکار کی اسلام میں پہلے مثال موجود تھی۔ خلیفہ کی بیعت نہ کرنا گناہ کبیرہ نہ تھا۔ یہ ایک فقہی حکم تھا اور فقہی حکم کے لئے دلیل کی ضرورت ہوتی ہے۔ ان کے حکم کی دلیل کیا تھی؟ کیا انہوں نے اسامہ سے منقول اس حدیث کو اجتہاد کا منبع قرار دیا:

لَيَسْتَفِيزَنَّ رِجَالٌ عَنْ تَرْكِ الْجَمَاعَةِ أَوْ لَا حَرْفٌ يُؤْتِيهِمْ (۱)

یا لوگ ترک جماعت سے باز آئیں یا ان کے گھروں کو جلا دیا جائے

بالفرض یہ حدیث متن اور سند کے لحاظ سے درست ہے۔ لیکن کیا یہ حدیث علی علیہ السلام اور ان کے گھروں پر تطبیق کرتی ہے؟ اس حدیث کو محدثین نے باب صلوة میں ذکر کیا ہے۔

پس اس حدیث سے مراد نماز جماعت کا ترک کرنا ہے۔ ان سب باتوں کے علاوہ آخر خلیفہ بنانے میں اتنی جلدی کیا تھی؟ اور اس سے زیادہ حیران کن وہ بحث اور جھگڑا ہے جو مہاجرین اور انصار کے درمیان ہوا کیوں؟ کیا انصار غدیر کا واقعہ بھول گئے یا اس سے انکاری تھے؟ کیا یہ کہا جاسکتا ہے کہ غم غدیر کے میدان (جحفہ) میں ایک لاکھ یا اس سے بیشتر جمع تھے۔ ان سب نے حدیث غدیر سنی۔ ان میں مدینے کا کوئی آدمی نہیں تھا اور علی کی خلافت کا اعلان اوس اور خذرج کے قبائل تک نہیں پہنچا تھا؟ واقعہ غدیر (جحفہ) کو گزرے تین ماہ کا عرصہ بھی نہیں ہوا تھا کہ قبیلہ خذرج کا سردار، جس نے اپنے قبیلہ والوں کے ساتھ رسول خدا اور اسلام کی خلوص سے مدد کی تھی، خلافت کا دعویٰ بن جاتا ہے۔ آخر کیوں؟ اور وہ کیوں قریش سے مصالحت کی خاطر کہنے لگے: ایک امیر آپ سے اور ایک امیر ہم سے؟ کیا انہوں نے مسلمانوں کی امارت کو قبیلے کی سرداری سمجھ لیا تھا؟

امت اور دین کے غم خوار ان مسلمانوں نے سب سے پہلے اپنے پیغمبر کے کفن و دفن کا بندوبست کیوں نہ کیا؟ جیسا کہ ہم نے لکھا ہے، انہیں ڈر تھا کہ کہیں فتنہ کھڑا نہ ہو جائے۔ کیونکہ ابوسفیان موقع کی تلاش میں تھا۔ لیکن بنی ہاشم میں سے کسی کو وہاں کیوں نہیں بلایا گیا؟ کیا ابوسفیان اور اس کی سازش اسلام کے لئے اس قدر خطرناک تھی کہ ذرا بھی دیر نہیں کی جاسکتی تھی؟ ابوسفیان کی ان دنوں کیا پوزیشن تھی؟ ایک چھوٹے سے دیہات نجران کا حکمران تھا۔ اگر اوس، خذرج، بنی ہاشم، بنی تمیم، بنی عدی، کے مہاجرین اور دوسرے مسلمان اکٹھے ہو جاتے تو بنی امیہ کا چھوٹا سا قبیلہ کیا کر سکتا تھا؟ کچھ بھی نہیں۔۔

(۱) کنز العمال۔ صلوة حدیث ۲۱۷۲

کیا اس بات کا خطرہ تھا کہ اگر مسلمانوں کے امیر اور خلیفہ کا انتخاب جلدی نہ کیا گیا تو کوئی بہت بڑا واقعہ پیش آ جاتا؟

ان چودہ صدیوں میں کئی مرتبہ یہ سوالات اٹھائے گئے ہیں اور ان کا جواب بھی دیا گیا ہے۔ جیسا کہ دوسرے مقامات پر لکھا ہے کہ یہ جوابات زیادہ تر میدان مناظرہ میں حریف کو زیر کرنے کے لئے ہیں نہ کہ حقیقت کو واضح کرنے کے لئے۔

یوں لگتا ہے کہ پیغمبر اسلام کی رحلت کے بعد وہ لوگ زیادہ تر اس فکر میں تھے کہ جتنا جلدی ہو سکے حاکم کا انتخاب عمل میں لایا جائے اور اس بارے میں انہیں کم خیال تھا کہ حکومت چلائی کیسے جائے۔ (۱) بالفاظ دیگر اسلام جن دو بنیادوں (دین و حکومت) پر استوار ہے ان کا زیادہ دار و مدار حکومت پر تھا۔ گویا انہوں نے اپنے تئیں یہ سمجھ لیا تھا کہ جب مرکزی حکومت قائم ہو جائے گی اور حاکم برسر اقتدار آجائے گا تو دوسرے کام خود بخود ٹھیک ہو جائیں گے۔ یہ بات درست ہے اور ہم نے دیکھا بھی کہ مدینہ نے اپنی وحدت برقرار رکھتے ہوئے مدتوں کے مقابلے میں قیام کیا اور انہیں ٹھکانے لگایا۔ اندرونی خلفشار ختم کرنے کے بعد مدینے کی حکومت کشور کشائی کے لئے تیار ہو گئی۔ لیکن اصول حکومت اور حکمران کے انتخاب کو دین سے جدا کیا جاسکتا ہے؟ خصوصاً جب شارع اسلام نے خود اس اصول اور بنیاد کو قائم کیا ہو؟ بہر حال اس واقعہ کو چودہ صدیاں گزر چکی ہیں۔ میں نہیں جانتا کہ نبی کریم کی رحلت کے بعد جنہوں نے یہ اقدام کیا اور آئندہ کے لئے بنیاد رکھی وہ دین کے ہمدرد تھے یا انہیں حکومت کے چھن جانے کا خوف لاحق تھا۔

شائد انہیں دونوں چیزوں کا خیال ہو اور انہوں نے سوچا ہو کہ اگر ایسی قدر اور شخصیت جو عالم بھی ہو، متقی و پرہیزگار بھی ہو، خاندان رسول میں سے ہو اور موقع ملنے پر بہت سے افراد کو اپنا حامی بھی بنا سکتی ہو، اس اجتماع میں آجائے تو ممکن ہے حاکم کی طاقت و قدرت کو متزلزل کر دے۔ تاریخ طبری میں مذکور یہ چھوٹا سا اشارہ اسی حقیقت کی نشاندہی کر رہا ہے:

رسول اللہ کی بیٹی کی رحلت کے بعد حضرت علیؑ نے دیکھا کہ لوگوں نے

ان سے منہ پھیر لیا ہے۔ (۲)

ہاں ایسا ہی ہوا کہ علیؑ کے بیٹے نے کہا:

الناس عیب الدنیا... فاذا مَحَضُوا بِالْبَلَاءِ قُلُوبَ الدِّينَانِ

لوگ دنیا کے بندے ہیں.... جب آزمائے جاتے ہیں تو دینداروں کی

(۱) تفسیر از تاریخ اسلام حصہ اول ص ۹۱

(۲) طبری ج ۴ ص ۱۸۲۵

تعداد کم ہوتی ہے۔

میں نے یہ بات دوسری جگہ پر لکھی ہے کہ میں کسی مسلمان کے جذبات کو ٹھیس نہیں پہنچانا چاہتا اور میں اپنے آپ کو ایسے کام میں ملوث نہیں کرنا چاہتا جس میں بعض مسلمانوں نے دین یا دنیا کی خاطر اپنے آپ کو ملوث کیا ہے۔ (۱) وہ اپنے پروردگار کے پاس جا چکے ہیں۔ وہ اپنے اعمال کے جوابدہ ہیں۔ اگر انہوں نے یہ سب دین کی خاطر کیا تھا تو اللہ تعالیٰ بہترین فیصلہ کرنے والا ہے۔ البتہ اس مقام پر شہرستانی کی بات بڑی معنی خیز ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

اسلام میں کسی زمانے میں بھی دین کی بنیاد پر اتنی تلوار نہیں اٹھائی گئی جتنی حکومت و قیادت کے مسئلے پر اٹھائی گئی ہے۔ (۲)

اس کے باوجود میں نے ایک اور کتاب میں لکھا ہے کہ اگر مسلمانوں کی بعد والی نسلیں مہاجرین اور انصار کے خلوص اور ایمان کے جذبوں سے سرشار ہوتیں تو آج مسلمانوں کی تاریخ کچھ اور ہوتی۔



(۱) پس از ہجرت سال ۳۰ ھ ص ۳۰

(۲) السلسلہ داخل ج ۱ ص ۱۶۔

بَلَى كَانَتْ فِي أَيِّدِنَا فَدَكٌ مِّن كُلِّ مَا أَظْلَمَتُهُ السَّمَاءُ (۱)
 ہاں ان سب چیزوں میں سے جن پر آسمان نے اپنا سایہ ڈالا،
 صرف فدک ہمارے ہاتھ میں تھا۔

اس واقعہ کو ابھی چند روز نہ گزرے تھے کہ ایک اور سانحہ رونما ہوا۔ فدک کی سرزمین کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہے۔ لہذا اسے رسولؐ کی بیٹی کے پاس نہیں رہنا چاہیے۔ خلیفہ مسلمین نے اپنی رائے اور نظر کے مطابق فیصلہ کیا۔ جو کچھ (فنی) پیغمبر اکرمؐ کے اختیار میں تھا وہ مسلمانوں کے بیت المال کا حصہ ہے اور اب وہ خلیفہ کے کنٹرول میں ہونا چاہیے۔ اس لئے حاکم کے حکم پر فدک کے علاقے سے فاطمہ زہرا (س) کے کارندوں کو بے دخل کر دیا گیا۔

جیسا کہ ذکر کیا جا چکا ہے۔ چونکہ فدک فوجی طاقت سے حاصل نہیں ہوا تھا۔ وہاں کے لوگوں نے رسول اکرمؐ سے صلح کر لی تھی۔ اس لیے یہ علاقہ آپؐ سے ہی متعلق تھا۔ (یعنی آپؐ ہی سے مختص تھا) پہلے پہل آپؐ اس کی آمدن بنی ہاشم کے ضرورت مندوں پر خرچ کرتے تھے۔ مثلاً لڑکیوں اور لڑکوں کی شادی بیاہ اور دوسرے امور میں صرف کرتے تھے۔ اس کے بعد آپؐ نے یہ قطعہ اپنی بیٹی فاطمہ سلام اللہ علیہا کو بخش دیا (۲) اب خلیفہ نے یہ فیصلہ دیا کہ پیغمبر اکرمؐ مسلمانوں کے حکمران کی حیثیت سے اس میں تصرف کرتے تھے نہ کہ مالک کی حیثیت سے۔ لہذا اب بھی اسے حاکم کے کنٹرول میں ہونا چاہیے اور یہ اختیار حاکم کو حاصل ہے نہ کہ رسول اللہ کی بیٹی کو۔ حضرت زہرا سلام اللہ علیہا مجبوراً حضرت ابو بکر کے دربار میں گئیں۔ ان دونوں کے درمیان یہ مکالمہ ہوا:

فاطمہ (س): ابو بکر! جب تم مرو گے تو تمہاری میراث کس کو ملے گی؟

ابو بکر: میرے بیوی بچوں کو۔

(۱) عثمان بن حنیف کے نام امیر المؤمنین علی علیہ السلام کے خط سے اقتباس

(۲) تفسیر در المنثور ج ۳ ص ۱۱۷۔ تفسیر ابن کثیر ج ۳ ص ۳۶ و ص ۹۷

فاطمہ (س): لیکن ہماری بجائے تم رسول اللہ کے وارث کیسے بن گئے ہو؟
ابو بکر: رسول کی بیٹی! تمہارے باپ نے درہم و دینار اور سونا چاندی نہیں چھوڑا کہ تم اس کی وارث بنو۔

فاطمہ (س): لیکن خیبر اور فدک کا ہمارا حصہ کہاں گیا؟
ابو بکر: میں نے تمہارے باپ سے سنا ہے: میں جب تک زندہ ہوں، اس زمین سے فائدہ اٹھاؤں گا۔ جب فوت ہو جاؤں تو یہ تمام مسلمانوں کا مال ہے۔^(۱)
فاطمہ (س): لیکن رسول اللہ نے اپنی زندگی میں اس زرعی زمین کو مجھے بخش دیا تھا۔
ابو بکر: کیا تمہارے پاس کوئی گواہ ہے؟
فاطمہ (س): ہاں علیؑ اور ام ایمنؓ اس کے گواہ ہیں۔
ابو بکر: نبی کی بیٹی! تم جانتی ہو کہ ام ایمنؓ عورت ہے، اس کی گواہی مکمل نہیں ہے۔ ایک اور عورت کو ساتھ گواہ ہونا چاہیے یا مرد گواہ ہونا چاہیے۔

اس طرح فدک حکومت کے قبضے میں آ گیا۔
کیا یہ معاملہ اسی طرح ختم ہو گیا؟ کیا پیغمبر اکرمؐ نے فدک اپنی بیٹی کو نہیں بخشا تھا؟ کیا بنی امیہ اور بنی عباس کے دور میں راویوں اور دیگر گروہوں سے جہاں تک بن پڑا اس واقعہ کو بڑھایا چڑھایا نہیں ہے۔ حدیثوں کو گھڑا اور حدیثوں کی عبارتوں کو کم و زیادہ نہیں کیا۔ ہم نے کئی بار تکرار کی ہے کہ ان ادوار میں حدیث سازی اور حدیث کی عبارتوں کو تبدیل کرنا ایک معمول بن گیا تھا۔

ناقدین حدیث نے جملی حدیثوں کی تعداد چار لاکھ سے بھی زیادہ بیان کی ہے۔^(۲) اس مقام پر حقیقت کی پہچان کے لئے خارجی قرائن و علامات سے مدد لینے کی ضرورت ہے۔
ہم جانتے ہیں کہ اس واقعے کے بعد دو سال کے دوران فدک مختلف ہاتھوں میں رہا ہے۔ مختلف افراد کی تحویل میں دیا جاتا رہا ہے۔ حضرت عثمان نے اسے مروان بن حکم کی ملکیت میں دے دیا^(۳) اور ایک قول کے مطابق معاویہ نے مروان کو دیا۔^(۴) اموی حکومت کے اختتام تک فدک اس

(۱) فتوح البلدان ج ۱ ص ۳۶۔ انساب الاشراف ص ۵۱۹۔

(۲) القدر ج ۵ ص ۲۹۰۔

(۳) المعارف ص ۸۴۔ تاریخ ابوالفداء ج ۱ ص ۱۶۸۔ سنن بیہقی ج ۶ ص ۳۰۱۔ العقد الفرید ج ۵ ص ۳۳۔ شرح نفع البلاغہ ج ۱ ص ۱۹۸ نقل از

القدر ج ۸ ص ۲۳۶۔ ۲۳۸۔

(۴) فتوح البلدان ج ۱ ص ۳۷۔

طرح مردانیوں کے قبضے میں رہا۔

جب عمر بن عبدالعزیز خلیفہ بنے تو انہوں نے کہا:

فدک پیغمبرؐ کی ملکیت تھا۔ آپؐ اپنی ضرورت کے مطابق اس میں سے لے لیتے، باقی بنی ہاشم کے ضرورت مندوں کو بخش دیتے تھے یا ان کے شادی بیاہ کے معاملات میں خرچ کرتے تھے۔ رسول اللہ کی رحلت کے بعد جناب فاطمہ (س) نے ابو بکر سے کہا کہ فدک ہمیں لوٹا دے لیکن وہ نہ مانے۔ عمر نے بھی ابو بکر کا طرز عمل اختیار کیا۔ گواہ رہنا میں فدک کی پیداوار کو انہی مصارف میں خرچ کروں گا جس میں وہ پہلے خرچ ہوتی تھی۔ (۱)

مامون کا فدک کو فرزند ان فاطمہ کے حوالے کر دینا

سنہ ۲۱۰ ہجری میں خلیفہ مامون نے فدک اولاد زہرا (س) کو واپس کر دیا۔ اس کی طرف سے مدینے کے گورنر قسطنطین بن جعفر کو جو حکمنامہ جاری کیا گیا اس کی عبارت یوں ہے:

امیر المومنین دینداری، منصب خلافت اور رسول خدا سے رشتہ داری کی بناء پر سنت نبویؐ کی پیروی، رسولؐ کے احکام کے اجراء کرنے، مستحقوں غریبوں اور مسکینوں کو صدقات اور عطیات دینے کے باقی مسلمانوں سے زیادہ سزاوار ہیں۔ اللہ امیر المومنین کو اس کی توفیق عنایت فرمائے اور اسے غلطیوں سے دور رکھے اور اسے ایسا کام کرنے کی ہمت دے جو اس کی رضا اور قربت کا باعث ہے۔

رسول اللہؐ نے فدک اپنی بیٹی فاطمہ زہرا (س) کو بخش دیا تھا۔ ہبہ کر دینے کا مسئلہ خود رسول اکرمؐ کے زمانے میں واضح اور روشن امر تھا۔ خاندان رسولؐ میں اس بارے میں کوئی اختلاف نہ تھا۔ فاطمہ (س) جب تک زندہ رہیں اپنا حق مانگتیں رہیں۔ اب امیر المومنین نے یہ ضروری سمجھا ہے کہ فدک فاطمہ (س) کے وارثوں کو لوٹا دیا جائے اور ان کی تحویل میں دے دیا جائے اور حق عدالت کو قائم کریں۔ رسول اللہؐ کے حکم کو نافذ اور صدقہ کو جاری کر کے وہ پیغمبرؐ کے قرب کے خواہاں ہیں۔ امیر المومنین نے حکم دیا ہے کہ اس حکم کو عدالتی فیصلوں میں درج کریں اور دوسرے شہروں میں حکومت کے نمائندوں تک یہ بات پہنچا دیں۔ رسول اللہؐ کی

(۱) فتوح البلدان ج ۱ ص ۳۶

وفات کے بعد ایام حج کے دوران یہ رسم بن گئی تھی کہ ان ایام میں مسلمانوں میں اعلان کیا جاتا کہ جو کوئی کسی پر دعویٰ کرے اور گواہ بھی پیش کرے اس کی بات کو سنو اور اسے مان لو۔ فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا اس بات کی زیادہ حقدار ہیں کہ رسول خداؐ نے انہیں جو کچھ دیا، اس دعویٰ میں ان کی تصدیق کی جائے۔ امیر المومنین اپنے غلام مبارک طبری کو لکھتے ہیں فدک کو، جو کچھ ہے، ان تمام حقوق کے ساتھ جو اس سے منسوب ہیں، اس میں کام کرنے والے تمام غلاموں اور جس قدر غلہ اس میں پیدا ہوتا ہے اور دوسری متعلقہ چیزوں کے ساتھ رسول خداؐ کی بیٹی فاطمہ (س) کے ورثاء کی تحویل میں دے دیا جائے۔

امیر المومنین نے فدک کی تولیت (سرپرستی اور تمام امور کی ذمہ داری) محمد بن یحییٰ بن حسین بن زید بن علی بن حسین بن علی بن ابی طالب کو سونپی ہے۔ تاکہ وہ اس آمدن کو اس کے مستحقوں تک پہنچائیں۔ اے قثم بن جعفر! امیر المومنین کے اس حکم اور خدا کی اطاعت سے جو اس نے اس پر واجب کی ہے اور اپنے رسولؐ کے تقرب کے حصول کی جو توفیق اسے نصیب ہوئی ہے، تم بھی آگاہ ہو جاؤ اور دوسروں کو بھی آگاہ کر دو۔ تم مبارک طبری کی جگہ پر محمد بن یحییٰ اور محمد بن عبد اللہ کو منصوب کر دو اور فدک کی پیداوار بڑھانے اور اسے مزید آباد کرنے کے لئے تم ان کی مدد کرو۔ انشاء اللہ چار شنبہ دوم ذوالقعدہ سنہ ۲۱۰ھ۔ (۱)

دوسری اور تیسری صدی ہجری کے اداس کے شیعہ شاعر دعل خزاہی نے اس بارے میں کہا

ہے:

أَصْبَحَ وَجْهُ الزَّمَانِ قَدْ ضَجَّكَ بِرِدِّ مَأْمُونٍ هَاشِمٍ فَلَدَّكَ
زَمَانٌ كَإِذَا جَبَّ مَأْمُونٌ نَدَّكَ هَاشِمٌ كَوَدَّكَ

مأمون کے حکمرانے میں ایک جملہ نہایت اہمیت کا حامل ہے:

فاطمہ کو فدک بخشنے کا مسئلہ پیغمبر اکرمؐ کے زمانے میں نہایت واضح تھا اور

(۱) بلاذری فتوح البلدان ج ۱ ص ۳۷-۳۸

(۲) دیوان دعل خزاہی ص ۲۲

اس کے بارے میں خاندان رسالت میں کوئی اختلاف نہیں تھا۔

یہ فرمان تیسری صدی ہجری کے آغاز میں اور طبری کی وفات سے ایک سال اور بلاذری کی وفات سے ایک سو تیس سال پہلے جاری کیا گیا اور لکھا گیا ہے: یہ خلیفہ کا فرمان ہے اپنے ملازم کی طرف۔ یعنی یہ حکومتی سند اور باقاعدہ حکم تھا۔ اس حکم کے مذکورہ جملے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبر اکرمؐ کی وفات کے بعد ابتدائی ایام میں جو کچھ رونما ہوا، وہ سیاسی مصلحت کے پیش نظر تھا اور اب سیاسی مصلحت نے سابقہ روش کو تبدیل کر دیا۔ اگر مامون کا مقصد خاندان علیؑ کی دلجوئی اور شیعوں کی ہمدردیاں حاصل کرنا تھا تو عمر بن عبد العزیز کی روش اپناتا اور صرف فدک کی پیداوار اور آمدن اولاد فاطمہ (س) پر خرچ کرتا۔ اسے سابقہ خلفاء کے کردار پر خط بطلان کھینچنے کی ضرورت نہیں تھی۔

اس کے علاوہ اگر فدک ایک صدقہ تھا جسے رسول اللہؐ مسلمانوں کے امیر ہونے کی وجہ سے اپنے مصرف میں لاتے تھے تو پھر رسول خداؐ کی رحلت کے صرف پچیس سال بعد خلیفہ اسے کیوں اپنے رشتہ داروں کو بخش دیتا ہے۔ بالفرض عمر بن عبد العزیز کی تشخیص صحیح ہو (جو کچھ بلاذری نے لکھا ہے وہ درست ہو) کہ نبی کی بیٹی (س) کی اس زرعی زمین پر ملکیت مسلم نہ ہو اور یہ ایک صدقہ ہو جس کی آمدن جناب فاطمہ (س) اور ان کے بعد ان کی اولاد کے لئے ہونی چاہیے تھی، جیسا کہ اس بارے میں صادر ہونے والے اپنے فرمان میں خود اس نے لکھا ہے۔

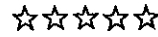
جیسا کہ ہم نے اس کتاب کے آغاز میں ذکر کیا ہے کہ دوران تاریخ اس مسئلے پر جتنی بحث کی گئی ہے یا کلامی، تاریخی اور سیرت کی کتب میں فصول اور ابواب اس سے مختص کیے گئے ہیں یہ سب اس وجہ سے نہیں تھا کہ یہ گاؤں جناب فاطمہ (س) اور ان کی اولاد کے ہاتھوں یا حکومت وقت کے قبضے میں رہے اور اگر فاطمہ (س) خلیفہ وقت کے دربار میں گئیں اور اس سے اپنا حق مانگا تو اس کا سبب یہ نہ تھا کہ وہ اپنے اور اپنے بچوں کا پیٹ پالنے کی خاطر یہ سب کچھ کر رہی تھیں بلکہ ان کے پیش نظر یہ تھا کہ نص کے مقابلے میں یہ پہلا اور آخری اجتہاد نہیں ہے۔ کیونکہ کل ایک اور اجتہاد کیا جائے گا اور اسی طرح یہ سلسلہ چل نکلے گا۔ اس وقت اس کی ضمانت کون دے گا کہ ایک اور خلیفہ آکر اپنے اجتہاد کے بل بوتے پر دین میں بنیادی تبدیلیاں نہیں کرے گا؟ جیسا کہ اجتہاد کے طرفداروں نے بھی اس بات کا اقرار کیا ہے کہ آج اگر فاطمہ (س) کے دعویٰ اور ان کے گواہوں کی بناء پر فدک انہیں لوٹا دیا جائے تو کل کو دوسرے حقوق کا مطالبہ کریں گی۔ فاطمہ زہرا (س) کے خدشات درست ثابت ہوئے۔ اس واقعہ کے چالیس سال بعد حکومت میں ایسی بنیادی تبدیلیاں لائی گئیں جو نہ صرف سنت رسولؐ کے خلاف تھیں بلکہ خلفاء راشدین کے زمانے میں جاری سیرت کے بھی خلاف تھیں۔

رسول خداؐ کے مدعا علیہان کے کردار کے بارے میں نتائج اخذ کرتے ہوئے ابن ابی

الحدید معتزلی اپنی طنز آمیز ظرافت کے ساتھ ایک نکتہ کی نشاندہی کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

میں نے مغربی بغداد کے مدرس علی بن فاروقی سے پوچھا: کیا فاطمہ (س) سچ کہتی تھیں؟ اس نے جواب دیا: ہاں! پھر اس نے مسکرا کر کہا: اگر اس دن فدک انہیں دے دیتے، تو دوسرے دن اپنے شوہر کی خلافت کی دعویٰ دار بن جاتیں اور خلیفہ ان کی بات ٹھکرا نہیں سکتا تھا۔ کیونکہ وہ پہلے مان چکا ہے کہ رسولؐ کی بیٹی فاطمہ (س) جو کچھ کہتی ہیں سچ کہتی ہیں۔^(۱)

ہاں! جب فاطمہ زہرا (س) نے دیکھ لیا کہ خلیفہ اپنے اجتہاد اور رائے سے باز نہیں آئے گا اور اسے پہلے سے جاری سنت پر ترجیح دے گا تو انہوں نے مسلمانوں کے عام اجتماع میں اپنی شکایت پیش کرنے کا ارادہ کر لیا۔



(۱) شرح تفسیر البیہاق ج ۱۶ ص ۲۸۳

أَطْلَعَ الشَّيْطَانُ رَأْسَهُ، مِنْ مَغْرِزِهِ صَارِخاً لَكُمْ فَوَجَدَكُمْ
لِدُعَائِهِ مُسْتَجِيبِينَ

شیطان نے اپنی کمین گاہ سے سر نکالا اور تمہیں چلا کر پکارا اور
تمہیں اس کی دعوت پر لبیک کہنے والا پایا

(اقتباس از خطبہ زمزم)

رسول اکرمؐ اور صدر اسلام کے زمانے میں عدل و انصاف اور داور سی کا مرکز صرف مسجد
تھی۔ جس کسی کو کسی بڑے سے شکایت ہوتی، جس کسی کا حق چھین جاتا، جس کسی کے ساتھ حاکم یا
افسر ظلم کرتا، جو بھی حاکم یا افسر کا رویہ اور عمل سنت نبویؐ سے ہٹ کر دیکھتا وہ اپنی شکایت، اپنی
فریاد، اپنا نقطہ نظر مسلمانوں کے سامنے پیش کرتا اور سب مسلمانوں کا فرض ہوتا کہ وہ ممکنہ حد تک
اس کی مدد کریں اور اس کے حق کی بازیابی کے لئے کوشش کریں۔

رسول اللہؐ کی بیٹی کا بھی حق چھین لیا گیا اور حق چھین کر سنت نبیؐ کو بھی پامال کیا گیا۔
انہوں نے محسوس کیا کہ بہت جلد حکومت اسلامی پر قوم و قبیلہ کا رنگ چڑھ جائے گا۔ (یہ بات تیس
سال بعد پوری ہو گئی) انہوں نے دیکھا کہ مہاجرین جو قبیلہ قریش سے تھے، انہوں نے انصار کو سیاسی
میدان سے خارج کر دیا اور انصار جو پیغمبر اکرمؐ کے مددگاروں میں سے تھے آپ کے بعد خلافت کے
دعویدار بن گئے۔ (۱) اسلام سے پہلے دور میں قریش اپنے آپ کو دوسروں سے برتر اور ممتاز خیال
کرتے تھے اور انہوں نے اپنے لئے خاص امتیازات بنا لیے تھے۔ اسلام کے آنے سے وہ سب امتیاز ختم
ہو گئے۔ اب پھر ان لوگوں نے سراٹھایا ہے اور خلافت مسلمین کو اپنا حق سمجھ رہے ہیں۔ وہ اپنے آپ
کو اس منصب کا اہل کسی فضیلت اور معنوی امتیاز، جیسے علم، تقویٰ اور عدالت کی بنیاد پر نہیں سمجھ رہے
تھے۔ بلکہ صرف اور صرف قریش سے ہونے کی بنیاد پر وہ ایسا کر رہے تھے۔

رسول اللہ کی بیٹی ان اجتہادات بلکہ بہتر الفاظ میں ان جدید افکار کے سامنے خاموش نہیں بیٹھ سکتی تھیں۔ انہیں مسلمانوں کو اس سنت شکنی کے عواقب سے خبردار کرنا چاہیے تھا۔ اگر یہ بات مسلمانوں کی سمجھ میں آگئی اور وہ باز آگئے تو بہت ہی بہتر، لیکن اگر انہوں نے جناب فاطمہ (س) کی باتوں کو نہ مانا تو وہ پروردگار عالم کے ہاں جوابدہ نہ ہوں گی۔

ان وجوہات کی بنا پر جناب فاطمہؑ نے شکایت کو عوامی اجتماع میں بیان کرنے کا فیصلہ کیا۔ جناب زہراء (س) اپنی رشتہ دار خواتین کے گھیرے میں مسجد کی طرف روانہ ہوئیں۔ مورخین نے لکھا ہے کہ جب وہ مسجد کی طرف جا رہی تھیں تو ان کا طریقہ اپنے والد گرامی حضرت محمد (ص) و ز طرح بہت باوقار اور قدم اٹھانے کا انداز بھی والد گرامی کی طرح تھا۔ حضرت ابو بکر چند مہاجرین و انصار کے ساتھ مسجد میں بیٹھے تھے۔ حضرت فاطمہ (س) اور حاضرین کے مابین ایک پردہ لٹکایا گیا۔ رسول خداؐ کی بیٹی نے پہلے آہ و فریاد کر کے حاضرین مجلس کو لرزادیا اور سب رونے لگے۔ اس کے بعد تھوڑی دیر کے لئے خاموش ہو گئیں۔ جب لوگوں نے رونا بند کیا اور خاموش ہو گئے تو انہوں نے اپنی گفتگو کا آغاز کیا۔

ان کا یہ خطبہ، تاریخی، خوبصورت، بلیغ، رسا، شکایت آمیز، خوف دلانے والا اور آتشیں ہے۔ اس خطبے کی سب سے قدیم سند جو مصنف کی دسترس میں ہے وہ ابوالفضل احمد ابی طاہر مروزی (پیدائش ۲۰۴، وفات ۲۸۰ ہجری) کی کتاب بلاغات النساء ہے۔ جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے یہ کتاب اسلامی دور کی عرب عورتوں کے خطبات، اقوال اور اشعار کا مجموعہ ہے۔ اس کتاب کا آغاز جناب عائشہ بنت ابو بکر کے ملامت آمیز خطبے سے ہوتا ہے۔ اس کا دوسرا خطبہ جناب زہرا سلام اللہ علیہا کے بیان پر مشتمل ہے۔

احمد بن ابی طاہر نے اس خطبے کو دو صورتوں اور دو روایتوں کے ساتھ بیان کیا ہے، لیکن اس کے بعد کی کتب میں دونوں روایتیں آپس میں مخلوط ہو گئیں ہیں اور خطبہ ایک شکل میں ذکر ہوا ہے جو دونوں صورتوں پر مشتمل ہے۔

مصنف نے احمد بن ابی طاہر کی تحریر کے الفاظ اور عبارت کی ترحیب کے لحاظ سے علی بن عیسیٰ اربلی (وفات ۲۹۳ ہجری) کی کتاب کشف الغمہ کی پیروی کی ہے۔ اس خطبے کی سند اور متن کے بارے میں احمد ابن ابی طاہر سے کئی سال پہلے بحث و گفتگو انجام پا چکی ہے۔ احمد بن ابی طاہر کہتے ہیں:

میں نے ابو الحسن زید بن علی بن حسین بن علی بن ابی طالب سے کہا کہ لوگوں کا خیال ہے کہ فصاحت و بلاغت کے ساتھ یہ خطبہ جناب فاطمہ (س) کا نہیں ہے۔ بلکہ ابو العیناء نے اسے گھڑا ہے۔

انہوں نے جواب دیا: میں نے آل ابو طالب کے بوڑھوں کو دیکھا ہے کہ

وہ اپنے آباء سے اسے نقل کرتے ہیں اور اپنے بیٹوں کو اس کی تعلیم دیتے ہیں۔ اس خطبے کو میرے باپ نے میرے دادا سے اور انہوں نے جناب فاطمہ (س) سے روایت کیا ہے۔ بزرگان شیعہ نے ابو العیناء کے دادا کی پیدائش سے بھی پہلے اسے نقل کیا ہے اور ایک دوسرے کو اس کی تعلیم دی ہے۔ اس کے بعد انہوں نے کہا: لوگ کس طرح فاطمہ زہراء (س) کے خطبے کا انکار کرتے ہیں۔ جبکہ وہ حضرت عائشہ کے والد کی موت پر حضرت عائشہ کے خطبے کو قبول کرتے ہیں۔ (۱)

اس گفتگو کو اسی شکل و صورت میں ابن ابی الحدید نے سید مرتضیٰ سے اور انہوں نے مرزبان اور اس نے اپنی اسناد کے ساتھ احمد بن ابی طاہر کے بیٹے عبید اللہ سے نقل کیا ہے۔ (۲) ہم نے دیکھا کہ بلاغات النساء (اس کے تینوں نسخوں میں یہ بات نقل ہوئی ہے اور یہ تینوں مصنف کے پاس ہیں) کے مؤلف کے بقول یہ گفتگو اس کے اور ابو الحسن زید بن علی بن حسین بن علی بن ابی طالب کے درمیان ہوئی ہے۔ (۳)

لیکن اس روایت کو اس سند کے ساتھ قبول کرنا مشکل، بلکہ ناقابل قبول ہے۔ کیونکہ زید بن علی بن حسین سن ۱۲۲ ہجری میں شہید ہو گئے تھے اور احمد بن ابی طاہر جیسا کہ ہم نے لکھا ہے ۲۰۴ ہجری میں پیدا ہوئے۔ اس بناء پر یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اس نے یہ سوال زید بن علی بن حسین سے کیا ہے۔

مسلم ہے کہ حدیث بیان کرنے والوں سے حدیث کی سند میں بھول ہوئی ہے۔ جہاں تک میری تحقیق ہے، صرف علم رجال کے معاصر عالم جناب شیخ محمد تقی شوشتری نے اس غلطی کو پایا ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ یہ گفتگو احمد بن طاہر اور زید بن علی بن حسین بن زید کے درمیان ہوئی ہے۔ (۴) اور اس نظریے کی تائید اس بات سے ہوتی ہے کہ بلاغات النساء کے مؤلف نے اپنی کتاب میں دوسری جگہ پر ایک حدیث زید بن علی بن حسین بن زید علوی سے نقل کی ہے اور یہ دونوں زید ایک ہی ہیں۔ (۵)

(۱) بلاغات النساء ص ۲۳

(۲) شرح بیج البلاغ ج ۱ ص ۲۵۲

(۳) طبع بیروت ص ۲۳۔ طبع نجف ص ۱۲۔ طبع قم ص ۱۲

(۴) قاموس الرجال ج ۴ ص ۲۵۹

(۵) ص ۱۷۵ طبع قم

حیران کن بات یہ ہے کہ یہ غلطی بلاغات النساء کی دونوں اشاعتوں میں برقرار رہی اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ یہی غلطی ابن ابی الحدید کی شرح نہج البلاغہ میں سرایت کر گئی۔ بہر حال اس قدیمی سند کے علاوہ یہ خطبہ اہل سنت اور شیعہ کی معتبر کتابوں میں بھی نقل ہوا ہے۔

میرا گمان ہے کہ بعض سیرت نگاروں اور محدثین اہل سنت کی اس خطبے کو جعلی قرار دینے کی وجہ (اگر خدا نخواستہ وہ نفس پرستی کا شکار نہ ہوئے ہوں تو) یہ ہے کہ خطبہ لفظی اور معنوی لحاظ سے بہت زیادہ آراستہ ہے۔ خصوصاً اس میں مسجع عبارات موجود ہیں۔ ان کا خیال یہ ہے کہ جب کوئی مقرر عمومی اجتماع میں تقریر کرے گا تو اس کی گفتگو نثر مرسل ہوگی۔ خصوصاً جب شکلم شکایت اور داد خوانی کے مقام پر ہو۔

اگر تو ہم کا موجب یہی امر ہے اور ان کا معترض ہونا حسد و کینہ کی وجہ سے نہیں، تو انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ حقیقت یہ نہیں ہے۔ رسول زادی کے خطبے میں، تشبیہ، استعارہ اور کنایہ استعمال ہوا ہے۔ ان لفظی اور معنوی صنائع کی مثالیں صحابہ کرام اور صدر اسلام کے لوگوں کے مختصر کلاموں میں بہت زیادہ ملتی ہیں چہ جائیکہ خاندان پیغمبر میں۔ لفظی صنائع میں سے موازنہ، ترمیم، تضاد اور ان سب سے زیادہ مسجع عبارات، اس خطبے میں موجود ہیں۔

مسجع گوئی کا ہنر خاندان پیغمبر میں ایک فطری امر تھا کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ اسلام سے پہلے مکہ میں مسجع کلام کہنے کا عام رواج تھا۔ قرآن کریم کی ابتدائی کئی آیات اس صنعت سے بھری پڑی ہیں۔

رسول اکرمؐ کی بیٹی فاطمہ (س)، ان کے شوہر علی ابن ابی طالبؓ اور ان کے بچے قانون وراثت کے لحاظ سے اور قرآنی آیات کے اثرات کی وجہ سے مسجع گفتگو کرنے کے عادی بن گئے تھے۔ علیؓ کے خطبات میں بہت کم ایسے جملے ملیں گے جو مسجع نہ ہوں۔ ان کی اولاد بھی ایسی ہی تھی۔ جب حضرت زینب سلام اللہ علیہا نے ابن زیاد کے دربار میں اس کی دل آزار باتوں کا جواب دینا چاہا تو یوں گویا ہوئیں:

لَقَدْ قَتَلْتَ كَهْلِي. وَأَبْرَأْتَ أَهْلِي. وَ قَطَعْتَ فَرْعِي وَ اجْتَنَنْتَ أَصْلِي. فَإِنْ يَشْفِكَ هَذَا فَقَدْ اِسْتَفَيْتَ. (طبری ج ۷ ص ۳۷۲)

ہمارے سردار کو تو نے مارا، ہمارا سارا خاندان تو نے اجاڑا۔ ہمارے درختوں کو تو نے کاٹا ہماری جڑوں کو تو نے اکھاڑا، اگر تیرا کلیجہ اس سے ٹھنڈا ہوتا ہے تو ٹھنڈا کر لے۔

ابن زیاد نے کہا: کیا مسجع گفتگو کر رہی ہو۔ حیرا باپ بھی مسجع کلام کہتا تھا۔

خاندان بنی ہاشم کے علاوہ عبد مناف کے قبیلے کے اکثر مرد و زن اس ہنر کے حامل تھے۔ جس دن معاویہ نے اپنے بیٹے یزید کو خلیفہ نامزد کرنا چاہا تو اس نے عبد اللہ ابن زبیر سے کوئی رائے معلوم کی تو اُس نے جواب دیا:

إِنِّي أَنَادِيكَ وَ لَا أَتَاخِيكَ. أَنَّ أَخَاكَ مَنْ
صَدَقَكَ. فَانْظُرْ قَبْلَ أَنْ تَقْدَمَ وَ تَفَكِّرْ قَبْلَ أَنْ
تَتَّخِذَ. فَإِنَّ النَّظَرَ قَبْلَ التَّقَدُّمِ وَ التَّفَكُّرَ قَبْلَ التَّخْذِ.

معاویہ ہنسا اور کہا:

اے مکار لومڑی! بڑھاپے میں قافیہ گوئی سیکھ لی ہے۔ اتنی لمبی مسجع عبارت کی ضرورت نہیں ہے۔ (۱)

مصنف نے پوری کوشش کی ہے کہ اس خطبے کو نثر میں منتقل کرنے میں جہاں تک ممکن ہو لفظی اور معنوی صنائع کو محفوظ رکھا جائے۔ خصوصاً قافیہ گوئی کا تاحد امکان خیال رکھا جائے اور اگر ان جملوں کے ترجمے میں کسی لفظ کو جایزا کیا گیا تو صرف اسی حسن کو برقرار رکھنے کے لئے کیا گیا ہے۔ خطبے کا آغاز یوں ہوتا ہے:

حمد و ستائش ہے پروردگار کی اس کی نعمات پر شکر ہے
اس کا ان افکار و معارف پر جو اس نے الہام کئے، اس کے
چشمہ لطف سے پھوٹنے والی بیشمار نعمتوں پر حمد و ثناء ہے اور
اس کی بے پناہ بخشش پر جو اس نے عطا فرمائی۔ اس کے
پے درپے احسانات پر قربان جاؤں۔ اس کی مسلسل
نعمات جو شمار نہیں کی جاسکتیں، ان کا حق ادا نہیں کیا
جاسکتا، اس کی نعمات کی گہرائیوں اور رازوں تک پہنچنا
ہماری عقلوں کی دسترس سے باہر ہے۔

اس نے شکر کو نعمات میں اضافے کا سبب بنایا۔ حمد کو
ثواب میں زیادتی کا موجب قرار دیا۔ دعاؤں کے کرنے
سے اپنی عطاء و بخشش میں اضافہ کیا۔ میں گواہی دیتی
ہوں کہ خدا یکتا ہے۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔
اس گواہی کا ترجمان حد درجہ خلوص ہے اور اس
عقیدے کی بنیاد بال بصیرت قلوب ہیں۔

اس تک پہنچنے کے لئے چراغِ دانش ہے۔ وہ خدا جسے
آنکھیں دیکھ نہیں سکتی اور انسانی افکار اور تصورات اس
کا احاطہ نہیں کر سکتے۔

الْحَمْدُ لِلَّهِ عَلَى مَا أُنْعَمُ. وَلَهُ الشُّكْرُ عَلَى مَا أَلْهِمَ
وَالثَّنَاءُ بِمَا قَدَّمْ مِنْ عُمُومِ نِعْمَةٍ
إِبْتَدَاهَا. وَسُبُوحِ أَلَاءِ اسْتَدَاهَا. وَأَخْسَنَ مِنْ
وَالْأَلْهَاءِ. جَمَّ عَنِ الْإِخْصَاءِ عَدَدُهَا. وَنَأَى عَنِ
لُمُجَازَاتِ أَمْدِهَا. وَ تَفَاوَتْ عَنِ الْإِفْرَاقِ
أَبْدُهَا

وَاسْتَنْ الشُّكْرَ بِفَضْلِهَا. وَاسْتَخَمَدَ إِلَى
الْخَلَائِقِ بَاءَ جُزَالِهَا. وَثَنَى بِالذَّبِّ إِلَى امْتَالِهَا.
وَ أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ. كَلِمَةً جَعَلَ الْإِخْلَاصَ
تَأْوِيلَهَا. وَضَمَّنَ الْقُلُوبَ مَوْصُولَهَا.

وَأَنَارَ فِي الْفِكْرَةِ مَعْقُولَهَا. وَ الْمُمْتَنِعِ مِنَ
الْأَبْصَارِ رُؤْيَاهُ. وَمِنْ الْأَوْهَامِ الْإِحَاطَةَ بِهِ

إِبْتَدَعَ الْأَشْيَاءَ لَا مِنْ شَيْءٍ قَبْلَهَا . وَاخْتَدَاهَا
بِلَا مِثَالٍ . لِغَيْرِ فَائِدَةٍ زَادَتْهُ إِلَّا إِظْهَاراً لِقُدْرَتِهِ .
وَتَعْبُدُ لِبَرِيَّتِهِ . وَإِعْزَازاً لِدَعْوَتِهِ . ثُمَّ جَعَلَ الثَّوَابَ
عَلَى طَاعَتِهِ . وَالْعِقَابَ عَلَى مَعْصِيَتِهِ . زِيَادَةً
لِعِبَادِهِ عَنْ نِقْمَتِهِ . وَحَيَاساً لَهُمْ إِلَى جَنَّتِهِ .

وَأَشْهَدُ أَنَّ أَبِي مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُولُهُ . اخْتَارَهُ
قَبْلَ أَنْ يَخْلُقَهُ . وَاصْطَفَاهُ قَبْلَ أَنْ يَبْتَعِنَهُ .
وَسَمَّاهُ قَبْلَ أَنْ اسْتَنْجِبَهُ . إِذِ الْخَلْقُ بِالْغُيُوبِ
مَكْنُونَةٌ . وَبَسِطَ الْأَهْوِيلَ مَصُونَةً . وَبَنَاهَا
الْعَدَمَ مَقْرُونَةً عِلْماً مِنَ اللَّهِ عَزَّوَجَلَّ بِمَا يَلِ
الْأُمُورِ . وَإِحَاطَةً بِخَوَادِثِ الدُّهُورِ . وَمَعْرِفَةً
بِمَوَاضِعِ الْمَقْدُورِ . ابْتَعَنَهُ اللَّهُ تَعَالَى عَزَّوَجَلَّ
إِتْمَاماً لِأَمْرِهِ . وَغَزِيمَةً عَلَى إِمْنَاءِ حُكْمِهِ .
فَرَأَى (ص) الْأَمَمَ فُرْقاً فِي أَذْيَانِهَا . غُكْفَا عَلَى
بَيْرَانِهَا . غَابِذَةً لِأَوْتَانِهَا . مُنْكَرَةً لِلَّهِ مَعَ عِزِّهَا .

فَانَارَ اللَّهُ عَزَّوَجَلَّ بِمُحَمَّدٍ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ
ظُلُمَهَا . وَفَرَّجَ عَنِ الْقُلُوبِ بِهِمَا . وَجَلَّى عَنِ
الْأَبْصَارِ غَمَمَهَا . ثُمَّ قَبَضَ اللَّهُ نَبِيَّهَ صَلَّى اللَّهُ
عَلَيْهِ قَبْضَ رَافَةٍ وَاخْتِيَارَ . رَغْبَةً بِأَبِي صَلَّى اللَّهُ
عَلَيْهِ عَنْ هَذِهِ الدَّارِ . مَوْضِعاً عَنْهُ الْعِبَ
وَالْأَوْزَارُ مُخَفَّفٍ بِالْمَلَائِكَةِ الْأَنْبَرِ وَمُجَاوِزَةٍ
الْمَلِكِ الْجَبَّارِ وَرِضْوَانِ الرَّبِّ الْغَفَّارِ . صَلَّى
اللَّهُ عَلَى مُحَمَّدٍ نَبِيِّ الرَّحْمَةِ . وَأَمِينِهِ عَلَى
وَحْيِهِ وَصَفِيهِ مِنَ الْخَلَائِقِ . وَرَضِيهِ صَلَّى اللَّهُ
عَلَيْهِ وَسَلَّم وَرَحْمَةُ اللَّهِ وَبَرَكَاتُهُ .

اس نے سب کچھ عدم سے خلق کیا۔ جن کا نمونہ پہلے
موجود نہ تھا۔ خلقت اشیاء کی اسے ضرورت نہ تھی اور نہ
ان کی خلقت سے اسے کچھ فائدہ ہوا۔ مگر یہ کہ اس
نے اپنی قدرت کو آشکار کرنا چاہا اور اپنی مخلوقات پر
بندہ نوازی کرتے ہوئے انہیں نوازنا چاہا۔ اپنی دعوت کو
پورے عالم میں پھیلاتا چاہا۔ اس نے اجر و ثواب کو
فرمانبرداری میں گروہی رکھا اور نافرمانوں کو عذاب سے
ڈرایا تاکہ بندوں کو انجام بد سے بچائے اور بہشت کی
طرف انہیں لے جائے۔

میں گواہی دیتی ہوں کہ میرے باپ محمد خدا کے بندے
اور رسول ہیں۔ ان کی خلقت سے پہلے خدا نے انہیں
چن لیا، رسالت سے پہلے انہیں منتخب کر لیا اور ان کا ایسا
نام رکھا جو انہیں بچتا تھا۔ یہ وہ وقت تھا جب مخلوقات
پردہ غیب میں تھیں، آنکھوں سے اوجھل تھیں۔ میدان
عدم میں سرگرداں تھیں۔ بزرگ و برتر خدا سب
کاموں کے انجام سے آگاہ تھا۔ حالات اور زمانے میں
تغیر و تبدل سے باخبر اور ان پر حاوی تھا۔ وہ ہر چیز کے
انجام سے مطلع تھا۔ خدا نے جناب محمد کو مبعوث فرمایا
تاکہ اپنے امر کو اختتام تک پہنچائے اور جو اس نے مقدر
کیا ہے اسے انجام تک پہنچائے۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ
وآلہ وسلم نے دیکھا کہ تمام لوگ فرقوں میں تقسیم مختلف
مذہب کو اختیار کئے ہوئے ہیں۔ ہر گروہ اپنے مذہب پر
گازن ہے۔ ہر گروہ کسی نہ کسی بت کی پرستش کر رہا
ہے اور سب نے اللہ کو جانتے ہوئے فراموش کر دیا
ہے۔

پس خدا بزرگ و برتر نے تاریکیوں میں نور محمد سے اجالا
کر دیا۔ اللہ نے آنحضرت کی برکت سے دلوں سے
غبار کفر کو دھو ڈالا۔ آنکھوں پر پڑے پردوں کو
ہٹا دیا۔ پھر اپنے لطف و مہربانی سے اپنی رضا و خوشنودی سے
آپ کو نوازا۔ اس دنیا کے رنج و الم کو جسے وہ پسند نہیں
کرتا تھا آپ کے دل سے دور کر دیا۔ آنحضرت کو
فرشتوں کے عالم میں مقرب فرمایا۔ آپ کی حکومت کو
اپنے قرب و جوار میں قائم کیا اور مغفرت و رضوان کو
آپ کے نام دائم کر دیا۔ اللہ تعالیٰ کا درود و سلام ہو نبی
رحمت پر۔ امین و وحی پر۔ تمام لوگوں سے برگزیدہ ہستی
پر۔ اللہ تعالیٰ آپ سے راضی ہو۔ خدا کی رحمتیں اور
برکتیں آپ پر نازل ہوں۔

ثُمَّ أَنْتُمْ عِبَادُ اللَّهِ (تُرِيدُ أَهْلَ الْمَجْلِسِ)

(اس کے بعد جناب فاطمہؑ نے اہل مجلس کو مخاطب کر کے فرمایا):

تم خدا کے بندے ہو، اس کے حلال و حرام اور اوامر و نواہی سے وابستہ ہو۔ اس کے دین اور احکام کے محافظ ہو۔ تم حق کے امین ہو اور اسے دوسری قوموں تک پہنچانے والے ہو۔ تم سمجھتے ہو تمہارا خدا پر حق ہے؟ تم خدا سے عہد و پیمان کے پابند ہو۔ ہمارے خاندان کو تمہارے درمیان اس نے خلافت کے لیے مقرر فرمایا اور کتاب اللہ کی تاویل کی ذمہ داری ہم پر ڈالی۔ قرآن کی اولہ و براہین آشکار ہیں اور جو کچھ ہمارے بارے میں ہے۔ وہ روشن ہے۔ اس کی اولہ واضح اور تاریکی میں روشنی کی مانند ہیں۔ اس کی آواز کانوں میں رس گھولتی ہے۔ اپنے پیروکار کو باغ رحمت الہی کی طرف ہدایت کرتی ہے۔ اس کا سننے والا دونوں جہانوں میں کامیاب ہے۔

اللہ کی روشن دلیلوں کو اس کی آیات کے پر تو میں دیکھا جاسکتا ہے۔ احکام واجب کی تفسیر کو قرآن کے مفہوم سے حاصل کیا جاسکتا ہے۔ اس کے بیان کردہ محارم الہی روکنے والے ہیں اور اس کے حلال کفایت کرنے والے ہیں۔ اس کے مستحبات اس کے فضائل ہیں۔ شریعت کے لئے راہ گشاہ ہے۔ ان سب کو آسان ترین عبارت میں بیان کیا اور واضح ترین شکل میں پیش کیا۔ اس کے بعد اس نے ایمان تم پر واجب کیا تاکہ شرک کے زنگ تمہارے دلوں سے اتار پھینکے۔

اس نے نماز کے ذریعے تمہارے غرور و تکبر کو ختم کیا۔ روزے کو خلوص کی علامت قرار دیا۔ زکوٰۃ کو تمہارے رزق میں اضافہ کا سبب قرار دیا۔ حج کو تمہارے دین میں درجات کی آزمائش کا وسیلہ بنایا۔ عدالت کو یقین قلوب کی نشانی قرار دیا۔ ہماری پیروی کو وحدت کا سرمایہ قرار دیا۔ ہماری امامت کو مانع افتراق، ہماری محبت اور دوستی (۱) کو مسلمانوں کی عزت بنایا۔ صبر کو کامیابی اور نجات کا موجب بنایا۔ اور قصاص کو بھائے زندگی کا سبب قرار دیا۔ (سورہ بقرہ: ۱۷۹ کی طرف اشارہ ہے)

نذر کی ادائیگی کو مغفرت و بخشش کا وسیلہ بنایا۔ پورا تولے کو کم فروشی اور وزن میں کمی کا مانع قرار دیا۔ اس نے شراب پینے سے منع فرمایا تاکہ اپنے آپ کو رجز اور پلیدی سے پاک رکھیں۔

نُصِبُ أَمْرِ اللَّهِ وَنَهْيِهِ . وَحَمَلَةُ دِينِهِ وَوَحْيِهِ .
وَأَمْنَاءُ اللَّهِ عَلَى أَنْفُسِكُمْ وَبُلْعَاؤُهُ إِلَى الْأُمَمِ .
رَعَمْتُمْ حَقًّا لَكُمْ لِلَّهِ فِيكُمْ عَهْدٌ ، قَدَّمَهُ إِلَيْكُمْ .
وَنَحْنُ بَقِيَّةُ اسْتِخْلَافِنَا عَلَيْكُمْ . وَمَعَنَا كِتَابُ اللَّهِ ،
بَيِّنَةٌ بَصَائِرُهُ . وَآيَ فِينَا مُنْكَشِفَةٌ سَرَائِرُهُ .
وَبُرْهَانٌ مُنْجِلِيَّةٌ ظَوَاهِرُهُ . مُدِيمُ الْبَرِيَّةِ اسْمَاعُهُ .
قَائِدٌ إِلَى الرِّضْوَانِ اتِّبَاعُهُ مُؤَدِّ إِلَى النُّجَاةِ
اسْتِمَاعُهُ .

فِيهِ بَيَانُ حُجَجِ اللَّهِ الْمُنَوَّرَةِ . وَعَزَائِمُهُ الْمُقَسَّرَةِ
وَمَحَارِمِهِ الْمُحَذَّرَةِ وَبَيِّنَاتُهُ الْجَالِيَّةِ . وَجَمَلُهُ
الْكَافِيهِ . وَقَضَائِلُهُ الْمُنْدُوبَةُ وَرُخْصَتُهُ الْمَوْهُوبَةُ .
وَشَرَائِعُهُ الْمَكْتُوبَةُ . فَفَرَضَ اللَّهُ الْإِيمَانَ تَطْهِيراً
لَكُمْ مِنَ الشِّرْكِ .

وَالصَّلَاةُ تَنْزِيهاً عَنِ الْكِبَرِ . وَالصَّيَامُ تَنْزِيهاً
لِلْأَخْلَاصِ . وَالزَّكَاةُ تَزْيِيداً فِي الرِّزْقِ . وَالْحَجُّ
تَسْلِيَةً لِلدِّينِ . وَالْعَدْلُ تَسْكُناً لِلْقُلُوبِ . وَطَاعَتُنَا
نِظَاماً . وَأَمَانَتُنَا أَمْنًا مِنَ الْفُرْقَةِ وَحُبُّنَا عِزّاً
لِلْإِسْلَامِ . وَالصَّبْرُ مَنَاجَاةً . وَالْقِصَاصُ حِفْظاً
لِلدِّمَاءِ .

وَالزَّوْءُ بِاللَّذْرِ تَعْرِضاً لِلْمَغْفِرَةِ . وَتَوْفِيَةُ
الْمَكَايِلِ وَالْمَوَازِينِ تَغْيِيراً لِلْبَخْسَةِ .
وَالنَّهْيُ عَنْ شُرْبِ الْخَمْرِ تَنْزِيهاً عَنِ الرَّجْسِ .

(۱) بعض متاخر ماخذ میں جب = دوستی کی جگہ جہاد آیا ہے اور یہ زیادہ مناسب لگتا ہے۔

وَقَذَفَ الْمُحْصَنَاتِ اجْتِنَاباً لِلْعَنَةِ وَتَرَكَ
السَّرِقِ اجْتِنَاباً لِلْعِقَةِ . وَحَرَّمَ اللَّهُ عَزَّ وَجَلَّ
الشَّرْكَ اخْلَاصاً لَهُ بِالرُّبُوبِيَّةِ . ” فَاتَّقُوا اللَّهَ حَقَّ
تَقَاتِهِ وَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنْتُمْ مُسْلِمُونَ . (آیہ ۱۰۱
آل عمران) وَأَطِيعُوا فِيمَا أَمَرَكُمْ بِهِ وَنَهَاكُمْ
عَنْهُ فَإِنَّهُ ” إِنَّمَا يَخْشَى اللَّهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ “
(فاطر: آیہ ۲۸) .

ثُمَّ قَالَتْ : . أَيُّهَا النَّاسُ . أَنَا فَاطِمَةُ وَأَبِي مُحَمَّدٌ .
أَقُولُهَا عَوْدًا عَلَى بَدْءِ . ” لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِنْ
أَنْفُسِكُمْ عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيصٌ عَلَيْكُمْ
بِالْمُؤْمِنِينَ رَؤُوفٌ رَحِيمٌ “ . (نوبہ : ۱۲۹) فَإِنْ
تَعَرَّفُوهُ تَجِدُوهُ أَبِي دُونَ آبَاتِكُمْ . وَآخَابِنِ عَمِّي
دُونَ رِجَالِكُمْ . فَبَلِّغِ النَّذَارَةَ . صَادِعًا بِالرَّسَالَةِ .
مَا يَلَا عَنْ مَذْرَجَةِ الْمُشْرِكِينَ . ضَارِبًا لِيَجْهَمَ ،
أَخِذًا بِكُظُمِهِمْ . يَهْشِمُ الْأَضْغَامَ وَيَنْكُثُ الْهَامَ .
حَتَّى هَزَمَ الْجَمْعَ وَوَلَّو الدُّبُرَ . وَنَفَرَى اللَّيْلَ عَنْ
صُبْحِهِ . وَاسْفَرَّ الْحَقُّ عَنْ مَحْضِهِ . وَنَطَقَ رُعِيمُ
الدِّينِ . وَخَرَسَتْ شَفَاشِقُ الشَّيَاطِينِ .

وَكُنْتُمْ عَلَى شَفَا حُفْرَةِ مِنَ النَّارِ . مُذَقَّةَ الشَّارِبِ
وَنَهْزَةَ الطَّامِعِ وَقَبْسَةَ الْعَجَلَانِ . وَمَوْطَأَ
الْأَفْدَامِ . تَشْرَبُونَ الطَّرِيقَ وَتَفْتَتُونَ الْوَرَقَ .
أَذِلَّةٌ خَاسِسِينَ .

تَخَافُونَ أَنْ يَتَخَطَّفَكُمُ النَّاسُ مِنْ حَوْلِكُمْ .
فَإِنْقَذَكُمْ اللَّهُ بِرَسُولِهِ (ص) بَعْدَ اللَّتْيَا وَالَّتِي .
وَبَعْدَ مَا مَنَى بِهِمُ الرِّجَالِ ، وَذُؤْبَانَ الْعَرَبِ ، وَ
مَرَدَّةَ أَهْلِ الْكِتَابِ .

اس نے پاکدامن عورتوں پر تہمتیں لگانے سے منع فرمایا
تاکہ اپنے آپ کو لعنت کا مستحق قرار نہ دیں۔ (سورہ
نور: ۲۳ کی طرف اشارہ ہے) چوری سے روکا تاکہ
عفت کا راستہ اختیار کریں۔ شرک کو حرام قرار دیا
تاکہ اخلاص کے ساتھ توحید کی عبادت و بندگی کریں۔
پس اللہ سے ایسے ڈرو جیسا کہ ڈرنے کا حق ہے اور
مروتو مسلمان ہو کر مرو۔ (آل عمران : ۱۰۱)۔ جن
چیزوں سے اس نے منع فرمایا ہے ان سے باز آجاؤ۔ بیشک
اللہ سے صرف دانا و عالم بندے ڈرتے ہیں۔ (فاطر: ۲۸)
اس کے بعد فرمایا: لوگو! جس طرح میں نے شروع میں
کہا ہے: میں فاطمہ (س) ہوں اور میرے باپ محمد ہیں۔
تحقیق تمہارے پاس ایسا رسول آیا ہے جو تم میں سے ہے
جس پر تمہارا غم اور رنج بہت گراں ہے۔ اور تمہاری
نجات پر حریص ہے اور مومنین پر مہربان اور ان کا ہمدرد
ہے اگر تم انہیں پہچانتے ہو تو جان لو کہ وہ میرا باپ
تھانہ کہ تمہاری عورتوں کا۔ وہ تمہارے مردوں میں
سے صرف میرے شوہر کے بھائی تھے۔ انہوں نے اپنا
پیغام لوگوں تک پہنچا دیا ہے اور لوگوں کو عذاب الہی
سے ڈرایا ہے۔ انہوں نے شرک کی پیشانی اور کمر
کو توحید کے تازیانے سے توڑ دیا ہے۔ بتوں اور بت
پرستوں کی شان و شوکت کو خاک میں ملادیا ہے۔

یہاں تک کہ کافر متفرق ہو گئے اور پیٹھ پھیر کر بھاگ
گئے۔ کفر کی کالی رات کا خاتمہ ہوا اور ایمان کی صبح
نمودار ہوئی۔ حق و حقیقت نے چہرے سے نقاب الٹا دیا۔
دین کی رہبری کا چرچا برسر عام ہوا۔ شیاطین کی زبانیں
مٹ گئیں۔

اس دوران میں تم جہنم کے دروازے پر تھے۔ ہر پہلے
کی نظر تم پر تھی۔ ہر دیکھنے والے کی نظروں میں تم حقیر
و پست تھے۔ ہر طمع کار کا لقمہ اور ہر درندے کا شکار تم
تھے۔ لوگ تمہیں اپنے پاؤں سے کھینچتے، تم بدبودار اور
گنداپانی پیتے اور پتے چباتے تھے۔ تمہاری غذا جانوروں
کی کھال اور مردار تھی۔ تمہارا کوئی پرسان حال نہ تھا۔
ہر وقت خطرہ لگا رہتا تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ لوگ
تمہیں گھیر کر ہلاک نہ کر دیں۔ یہاں تک کہ خدا
نے اپنے پیغمبرؐ کو بھیج کر تمہیں خاک مذلت سے اٹھایا
اور تمہیں رفعت و بلندی کے کمال تک پہنچا دیا۔ ان باتوں
کے علاوہ جب پیغمبرؐ جانور جیسے انسانوں اور بھیڑیے
میسر یوں میں گھر گئے، جن میں سرکش قسم کے اہل

کتاب بھی تھے۔ جن کی آتش فساد کو اللہ نے بجھا دیا۔

جب کبھی شیطان نے سر اٹھایا، یا مشرکین نے کوئی بے ادبی کی تو پیغمبرؐ نے اپنے بھائی کو سینہ پر کر دیا۔ جس کی شان یہ تھی کہ جب تک فتنوں کے کان نہ بند کر دے اور آتش فساد کو اپنی تلوار کے پالی سے بجھا نہ دے میدان سے پلٹتا نہ تھا۔ وہ ذات خدا میں گوشاں، (امر الہی میں جدوجہد کرنے والا) رسول اللہؐ سے قریب، اولیاء خدا کا سردار، امت کا ناصح، عمل کے لیے کمر بستہ، اسلام کے لیے ساعی اور ترویج دین کے لیے جفا کش تھا۔ ان تمام تختیوں میں تم فارغ البال اور مطمئن تھے۔ تمہیں کوئی گزند نہیں پہنچا

جب اللہ نے اپنے پیارے رسولؐ کو اپنے پاس بلا لیا تو نفاق اور دو روئی ظاہر ہو گئی۔ دین کی اہمیت جانی رہی۔ ہر گمراہ خلافت کا دعویدار بن گیا اور ہر گمراہ سردار بن گیا اور ہر فضول کئے والا اگلی کوچے میں بات اچھالنے لگا۔ شیطان نے اپنی سکین گاہ سے سر باہر نکالا اور تمہیں اپنی طرف بلایا۔ اس نے دیکھا کہ تم لوگوں نے کتنی جلدی اس کی آواز پر لبیک کہا اور کتنی تیزی سے اس کی طرف لپک پڑے اور اس کے دام فریب میں آ گئے اور اس کے اشاروں پر ناچنے لگے۔ ابھی تمہارے رسولؐ کو دنیا سے گئے ہوئے دو دن بھی نہ گزرے تھے اور ہمارے غم کا بوجھ بٹکا بھی نہ ہوا تھا کہ جو نہیں کرنا چاہیے تھا وہ تم نے کر دکھایا۔ جو تمہارا حق نہ تھا اس پر قابض ہو گئے۔ تم نے بہت بڑی بدعت ایجاد کی ہے۔

تم نے اپنے طور پر یہ خیال کیا کہ فتنہ نہ اٹھنے پائے اور خون نہ بہنے پائے لیکن تم خود فتنے کی آگ میں کود گئے۔ تم نے جو کچھ اگایا اسے ضائع کر دیا۔ جان لو کہ دوزخ کافروں کا ٹھکانا (توبہ: ۱۱) اور بدکاروں کی جگہ ہے۔

تم کہاں اور فتنے کو ختم کرنا کہاں؟ جھوٹ بولتے ہو اور فریب دیتے ہو۔ تم نے حق کے علاوہ راستے کو اختیار کیا حالانکہ کتاب الہی تمہارے درمیان موجود ہے۔ اس کی نشانیاں بغیر کسی کمی اور اضافے کے ظاہر ہیں۔ قرآن کے اوامرو نواہی روشن اور آشکار ہیں۔ کیا تم قرآن کے علاوہ کسی اور کے فیصلے پر عمل کرنا چاہتے ہو؟ کیا تم شیطان کے حکم کی فرمانبرداری کرنا چاہتے ہو؟ ”اور جو کوئی دین اسلام کے علاوہ دین کو اختیار کرے اللہ اس سے ہرگز کوئی عمل قبول نہیں کرے گا اور جہان آخرت میں وہ خسارہ اٹھانے والوں میں ہو گا۔“

كُلَّمَا حَشَوْنَا نَارًا لِلْحَزْبِ أَطْفَأَهَا. أَوْنَحَمَ قُرُونُ الضَّلَالِ وَفَعَرَتْ فَاعِرَةً مِنَ الْمُشْرِكِينَ قَذَفَ بِأَخِيهِ فِي لَهَوَاتِهَا. فَلَا يَنْكِفِي حَتَّى يَطَايِمَ أَخَاهَا بِأَحْمَصِهِ. وَيُحَمِّدَ لَهَا بِحَدِّهِ. مَكْدُوداً فِي ذَاتِ اللَّهِ. قَرِيباً مِنْ رَسُولِ اللَّهِ. سَيِّداً فِي أَوْلِيَاءِ اللَّهِ. وَأَنْتُمْ فِي بَلَهَيَّةٍ وَادْعُونَ آمِنُونَ.

حَتَّى إِذَا خَتَرَ اللَّهُ لِنَبِيِّهِ دَارَ أَنْبِيَائِهِ، ظَهَرَتْ خَلَّةُ النِّفَاقِ. وَسَمَلُ جِلْبَابِ الدِّينِ. وَتَطَقَّ سَا ظِمُ الْغَاوِينَ. وَتَبَغَّ خَامِلُ الْآفِلِينَ. وَهَدَرَ فَنِيْقُ الْمُبْطِلِينَ. فَخَطَرَ فِي عَرَضَاتِكُمْ وَأَطْلَعَ الشَّيْطَانُ رَأْسَهُ مِنْ مَغْرَزِهِ، صَارِخاً بِكُمْ. فَوَجَدَكُمْ لِلذَّغَائِبِ مُسْتَجِيبِينَ. وَلِلْغُرَةِ فِيهِ مُلَاحِظِينَ. فَاسْتَهْضَكُمْ فَوَجَدَكُمْ خِفَافاً. وَأَجْمَشَكُمْ فَالْقَاكُمْ غَضَاباً. فَوَسَمْتُمْ غَيْرَ إِبِلِكُمْ وَأَوْرَدْتُمُوهَا غَيْرَ شَرِبِكُمْ هَذَا وَالْعَهْدُ قَرِيبٌ. وَالْكَلِمُ رَحِيبٌ. وَالْجُرْحُ لَمَّا يَنْدَمِلُ. رَعَمْتُمْ خَوْفَ الْفِتْنَةِ "أَلَا فِي الْفِتْنَةِ سَقَطُوا وَإِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيطَةٌ بِالْكَافِرِينَ" (توبہ: ۳۹)

فَهَيْهَاتَ مِنْكُمْ، وَأَنْتَ بِكُمْ، وَأَنْتَ تُؤَفِّكُونَ. وَهَذَا كِتَابُ اللَّهِ بَيْنَ أَظْهُرِكُمْ. زَوَاجِرُهُ بَيِّنَةٌ. وَشَوَاهِدُهُ لَاحِظَةٌ. وَأَوَامِرُهُ وَاضِحَةٌ أَرْغَبَةٌ عَنْهُ تُرِيدُونَ. أَمْ بَغْيُهُ تَحْكُمُونَ؟ بِنَسٍّ لِلظَّالِمِينَ بَدَلًا. (وَمَنْ يَتَّبِعْ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا فَلَنْ يُقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِي الْآخِرَةِ مِنَ الْخَاسِرِينَ) العنبر: ۸۵

ثُمَّ لَمْ تَرِيْتُوْا اِلَّا رَيْثَ اَنْ تَسْكُنَ نَفْسُهَا.
تَشْرَبُوْنَ حَسُوًا، وَتُسِرُّوْنَ فِي ارْتِغَاءِ.
وَنَضْبِرُ مِنْكُمْ عَلٰی مِثْلِ حَزِّ الْمُدَى. وَانْتُمْ الْاَنَ
تَرْغُمُوْنَ اَنْ لَا اِزْت لَنَا. اَفَحُكْمُ الْجَاهِلِيَّةِ
تَبْنُوْنَ، (وَمَنْ اَحْسَنَ مِنَ اللّٰهِ حُكْمًا لِّقَوْمٍ
يُوقِنُوْنَ). (المائدہ: ۵۰)

وَيَهِيَ مَعَسَرُ الْمُهَاجِرِيْنَ. اُبْتَزُّ اِزْت اَبِي؟ يَابْنَ
اَبِي فُحَافَةَ! اَفِي الْكِتَابِ اَنْ تَرِثَ اَبَاكَ وَلَا
اِرْت اَبِي؟ لَقَدْ جِئْتُ شَيْئًا فَرِيًّا
فَلَدُونُكُمَا مَخْطُومَةٌ مَرْخُولَةٌ تَلْفَاكَ يَوْمَ
حَشْرِكَ. فَنِعْمَ الْحُكْمُ. اللّٰهُ. وَالزَّعِيْمُ مُحَمَّدٌ
. وَالْمَوْعِدُ الْقِيَامَةُ. وَعِنْدَ السَّاعَةِ يَخْسَرُ
الْمُبْطِلُوْنَ. وَ لِكُلِّ نَبَا مُسْتَقَرٌّ وَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ
(انعام: ۲۷) ثُمَّ انْحَرَفْتُ اِلَى قَبْرِ النَّبِيِّ (ص)
وَهِيَ تَقُولُ:

قَدْ كَانَ بِغَدِكَ اَنْبَاءٌ وَهَنْبَةٌ
اَنَا فَقَدْ نَاكَ فَقَدْ الْاَرْضُ وَاِبْلَهَا
آپ چلے گئے آپ کے بعد فتنہ برپا ہوا دلوں میں چھپا ہوا کینہ آشکار ہوا آپ کو کیا
کہا کہ ہم سے دنیا نے منہ پھیر لیا۔ آپ کی امت لڑ پڑی اور ہمیں تنہا چھوڑ دیا گیا۔
مَعَسَرُ الْبَقِيَّةِ. وَاغْضَادُ الْبَلَّةِ. وَخُصُوصُ
الْاِسْلَامِ. مَا هَذِهِ الْغَمِيْزَةُ فِي حَقِّي؟ وَالسَّنَّةُ عَنْ
ظِلَامَتِي. اَمَّا قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ (ص) الْمَرْءُ يُحْفَظُ
فِي وُلْدِهِ؟ سَرَّعَانَ مَا اَجَدْتُمْ فَاَكْدَيْتُمْ.
وَعَجَلَانِ ذَا اِهَالَةٍ تَقُولُوْنَ مَاثَ رَسُوْلُ اللّٰهِ
(ص) فَخَطَبَ جَلِيْلٍ. اِسْتَوْسَعَ وَهِيَهُ. وَاسْتَنْهَرَ
فَتْهُهُ. وَفَقْدَ رَاتِقَهُ. وَاطْلَمَتِ الْاَرْضُ لِعَيْبَتِهِ.

تم نے ذرا بھی صبر نہ کیا کہ تمہارے پہلے لگائے گئے زخم
مندل ہو جاتے اور تمہارا پہلا کام پایہ تکمیل کو پہنچ جاتا۔
تم نے ایک اور چال چلی۔ ایک نئے مسئلہ کا آغاز کر دیا
جو کچھ تمہارے دلوں میں تھا اسے عملی جامہ پہنانا شروع
کر دیا۔ تمہارا خیال ہے کہ ہماری کوئی میراث نہیں
ہے۔ ہم تمہارے اس حکم پر بھی صبر کریں گے اور ان
زخموں کو بھی برداشت کر لیں گے۔ مگر تم جاہلیت کے
دستور پر عمل پیرا ہو اور مگر اہی کے راستے پر گامزن
ہو۔ ایمان داروں کے لئے پروردگار عالم سے بہتر کس کا
حکم ہو سکتا ہے؟ (المائدہ: ۵۰)

اے مہاجرین! کیا یہ حکم خدا ہے کہ میری میراث لوٹ
لی جائے اور حرمت کا ذرا بھی خیال نہ کیا جائے؟ اے
فرزند ابوقحافہ! یہ خدا نے کہا ہے کہ تم تو اپنے باپ کی
میراث پاؤ اور میں اپنے باپ کی میراث سے محروم
کر دی جاؤں؟ یہ کوئی بدعت دین میں پھیلا رہے ہو؟
کیا تم روز قیامت کے حساب و کتاب سے بے خبر ہو؟
موت بہت جلد تمہیں آئے گی۔ قیامت کا وعدہ قریب
ہے۔ تم بہت جلد حشر کے میدان میں وارد ہو گے۔ وہاں
بہترین انصاف کرنے والا خدا ہے۔ مدعی جناب محمد ہیں۔
اس دن ظالم و ستمگر ذلیل و رسوا اور نقصان اٹھانے والے
ہوں گے۔ اس دن مظلوم کو اس کا حق مل جائے گا۔ تم
جلدی جان لو گے کہ ہر خبر کا اپنا مقام اور ہر مظلوم کی
داد رسی ہے۔ (انعام: ۲۷) اس کے بعد جناب فاطمہ (س)
نے بابا کی قبر کی طرف منہ کر کے فرمایا:

لَوْ كُنْتُ شَاهِدَ هَآلِكَ تَكْثُرُ الْخَطْبُ
وَاخْتَلَّ قَوْمُكَ فَاشْهَدُهُمْ وَلَا تَعْبُ
آپ چلے گئے آپ کے بعد فتنہ برپا ہوا دلوں میں چھپا ہوا کینہ آشکار ہوا آپ کو کیا
کہا کہ ہم سے دنیا نے منہ پھیر لیا۔ آپ کی امت لڑ پڑی اور ہمیں تنہا چھوڑ دیا گیا۔

اے جماعت مومنین! اے دین کے مددگارو! اے اسلام
کے طرفدارو! کیوں میرا حق نہیں لیتے ہو؟ کیوں تم نے
آنکھیں چرائی ہیں اور مجھ پر ظلم و ستم ہوتا دیکھ رہے
ہو؟ کیا میرے بابا نے نہیں فرمایا تھا کہ اولاد کا احترام
ان کے باپ کا احترام ہے؟ تم کتنی جلدی بدل گئے ہو۔
کتنی جلدی تمہارا خون سرد ہو گیا ہے اور غفلت کے
پردوں میں جا پڑے ہو۔ اپنے آپ سے کہتے ہو محمد رحلت
فرما گئے۔ ہاں رحلت فرما گئے۔ مگر ان کی وفات بہت بڑا
صدمہ تھا اور ناقابل برداشت غم۔ ان کی وفات سے ایسی

فَإِنِّي حُزْنُكُمْ بَعْدَ الْبَيَانِ وَنَكَضْتُمْ بَعْدَ الْأَقْدَامِ .

وَأَسْرَرْتُمْ بَعْدَ الْأَعْلَانِ . لِقَوْمٍ نَكُتُوا إِيمَانَهُمْ

(أَتَخْشَوْنَهُمْ . قَالَ اللَّهُ أَحَقُّ أَنْ تَخْشَوْهُ إِن كُنْتُمْ

مُؤْمِنِينَ) (توبہ: ۱۳۰)

أَلَا قَدْ أَرَى أَنْ أَخْلَدْتُمْ إِلَى الْخَفِضِ . وَرَكَعْتُمْ

إِلَى الدَّعَةِ فَعَجَّجْتُمْ عَنِ الدِّينِ . وَمَجَّجْتُمْ أَلَدَى

وَعَيْتُمْ وَدَسَّغْتُمْ أَلَدَى سَوَّغْتُمْ . ” إِن تَكْفُرُوا

أَنْتُمْ وَ مَنْ فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا فَإِنَّ اللَّهَ لَغَيٌّ

حَمِيمٌ“ (ابراہیم: ۸)

بجھا دیا۔ تم نے کافروں کے گلے میں طوق غلامی ڈالا۔ پس

ان سب کارناموں کے بعد تم بیٹھ گئے ہو۔ اتنا آگے

جانے کے بعد عقب نشینی کر لی ہے اور وہ بھی ان

لوگوں کے سامنے جنہوں نے اپنا عہد توڑ دیا اور حکم الہی

کو پس پشت ڈال دیا۔ کیا تم ان سے ڈرتے ہو؟ تمہیں اللہ

سے ڈرنا چاہیے وہ اس کا زیادہ حقدار ہے کہ تم اس سے

ڈرو، اگر تم مومن ہو۔ (توبہ: ۱۳۰)

کیا اس کا مطلب یہ نہیں کہ تم نے تن آسانی کو اپنی

عادت بنا لیا اور امن و خاموشی کے سائے میں رہنے کا

اپنے آپ کو عادی کر لیا ہے۔ کیا تم دین سے تھک چکے

ہو اور راہ خدا میں جہاد سے منہ پھیر لیا ہے۔ جو کچھ تم

نے سنا ہے، اسے سنا ان سنا کر دیا۔ یاد رکھو! اگر تم اور

جتنے لوگ روئے زمین پر ہیں، کافر ہو جائیں تو خدا کو

ذرا بھی پردہ نہیں کیونکہ وہ بے نیاز اور سزاوار حمد

ہے۔ (ابراہیم: ۸)

گر جملہ کائنات کافر گردند بردامن کبریائش ننشیند گورد

اگر ساری کائنات بھی کافر ہو جائے تو اس کی شان کبریائی میں ذرہ برابر

فرق نہیں آئے گا۔ (سحدی)

أَلَا وَقَدْ قُلْتُ أَلَدَى قُلْتُهُ عَلَى مَعْرِفَةٍ مِّنِي

بِالْخِذْلَانِ أَلَدَى خَامَرَ ضُؤُورَكُمْ . وَاسْتَشْعَرْتُهُ

قُلُوبُكُمْ . وَلَكِنْ قُلْتُهُ فَيَضَةُ النَّفْسِ . وَنَفْثَةُ الْغَيْظِ

. وَبَثَّةُ الصُّدْرِ . وَمَغْبِرَةُ الْحُجَّةِ . فَذُؤُونَكُمْ مَوْهَا .

فَاخْتَفِيْهَا مُدْبِرَةُ الظُّهْرِ . نَاكِبَةُ الْحَقِّ بِأَقْبَةِ الْعَارِ

. مَوْسُومَةُ بِشَنَارِ الْأَبَدِ مَوْصُولَةٌ بِنَارِ اللَّهِ

الْمُوقَدَةِ . الَّتِي تَطْلُعُ عَلَى الْأَفْنِئَةِ . فَبِعَيْنِ اللَّهِ

مَا تَفْعَلُونَ ” وَسَيَعْلَمُ الدِّينَ ظَلَمُوا أَى مُنْقَلَبٍ

يَنْقَلِبُونَ“ (الشعراء: ۲۲) وَأَنَا ابْنَةُ نَذِيرٍ لَكُمْ بَيْنَ

يَدَيَّ عَذَابِ اللَّهِ . فَاعْمَلُوا إِنَّا عَامِلُونَ وَانْتَظِرُوا

إِنَّا مُنْتَظِرُونَ .

میں نے اپنا پیغام پہنچانے کا حق ادا کر دیا، لیکن میں جانتی

ہوں تم ذلیل و خوار ہو اور ذلت کے ہاتھوں گرفتار ہو۔

کیا کروں؟ میرا دل خون خون ہے۔ زبان پر حرف

شکایت نہ لاؤں، میری برداشت سے باہر ہے۔ ایک بار

پھر کہتی ہوں کہ تم پست لوگوں پر میں نے حجت تمام

کردی ہے۔ اب تمہیں یہ گلو گیر لقمہ نصیب ہو اور حق

تھکنی اور حقیقت پوشی کی ذلت کا طوق ہمیشہ کے لئے

تمہاری گردنوں میں رہے۔ تمہیں کبھی بھی آرام و

سکون میسر نہ آئے۔ یہاں تک کہ خدا تمہیں بھڑکتی

ہوئی آگ میں جھونک دے۔ وہ آگ جو ہر وقت جلتی

رہے اور دل و جان کو جلائے۔ تم جو کر رہے ہو خدا

دیکھ رہا ہے۔ ظالم و ستمگر جلد جان لے گا کہ اس کا

ٹھکانا کہاں ہے۔ (الشعراء: ۲۲) میں تمہاری عاقبت کے

بارے میں پریشان ہوں اور اپنے باپ کی طرح تمہیں

عذاب الہی سے ڈراتی ہوں۔ جو درخت تم نے لگایا ہے

اس کا پھل کھانے کا انتظار کرو اور اپنے کیئے کی سزا

☆☆☆☆☆

وَمَنْ يَنْقَلِبْ عَلَى عَقْبَيْهِ فَلَنْ يَضُرَّ اللَّهَ شَيْئًا

(آل عمران ۱۳۳)

جو اپنے پیچھے کی طرف پلٹ جائے وہ اللہ کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔

اس اجتماع پر جس میں آدھے مرعوب اور آدھے مجذوب تھے، دکھی دل سے اٹھنے والی تند و تیز گفتگو نے کیا اثرات چھوڑے ہوں گے؟ خدا بہتر جانتا ہے۔ درجہ اول کی روایات و اسناد اور تاریخ، مبہم اشاروں کے علاوہ کچھ نہیں بتاتی۔ اگر انہوں نے ان اثرات کو اپنے سینے میں محفوظ کیا بھی تو یار لوگوں کے ہاتھ سے محفوظ نہ رہ سکے اور ہم تک نہ پہنچ سکے۔ مسلم ہے کہ رسول اللہ کی بیٹی ان کے شوہر اور رسول خدا کے چچا زاد بھائی کی باتوں کا اس مجمع کے افراد پر ضرور اثر ہوا ہو گا اور اس کا رد عمل سامنے آیا ہو گا۔ (کیوں نہ اثر ہوتا) اس وقت تک لوگوں کے پاس جو کچھ تھا وہ سب رسول اللہ کی برکت اور صدقے میں تھا۔ اسی رسول کی کل وفات ہوتی ہے اور آج اسی کی پیاری بیٹی کا حق چھین لیا جاتا ہے۔

اگر (مسجد نبوی میں) اس اجتماع میں موجود مہاجرین اپنی مصلحت کی خاطر خاموش رہے ہوں تو ٹھیک ہے لیکن انصار تو ایسے نہ تھے۔ انہوں نے سقیفہ میں اپنی ناراضگی کا اظہار کر دیا تھا اور ان کی تنقید ایک اچھا محرک تھی۔

بہر حال ہمیں معلوم نہیں کہ انہوں نے کیا کہا اور کیا سنا۔ انہوں نے ہاں میں ہاں ملائی یا مخالفت کی؟ انہوں نے صرف افسوس اور اظہار ہمدردی کرنے پر اکتفا کیا یا کوئی عملی قدم بھی اٹھایا؟ اللہ جانتا ہے شاید انہوں نے کہا ہو کہ جو ہونا تھا وہ ہو گیا، اب حکومت برسرِ اقتدار ہے۔ اس کے ہاتھ مضبوط کرنے چاہئیں۔ مسلمانوں کی مصلحت اسی میں ہے کہ اگر دلی طور پر ایک نہ ہوں تو یک زبان ضرور ہونا چاہیے، کیونکہ مدینے کے علاوہ سب جگہوں سے سرکشی و بغاوت کی بو آ رہی ہے۔

جیسا کہ مورخین نے لکھا ہے (۱) اس اجتماع میں ابو بکر نے جناب فاطمہ زہراء (س) کا جواب

اس انداز سے دیا۔

اے رسول خدا کی بیٹی! تمہارے باپ مومنین کے غمخوار اور ان پر مہربان تھے۔ وہ کافروں کے دشمن اور ان پر قہر الہی کے مظہر تھے۔ اگر ہم نسب کو دیکھیں تو وہ تمہارے باپ تھے نہ کہ دوسری عورتوں کے۔ تمہارے شوہر کے وہ چچا زاد بھائی تھے نہ کہ دوسروں کے۔ پیغمبر کی نظروں میں تمہارا شوہر سب رشتہ داروں سے برتر اور تمام بڑی مہمات اور امور میں رسول کا مددگار رہا ہے۔ سعادت مند انسان کے سوا تمہیں کوئی دوست نہیں رکھتا ہے اور پست فطرت انسان کے سوا تم سے کوئی دشمنی نہیں کرتا۔

تم دنیا میں ہمارے رہبر اور بہشت کے راستوں کے راہنما ہو۔ مجھے کیا حق پہنچتا ہے کہ میں تمہارے چچا زاد کو خلافت سے روکوں! فدک اور جو کچھ تمہارے باپ نے تمہیں دیا ہے اگر تمہارا حق ہے اور میں نے چھینا ہے تو میں ظالم اور ستم گر ہوں۔ لیکن میراث کے بارے میں جانتی ہو تمہارے باپ نے کیا کہا ہے: ہم پیغمبروں کی کوئی میراث نہیں ہوتی جو کچھ ہمارے بعد باقی بچے وہ صدقہ ہے۔

جناب فاطمہ (س) نے جواب دیا:

لیکن خداوند متعال قرآن میں دو نبیوں کے بارے میں فرماتا ہے: بِرَثْنِیْ وَ بِرَثِ مَنْ اٰلِ یَعْقُوبَ (مریم ۷) مجھ سے اور آل یعقوب سے وہ ارث پائے گا حَٰوِرَتِ سُلَیْمٰنَ دَاوُدَ (نحل ۱۷) اور سلیمان نے داؤد سے ارث پائی۔ یہ دو پیغمبر ہیں۔ انہوں نے ارث چھوڑی یا ارث پائی؟ جو چیز وراثت سے نہیں ملتی وہ رسالت اور نبوت ہے نہ کہ مال و جائیداد۔ میرے باپ کی ارث مجھ سے کیوں لیتے ہو۔ کیا کتاب الہی میں محمد کی بیٹی فاطمہ (س) اس حکم سے خارج ہو گئی ہے؟ اگر ایسی آیت ہے تو بتاؤ تاکہ میں اسے قبول کر لوں۔

حضرت ابو بکر نے کہا:

(۱) بلاغات النساء

رسولؐ کی بیٹی آپ کی بات واضح اور روشن ہے۔ آپ کی منطق زبان نبوت ہے۔ کسی کی کیا مجال کہ وہ آپ کی بات ٹھکرائے۔ میرے جیسا آپ پر کیا اعتراض کر سکتا ہے؟ آپ کے اور میرے درمیان آپ کے شوہر ثالث ہیں وہ فیصلہ کریں گے۔ (۱)

لیکن ابن ابی الحدید نے اس خطبے کا رد عمل دوسری طرح بیان کیا ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ جناب زہرا (س) کے خطبے کا حضرت ابو بکر نے یہ جواب دیا:

اے پیغمبر کی بیٹی! خدا کی قسم انسانوں میں آپ کے والد سے زیادہ کوئی مجھے محبوب نہیں ہے۔ جس دن آپ کے والد کی رحلت ہوئی میرا دل چاہتا تھا کہ آسمان زمین پر گر پڑے۔ بخدا میں پسند کرتا ہوں کہ عاقلہ غریب ہو جائے لیکن تو محتاج نہ ہو۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں سب کو حق دوں اور تم پر ظلم روا رکھوں۔ تو رسول خداؐ کی بیٹی ہے۔ یہ رسول اللہؐ کی ذاتی ملکیت نہیں تھا بلکہ سارے مسلمانوں کا مال تھا۔ آپ کے والد اسے راہ خدا میں خرچ فرماتے تھے اور اس ذریعے سے حاجت مندوں کی ضروریات پوری کرتے تھے۔ ان کی وفات کے بعد میں بھی انہی کی سیرت پر چلوں گا۔

فاطمہ (س): خدا کی قسم! اب میں کبھی تم سے بات نہیں کروں گی۔ خدا کی قسم! میں تمہیں ہر گز معاف نہیں کروں گی۔ خدا کی قسم! تجھ پر نفیرین کروں گی۔ خدا کی قسم! تیرے حق میں کبھی دعا نہیں کروں گی۔ (۲)

نیز ابن ابی الحدید محمد بن زکریا سے حدیث نقل کرتے ہیں کہ جب ابو بکر نے دختر رسولؐ کا خطبہ سنا تو انہیں بڑا غصہ آیا وہ منبر پر گئے اور کہا:

اے لوگو! کیوں تم ہر بات سن لیتے ہو؟ کیوں پیغمبرؐ کے زمانے میں یہ خواہشات نہ تھیں؟ جس کسی نے پیغمبرؐ کرم سے ایسی بات سنی ہے وہ بتائے۔ جس نے دیکھا ہے وہ گواہی دے۔ لومڑی کی گواہ اس کی دم ہے۔ یہ فتنے کی ٹھنڈی آگ کو پھر بھڑکانا چاہتے ہیں۔ بچاروں سے مدد طلب کر رہے ہیں۔ عورتوں کا سہارا لے رہے ہیں۔ ان کی مثال

(۱) بلاغات النساء طبع بیروت ص ۳۱-۳۲

(۲) شرح نہج البلاغہ ص ۲۱۴

ام طحال (۱) جیسی ہے۔ اگر میں چاہوں تو بول سکتا ہوں، اگر بولوں تو علی الاعلان کہوں گا لیکن وہ اگر مجھے چھوڑ دیں تو میں بھی منہ بند کر لوں گا۔

اے انصار! میں نے تمہاری بھی جاہلانہ باتیں سنی ہیں! تمہیں دوسروں سے زیادہ فرمان رسولؐ کا خیال رکھنا چاہیے! یہ تم ہی تھے جنہوں نے آنحضرتؐ کو پناہ دی اور ان کی نصرت کی۔ میں اپنی زبان اور ہاتھ کو اُن افراد کے بارے میں باز رکھوں گا جو سزا کے مستحق نہیں ہیں۔ ان باتوں کے بعد نبی زادی اپنے گھر واپس چلی گئیں۔

ابن ابی الحدید کہتے ہیں:
میں نے یہ گفتگو نقیب ابو یحییٰ، بن ابو زید بصری کو سنائی اور پوچھا: ابو بکر نے کنایہ سے کس طرف اشارہ کیا ہے؟
یحییٰ: اس نے کنایہ میں نہیں بلکہ واضح کہا ہے۔
اگر واضح ہوتا تو میں تم سے سوال نہ کرتا۔
وہ مسکرایا اور کہا: اس کی مراد علیؑ تھے۔
یہ سب سخت باتیں علیؑ کے لئے تھیں؟
ہاں! میرے بیٹے آخر حکومت حکومت ہے۔
میں نے پوچھا: انصار نے کیا کہا تھا؟

انہوں نے علیؑ کی حمایت کی تھی۔ لیکن علیؑ کو ڈر تھا کہ کہیں فتنہ دوبارہ نہ کھڑا ہو جائے اس لئے انہیں منع کیا۔ (۲)

کیا یہ سچ ہے کہ اس دن خلیفہ نے ایسی باتیں کہی ہیں؟ کیا فاطمہ (س) مسجد میں موجود تھیں اور انہوں نے سنا کہ ان کے شوہر، پیغمبرؐ کے چچا زاد بھائی، مسلم اول کی یوں چٹک اور بے عزتی کی گئی؟ کیا مصلحت اندیشی اور تدبر اسے اس بات کی اجازت دیتا تھا کہ خلیفہ مسلمانوں کے اجتماع میں ایسی باتیں کرے گا؟ اگر یہ باتیں کی گئیں تو حاضرین کا رد عمل کیا تھا؟ کیا وہ خاموش رہے یا کھڑے ہو کر ٹوکا؟ کیا یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ الفاظ گھڑے گئے ہیں...؟ ابن ابی الحدید اور نقیب بصری شیعہ نہیں تھے۔ پس یہ باتیں صرف شیعہ ذرائع سے نقل نہیں ہوئیں۔ کیا یہ بھی نہیں کہا جاسکتا کہ معتزلیوں نے

(۱) عصر جاہلیت کی ایک فاحشہ عورت تھی۔

(۲) شرح نوح البلاغ ج ۱۶ ص ۲۱۳-۲۱۵

یہ کہانی بنائی ہے اور اسے خلیفہ کی طرف منسوب کر دیا ہے؟ یہ بات نہیں ہے کیونکہ ایسا کرنے سے انہیں کیا فائدہ حاصل ہوتا۔

البتہ اس کے رد عمل میں کچھ کہا گیا ہو، یہ ہرگز بعید نہیں ہے۔ کیا اس کے متعلق یہ کہا جاسکتا ہے کہ بعد میں پیدا ہونے والی مخالفت سے ممانعت اس کا سبب بنی کہ مرکزی طاقت نے اپنے ہر مخالف کے ساتھ شدید رویہ اختیار کیا؟

اگر ان سب سوالوں کے قطعی جواب نہ بھی مل سکیں پھر بھی ایک نکتہ واضح ہے وہ یہ کہ پیغمبر اسلام کی رحلت مسلمانوں کے لئے بہت بڑی آزمائش تھی۔ قرآن نے پہلے ہی مسلمانوں کی توجہ اس آزمائش کی طرف دلائی کہ اگر محمدؐ شہید یا فوت ہو جائیں تو کہیں تم دین سے پھر نہ جانا اور سابقہ دین کی طرف پلٹ نہ جانا۔

جو کچھ انہوں نے ان ایام میں کیا اور انجام دیا اس کے حق میں ان کے طرفداروں، حکومتی اداروں اور کارندوں نے اولہ بیان کی ہیں اور کر رہے ہیں۔ وہ ان کے اقدامات کو مسلمانوں کی مصلحت سے سازگار بنانا چاہتے ہیں کہ کلمہ کی وحدت کی حفاظت ضروری ہے۔ اگر نئی حکومت کے خلاف چند گروہ اٹھ کھڑے ہوں تو مرکزی طاقت کمزور ہو جائے گی، جیسے بھی ممکن ہو انہیں مسلمانوں کی اکثریت کے ساتھ ملایا جائے۔ اسلام کا دیرینہ دشمن ابوسفیان موقع کی تلاش میں ہے اور اس نے سازش تیار کر لی ہے۔

وہ کبھی حضرت علیؑ کے پاس جاتا ہے کبھی عباس کے پاس۔ وہ رسولؐ کے ان دو قریبی رشتہ داروں کو خلیفہ کے خلاف بھڑکاتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ یہ خلیفہ کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں۔ اگر ابوسفیان کامیاب ہو جائے اور مدینہ میں مسلمان دو گروہوں میں بٹ جائیں اور انصار مہاجرین کے مقابلے میں آجائیں تو بہت بڑی تباہی ہوگی۔ قبیلہ خزرج کا سردار سعد بن عبادہ خلافت پر نظریں جمائے ہوئے ہے۔ اس نے ابھی تک خلیفہ کی بیعت نہیں کی ہے۔ مسلمانوں کی قیادت و رہبری کے لئے انصار اپنے آپ کو مہاجرین سے زیادہ اہل سمجھ رہے ہیں۔ اگر ابتداء میں حکومت سختی نہ کرے تو ہر روز ایک نیا ہنگامہ اٹھ کھڑا ہو۔^(۱)

پہلے دن سے لے کر آج تک اس قسم کی سینکڑوں توجیہات اور تاویلات بارہا بیان کی جا چکی ہیں۔ ان کے الفاظ اور عبارتیں مختلف ہیں، لیکن مفہوم ایک ہی ہے۔ جو چیز مسلم ہے، وہ یہ ہے کہ بہت کم افراد ایسے ہوں گے جو سیاسی اور اقتصادی حالات کے بدلنے سے اپنی منطق و گفتار کو تبدیل نہ کریں اور اسے حالات کے مطابق نہ ڈھالیں۔ جیسا کہ میں نے دیگر مقامات پر لکھا ہے^(۱) کہ یہ کہا

(۱) ناطقۃ الزہراء۔ عباس عتاد ص ۵۷

جاسکتا ہے کہ اس وقت اس حکومتی گردہ نے ایسے سخت اقدامات کو مناسب سمجھا اور اپنے خیال میں انہیں مسلمانوں کی اصلاح اور بھلائی کی خاطر انجام دیا۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ مسلمانوں کے فائدے میں تھے یا نہیں؟ یہ خود ایک بحث طلب مسئلہ ہے۔

انہوں نے اپنے طور پر یہ چاہا کہ اختلاف و انتشار پیدا نہ ہوں۔ فتنہ و فساد برپا نہ ہو یا کم از کم انہوں نے اپنے کردار کی یوں توجیہ کی۔ لیکن جیسا کہ ہم نے لکھا ہے اگر ایک معاشرے میں ایک مسلم اصول (خواہ جس نیت سے بھی ہو) تبدیل کر دیا جائے تو آنے والوں کے لئے دیگر اصولوں سے انحراف اور ان میں تغیر و تبدل کے لئے مثال بن جاتا ہے۔ افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ مسلمانوں کی بعد میں آنے والی نسلیں پہلے مسلمانوں کی طرح ایثار و قربانی کا جذبہ نہیں رکھتی تھیں۔ اگر ان میں وہی جذبہ موجود ہوتا تو آج مسلمانوں کا رنگ کچھ اور ہوتا۔

کتابوں میں ملتا ہے کہ جب فاطمہ زہراء (س) نے اپنے دعویٰ کے جواب میں اس قسم کی باتیں سنیں تو وہ دل آزرده اور غضبناک ہو کر گھر چلی گئیں اور اپنے شوہر سے یوں کہا:

يَا بْنَ أَبِي طَالِبٍ اشْتَمَلْتُ شَمْلَةَ الْجَنِينِ وَقَعَدْتُ
حُجْرَةَ الظَّالِمِينَ. نَقَضْتُ قَادِمَةَ الْأَجْدَلِ .
فَخَاتَكَ رِيْشُ الْأَعْزَلِ. هَذَا ابْنُ أَبِي قُحَافَةَ
يَنْتَزِي بِحُلَّةِ أَبِي. وَبَلِيغَةَ ابْنِي. لَقَدْ أَجْهَرَ فِي
خِصَامِي. وَ الْفَيْئَةُ الْدَفِي كَلَامِي. حَتَّى حَبَسَنِي
قَبْلَةَ نَصْرَهَا وَالْمُهَاجِرَةَ وَصَلَهَا. وَغَضِبَ
الْجَمَاعَةُ دُونِي طَرَفَهَا فَلَا دَافِعَ وَلَا مَانِعَ
خَرَجْتُ كَأُطَمَّةٍ. وَغَدْتُ رَاغِمَةً. أَضْرَعْتُ
خَذْلَكَ يَوْمَ أَضَعْتُ خَذْلَكَ. افْتَرَسْتُ الدُّنَابَ
وَاسْتَرَسْتُ التُّرَابَ. مَا كَفَفْتُ قَائِلًا وَلَا أَغْنَيْتُ
بِاطْلًا وَلَا خِيَارَ لِي.

لَيْتَنِي مِثْ قَبْلَ هُنَيْتِي وَدُونَ ذُلِّي. عَدِيرِي اللَّهُ
مِنْكَ عَادِيًا وَمِنْكَ حَامِيًا وَبِلَايَ فِي كُلِّ

کاش میں اس ذلت و خواری سے پہلے مر گئی ہوتی اور
خلیفہ کے ظالمانہ رویے کو نہ دیکھتی۔ اگر میں نے آپ
سے کوئی سخت بات کہی ہو یا اس وجہ سے کہ آپ نے

شَارِقٍ. وَيَلَايَ مَاتَ الْعَمْدُ. وَوَهَبَ الْعَصْدُ.
وَشَكَوَايَ إِلَى أَبِي وَعَدَوَايَ إِلَى رَبِّي. اَللّٰهُمَّ
اَنْتَ اَشَدُّ قُوَّةً. فَاجَابَهَا اَمِيرُ الْمُؤْمِنِينَ: لَا وَيْلَ
لَكَ. بَلِ الْوَيْلُ لَشَانِيكَ.

نَهَبْنِي عَنْ وَجْدِكَ يَا بَنَةَ الصَّفْوَةِ. وَبَقِيَّةَ النُّبُوَّةِ
فَمَا وَنَيْتَ عَنْ دِينِي وَلَا اَخْطَا تُمَقْدَرِي فَإِنْ
كُنْتَ تُرِيدِينَ الْبُلْغَةَ فَرَزَقْكَ مَضْمُونٌ .
وَكَفَيْلُكَ مَأْمُونٌ وَمَا أَعْدَلُكَ خَيْرٌ مِمَّا قُطِعَ
عَنْكَ. فَاحْتَسِبِي اللَّهَ فَقَالَتْ حَسْبِيَ اللَّهُ وَنَعْمَ
الْوَكِيلُ.

میری مدد نہیں کی اور میں نے آپ سے شکوہ کیا تو میں
خدا کی بارگاہ میں معافی کی طلب گار ہوں۔ افسوس کہ
میری کمر ٹوٹ گئی، میرے ساتھی میرا ساتھ چھوڑ گئے۔
خدا کی قسم میں اپنے بابا سے شکایت کروں گی اور خدا
سے انصاف طلب کروں گی۔ اے میرے اللہ! تیری
قدرت و طاقت سب پر حاوی ہے۔ علی نے ان کے جواب
میں فرمایا:

اے مصطفیٰ کی لخت جگر! سردار انبیاء کی نشان! پریشان اور
غمزہ نہ ہوں۔ وائے آپ کے دشمن پر ہے، نہ کہ آپ
پر۔ خاک آپ کے بد زبان دشمن کے منہ میں ہو۔ میں
نستی، کاہلی یا بزدلی کی وجہ سے گھر میں نہیں بیٹھ رہا بلکہ
میں نے جو کچھ بہتر سمجھا وہی کیا ہے۔ اگر روٹی اور رزق
کا مسئلہ ہے تو وہ محفوظ ہے۔ جس نے روزی دینے کا وعدہ
کیا ہے وہ وعدہ ظانی نہیں کرتا ہے۔ آپ اس مسئلہ کو
خدا پر چھوڑ دیں۔ سیدہ (س) نے فرمایا: میں نے خدا پر
چھوڑ دیا۔ وہی میرے لئے کافی اور وہ بہترین حمایت کرنے
والا ہے۔

اس گفتگو کو ابن شہر آشوب نے سند کا ذکر کیے بغیر اپنی کتاب مناقب میں نقل کیا
ہے۔ (۱) اور یہی مکالمہ مختصر اختلاف کے ساتھ بحار الانوار (۲) میں بھی مذکور ہے۔ کیا اس قسم کی گفتگو
جناب فاطمہ (س) اور علی کے درمیان واقع ہوئی؟ ایسا کیونکر ممکن ہے؟ شیعہ تو ان دو ہستیوں کے بارے
میں عصمت کا عقیدہ رکھتے ہیں تو کیا یہ قبول کیا جاسکتا ہے کہ دختر رسول اس طرح اپنے شوہر کی
سرزنش کرے؟ اور وہ بھی بچوں کے روٹی پانی کے لئے؟ بدیہی ہے کہ اس کا جواب دیا جاسکتا ہے اور
اس کلام کی تاویل کی جاسکتی ہے لیکن اگر ہم بحث میں الجھ گئے اور اعتراضات اور ان کے جوابات
دینے لگ گئے تو منطقی و استدلالی بحث کا دامن بہت دور تک پھیل جائے گا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ
فریقین میں کس کے دلائل زیادہ وزنی ہیں اور کون زیادہ بات کرنے کا ماہر ہے یا وہ کس طرح
روایت کو اپنے حق میں موڑ سکتا ہے اور اپنے مطلب کی تائید میں ان کی کس طرح تاویل اور توجیہ
کر سکتا ہے؟ یہ طریقہ کار تاریخ کے محققین کے دائرے سے باہر ہے۔

جو چیز ہمارے پیش نظر ہے وہ یہ ہے کہ رسول اللہ کی بیٹی سے منسوب یہ کلام معنوی اور
لفظی آرائش سے مزین ہے۔ استعارہ، تشبیہ، کنایہ، مسجع عبارات کی بہتات ہے۔ اس کلام میں اگر
خطبہ ان ادبی خوبیوں سے آراستہ ہو تو اس کا زیور ہے اور ایسی بات جو ایک مجمع میں کہی گئی ہو اسے
واقعاً ایسا ہونا چاہیے کہ دلوں میں اتر جائے۔ اس قسم کے خطاب میں خطیب کو معنویت، مفہوم اور زیبائی
پر توجہ رکھنے کے ساتھ لفظی زیبائش و زینت پر بھی متوجہ رہنا چاہیے۔ لیکن میاں بیوی کے درمیان گلہ
شکوہ ایسا کیونکر ہونا چاہیے؟ کیا رسول اللہ کی بیٹی اپنی خطابت کی دھاک اپنے شوہر پر بٹھانا چاہتی تھیں

یا فن خطابت سے انہیں مرعوب کرنا چاہتی تھیں؟ بہر حال اس بارے میں اگر مگر ہو سکتا ہے لیکن حقیقت کا علم خدا ہی کے پاس ہے۔



(۱) مناقب ابن شمر آشوب ج ۲ ص ۲۰۸

(۲) بحار ج ۳۳ ص ۱۳۸

صُبْتُ عَلَى مَصَائِبَ لَوَانَهَا صُبْتُ عَلَى الْإِيَامِ صِرْنَ
لَيَالِيَا

(جناب زہرا (س))

مجھ پر ایسی مصیبتیں پڑی ہیں کہ اگر وہ دنوں پر پڑتیں تو وہ راتیں
بن جاتیں۔

باپ کی رحلت، شوہر کی مظلومیت، حق کا چھن جانا اور سب سے بڑھ کر رسول خدا کی
رحلت کے چند ہی روز بعد سنت میں مسلمانوں کی تبدیلیاں اور رد و بدل جیسے عوامل نے حضرت
فاطمہ (س) کے روح اور جسم کو سخت آزرده اور کبیدہ خاطر کر دیا۔ جیسا کہ تاریخ بتاتی ہے کہ باپ
کے انتقال سے پہلے انہیں کوئی جسمانی بیماری نہ تھی۔

کوئی کتاب یا تحریر بیان نہیں کرتی کہ جناب زہرا (س) اس وقت یعنی رسول کی وفات سے
پہلے بیمار تھیں۔ (۱) بعض معاصرین نے یہ لکھا ہے کہ جناب فاطمہ (س) کا جسم بنیادی طور پر کمزور اور
لاغر تھا۔ (۲)

کتاب فاطمة الزهراء کے مؤلف کی تحریر اگرچہ ان دنوں میں جناب فاطمہ (س) کی بیماری
کی تصریح نہیں کرتی لیکن اس میں اس بات کا اشارہ ضرور ملتا ہے۔ عقادیوں رقم طراز ہیں:
زہرا (س) کا بدن کمزور اور لاغر تھا۔ ان کا رنگ گندمی اور اڑا ہوا تھا۔
باپ نے اپنی بیماری کی حالت میں انہیں دیکھا تو کہا کہ وہ رشتہ داروں
میں سب سے پہلے مجھ سے ملحق ہوں گی۔ (۳)

(۱) انساب الاشراف ص ۳۰۵

(۲) فاطمہ فاطمہ است ص ۱۱۷

(۳) فاطمہ الزہراء ص ۶۶

ان دو مصنفین میں سے کسی نے بھی اپنی روایت کی سند بیان نہیں کی ہے۔

عقاد کی عبارت کا ظاہر اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ جب رسول اکرمؐ نے اپنی بیٹی کو بیمار یا لاغر و نحیف دیکھا تو انہیں مذکورہ خبر دی۔ میں بعض قداماء کی طرح یہ نہیں کہتا کہ فاطمہ زہرا (س) دوسرے عام افراد کی نسبت سے ایک دن میں ایک مہینہ اور ایک مہینے میں ایک سال کے برابر نشوونما پاتی تھیں۔ (۱) لیکن جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے اور مستند روایات بھی بتاتی ہیں کہ جناب زہراؑ نہ بیمار تھیں، نہ کمزور، نہ ان کا رنگ اڑا ہوا تھا اور نہ کوئی اور مسئلہ تھا ان کی بیماری واقعات اور سانحات کے بعد شروع ہوتی ہے۔

اپنے بابا کی وفات کے بعد جتنے دن وہ زندہ رہیں، غمزہ، پریشان، پھر مردہ اور اداس رہیں اور روتی رہیں۔ ان سے اپنے بابا کی جدائی برداشت نہیں ہو سکتی تھی۔ اسی لیے جب انہوں نے اپنے بابا سے اپنی موت کی خبر سنی تو مسکرانے لگیں۔ وہ بابا کے بغیر زندہ رہنے کی بجائے مرجانے میں خوشی سمجھتی تھیں۔

ان لوگوں کے واقعات ہم نے بیان کر دیے ہیں جو ان کے دروازے پر لکڑیاں لے کر آئے اور جو پورے گھر کو گھر والوں سمیت جلا دینا چاہتے تھے۔ جیسا کہ ہم نے ملاحظہ کیا قدیم ترین متون میں یہ واقعہ مذکور ہے۔ صرف یہ واقعہ ان کو اذیت و آزار پہنچانے کے لیے کافی تھا۔ چہ جائیکہ مزید دوسرے ظلم و ستم بھی ان پر توڑے گئے۔ کیا یہ درست ہے کہ نبی کی بیٹی کے بازو پر تازیانے مارے گئے اور ان کے بازو کو زخمی کر دیا گیا؟ کیا وہ زبردستی اندر داخل ہونا چاہتے تھے۔ وہ تو دروازے کے پیچھے تھیں؟ کیا ان کو چوٹ لگی؟ اس ہنگامے اور ہل بازی میں ممکن ہے یہ سانحہ رونما ہوا ہو۔ اگر یہ حقیقت ہے تو انہوں نے کیوں اور کس لئے ایسی سختی کو روا رکھا؟ کس طرح اس واقعہ کو قبول کیا جائے اور اس کی کیا تاویل و توجیہ کی جائے؟

وہ مسلمان جنہوں نے راہ خدا میں اس کی رضا کے لئے اور اپنے دین و عقیدہ کی حفاظت کی خاطر سخت ترین تکالیف اور اذیتیں برداشت کیں۔ جنہوں نے اپنے مال کی پرواہ نہ کی۔ اپنے نزدیک ترین عزیزوں سے رشتے توڑ ڈالے۔ اپنا گھر بار چھوڑ دیا۔ خدا کی خاطر اجنبی ملک اور بیگانے شہر میں ہجرت کی۔ اس کے بعد میدان جنگ میں بارہا اپنی جانیں شہادت کے لئے پیش کیں۔ وہ کس طرح ان واقعات اور مظالم کو دیکھ کر خاموش بیٹھے رہے۔

سچی بات ہے کہ جناب فاطمہ زہرا (س) کے نور نظر حضرت حسینؑ کا کلام کتنا برحق اور سبق آموز ہے:

(۱) روحہ الواعظین ص ۱۳۴

فَإِذَا مُحْصُوا بِالْبَلَاءِ قَلَّ الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ

جب آزمائش کی گھڑی آتی ہے تو دیندار کم رہ جاتے ہیں۔

رسول اللہ کے اعلان نبوت سے لے کر اس تاریخ تک سال اور ہجرت کے بعد دس سال کا عرصہ بیت چکا تھا۔ ان سالوں کے دوران بعض دنیا پرست جن کے پاس اسلام قبول کرنے کے سوا کوئی چارہ کار نہ تھا، اسلام کی پناہ میں آگئے تھے۔ ان میں سے بعض اشخاص تن آسان، جسم پرور، جاہ طلب اور دولت مندوں کی عادتیں رکھنے والے تھے۔ ان کے مزاج پر دین کی پابندیاں ناگوار تھیں۔ اگر انہوں نے اسلام قبول کیا تو صرف اس لیے کہ اس کے سوا ان کے پاس کوئی اور راستہ نہ تھا۔ قریش جو ایک سرکش قبیلہ اور مکہ اور عرب پر حکومت کرنا اپنا حق سمجھتا تھا، فتح مکہ کے بعد جب اس نے اسلام کی بہت بڑی طاقت کے سامنے اپنے آپ کو سرنگوں پایا تو جان کے خوف اور جاہ و منصب کے لالچ میں مسلمان ہو گیا۔ اس کی یہی کوشش تھی کہ وہ اسلام کی قدرت و طاقت کو صرف اپنے قبضہ قدرت میں لے آئے۔ بہت زیادہ حسن ظن اور حقیقت پوشی کی ضرورت ہے کہ ہم یہ کہیں کہ چونکہ یہ افراد ایک یا دو مرتبہ پیغمبر اکرم کی صحبت میں بیٹھے ہیں لہذا محدثین کی اصطلاح میں صحابیت کے درجے پر فائز ہو گئے ہیں۔ نفسانی خواہشات پر انہوں نے قابو پالیا، متقی، پرہیزگار اور سچے مسلمان بن گئے تھے۔

اسلام سے پہلے کی صدیوں میں عربوں کی باہمی رقابت خصوصاً جنوبی اور شمالی عربوں کی آپس میں دشمنی و مخالفت سے ہم آگاہ ہیں۔ (۱) حجاز کے لوگ اپنے صحرائ نشینی کے مزاج کے پیش نظر یثرب کے لوگوں کو، جو قحطانی نسل سے اور کھیتی باڑی کرتے تھے، حقیر اور پست خیال کرتے تھے۔ قحطانیوں یا یثرب میں مقیم جنوبی عربوں نے پیغمبر اسلام کو مکہ سے اپنے شہر مدینہ آنے کی دعوت دی وہ آپ پر ایمان لے آئے اور آپ سے عہد و پیمان باندھا۔ جنگ بدر، احد، خندق اور دوسرے غزوات میں قریش سے انہوں نے معرکے لڑے اور آخر کار ان کے شہر مکہ کو فتح کر لیا۔ قریش کے لیے اپنی یہ ذلت و شکست کسی صورت میں بھی قابل قبول نہ تھی۔ اس کے علاوہ مدینہ کے یہی لوگ سقیفہ میں خلافت پر نظریں جمائے ہوئے تھے (اور خلافت کے دعویدار تھے)۔ صرف ابو بکر کی اس یاد دہانی پر کہ پیغمبر اکرم نے فرمایا ہے کہ امام قریش سے ہونا چاہیے، وہ پیچھے ہٹ گئے (اور اپنے دعویٰ سے دستبردار ہو گئے)۔ انصار جس طرح رسول اللہ کے گرد جمع ہو گئے تھے اگر ان کے اہل بیت کے گرد بھی اس طرح جمع ہو جاتے اور ان کی حمایت کرتے اور اہل بیت کی عزت و احترام برقرار رکھتا تو اس بات کی کون ضمانت دے سکتا تھا کہ ایک مرتبہ پھر قحطانی عدنانیوں کی پیشانی کو زمین پر ٹیک نہ دیتے۔ یہ ایسے

(۱) پس از ہجرت سال اشاعت دوم ص ۳۱

حقائق تھے جنہیں اس وقت کے سیاستدان اور صاحبان اقتدار بخوبی جانتے تھے۔ اگر ہم ان حقائق کو تسلیم کر لیں یا اپنے آپ کو اس خوش فہمی میں مبتلا رکھیں کہ سب اصحاب رسولؐ، ایثار و قربانی میں ایک ہی درجے پر ہیں اور اس قسم کے احتمالات ان کے بارے میں نہیں دیئے جاسکتے ہمارے اس رویے سے حقیقت نہیں بدل سکتی۔

مہاجرین و انصار کے درمیان پیمانہ اخوت و برادری (پیمانہ مواخات) کے بعد عرب کے شمال اور جنوب کے درمیان عداوت و دشمنی وقتی طور پر دب گئی تھی لیکن وفات پیغمبرؐ کے بعد اس دشمنی نے اپنے پر دوبارہ نکالنا شروع کر دیئے تھے مزید آنے والے سالوں میں یہ عداوت اور ابھر کر سامنے آئی۔ چنانچہ تاریخ اسلام سے واقفیت رکھنے والے افراد جانتے ہیں کہ ان دو نسلوں (قططانی اور عدنانی) کے درمیان پورے عالم اسلام میں کشمکش، معصم عباسی کے دور تک، شد و مد کے ساتھ اپنی جگہ باقی رہی۔ میں یہ نہیں کہتا کہ خدا نخواستہ تمام اصحاب رسولؐ کی یہی سوچ اور فکر تھی۔ ان دونوں قبائل (حضری اور قریشی) میں ایسے افراد بھی موجود تھے جو اپنے کردار و گفتار میں خدا کو مد نظر رکھتے تھے نہ کہ دنیا ان کے سامنے تھی۔ ان کی یہ حالت تھی کہ کبھی کبھی حکم الہی کی فرمان برداری اور اطاعت میں اپنے بھائی اور بیٹے کا بھی خیال نہیں رکھتے تھے لیکن ان کی تعداد کم تھی۔ کیا یہ بات آسانی سے قبول کی جاسکتی ہے کہ سہیل بن عمرو، عمرو بن عاص، ابو سفیان اور سعد بن عبد اللہ بن ابی سرح دین کا درد رکھتے تھے؟ بہت زیادہ سادہ اندیشی ہے اگر ہم یہ کہیں کہ جس نے بھی ایک دن یا چند روز یا ایک مہینہ یا ایک سال پیغمبر اکرمؐ کی صحبت میں گزارا، وہ آنحضرتؐ سے منقول اس حدیث میں شامل ہو جاتا ہے: میرے یار و اصحاب ستاروں کی مانند ہیں، ان میں سے کسی ایک کی بھی پیروی کر لو ہدایت پا جاؤ گے۔ مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں کہ یہ حدیث سند اور متن کے لحاظ سے درست ہے یا نہیں، یہ کام محدثین کا ہے۔ جو چیز مسلم ہے وہ یہ ہے کہ ان دنوں میں یا کم از کم اس کے چند سال بعد اصحاب رسولؐ ایک دوسرے کے مقابل صف آرا ہوئے۔ یہ کس طرح کہا جاسکتا ہے کہ جنہوں نے علیؑ کی پیروی کی اور جو طلحہ و زبیر اور معاویہ کے نقش قدم پر چلے اور ان کی اقتداء کی سب راہ راست پر تھے۔

یہ جواب دیا جائے گا کہ خلیفہ اور اس کے یار و اصحاب ابتدائی مسلمانوں (سابقوں) میں سے اور درجہ اول کے مہاجرین میں سے تھے۔ یہ بات درست ہے لیکن خلیفہ اور ایک دو اشخاص کو چھوڑ کر آپ دیکھیں کہ قریش کے علاوہ حکومت کے سر کردہ افراد کون تھے؟ کس قبیلے کے افراد کے کاندھوں پر حکومت کا بوجھ تھا؟ حکومت کی باگ ڈور کن لوگوں کے ہاتھ میں تھی؟ حکومت کے رکن دھرتا افراد کا تعلق قریش کے سوا کس قبیلے سے تھا؟ ہاں! حکومت کی مضبوطی کے لئے تمام قوتیں مجتمع ہوں اور اس قوت و طاقت کے حصول اور برقرار رکھنے کے لئے ہر قسم کی مخالفت کو سرکوب

کر دینا چاہیے اور یہ بات بھی قدرتی امر ہے کہ حالات و شرائط کے بدلنے سے منطق افکار اور نظریات بھی تبدیل ہو جاتے ہیں۔

☆☆☆☆☆

الَّذِينَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَهُمْ
يَخْسِبُونَ أَنَّهُمْ يُحْسِنُونَ صُنْعاً (آل عمران: ۱۰۴)
وہ لوگ جن کی دنیاوی زندگی کی سعی و کوشش سب برباد ہو
گئی اور وہ اس خام خیالی میں ہیں کہ یقیناً اچھے کام کر رہے ہیں۔

دکھوں کی ماری فاطمہ سلام اللہ علیہا بستر بیماری پر ہیں۔ ان کی علالت کے دوران سر بکف
مجاہد اور ہمیشہ جہاد کے لیے تیار وہ مسلمان کہ جن کے پاس جو کچھ تھا وہ سب زہرا (س) کے بابا کی
برکت سے تھا۔ ان میں سے کتنے افراد عیادت اور بیمار پرسی کے لئے آئے؟ کوئی بھی نہیں۔ سوائے دو
آدمیوں کے اور وہ دونوں محروم و مظلوم سلمانؓ اور بلالؓ تھے۔
جو کچھ بھی ہو عورتوں کے دل مردوں کی نسبت نازک ہوتے ہیں۔ ان میں احساس ہمدردی
زیادہ پایا جاتا ہے۔ خصوصاً اس دور میں جب عورتیں سیاسی میدان سے باہر تھیں۔ جو واقعات رونما ہوئے
ان میں وہ بلا واسطہ شریک نہیں تھیں۔
شیخ صدوق اپنی روایت میں جس کی سند جناب فاطمہ بنت حسینؓ بن علیؓ تک پہنچتی ہے، لکھتے
ہیں (۱):

مہاجرین اور انصار کی عورتیں ان کے پاس آئیں لیکن احمد بن ابی طاہر کی
عبارت میں صرف عورتوں (نساء) کا ذکر ہے، مہاجرین اور انصار کا نام
اس نے نہیں لیا ہے۔

اگر مہاجر عورتوں میں سے بھی کسی نے عیادت کرنے والیوں میں شرکت کی تو قطعی بات

(۱) بحار ج ۳ ص ۱۵۸

(۲) بلاغات النساء ص ۳۲

ہے کہ وہ کسی ممتاز مہاجر یا کسی حکومتی عہدیدار کی رشتہ دار نہ تھی۔ البتہ انصار کا مسئلہ دوسرا تھا۔ ان کی پوزیشن دوسری تھی انہوں نے جب پیغمبر اسلام کو اپنے شہر آنے کی دعوت دی۔ اسی وقت سے انہوں نے حضور کے گھر والوں اور اقرباء سے تعلقات استوار کر لئے اور ان سے اپنا رشتہ جوڑ لیا۔ بعد میں اسی تعلق کو زیادہ مستحکم کیا۔

جیسا کہ ہم بعد میں اس کی طرف اشارہ کریں گے۔ ان میں سے اکثریت نے علیؑ اور ان کے بیٹوں اور ان کے خاندان سے اس دوستی کو نبھایا۔ بہر حال ان عورتوں کے پوچھنے پر جو جواب رسول اللہؐ کی بیٹی نے انہیں دیا، وہ اس دور کے لوگوں کی بدلتی ہوئی روحانی حالت کی عکاسی کرتا ہے، جو دوسرے زمانوں سے مماثلت رکھتی ہے۔ جناب فاطمہ (س) نے ان کے مردوں کے کردار کا ان سے شکوہ کیا۔

جناب زہرا (س) کی گفتگو، احوال پرسی کا جواب نہیں بلکہ ایک فصیح و بلیغ خطبہ ہے جو مدینے کے ان دنوں کے حالات کا نقشہ پیش کر رہا ہے۔ ایک چوتھائی صدی بعد پیش آنے والے واقعات کی پیشگوئی کر رہا ہے۔ اس خطبے کا سب سے پرانا نسخہ جو مصنف کی دسترس میں ہے وہ کتاب بلاغات النساء ہے۔ البتہ یہی گفتگو اور خطبہ دوسری کتب جیسے امالی شیخ طوسی، کشف الغمہ، احتجاج طبرسی، بحار الانوار اور دیگر کتابوں میں بھی نقل ہوا ہے۔ میں نے احمد بن ابی طاہر کی عبارت کا فارسی میں ترجمہ کیا ہے اور چونکہ یہ کلام بھی ادبی صنائع سے بھرپور اور مزین ہے، لہذا میں نے کوشش کی ہے کہ اس کا ترجمہ بھی ادبی زیور سے خالی نہ ہو لیکن:

مگر بریزی بحر را در کوزه ای چند گنجد قسمت یک روزہ ای (۱)

عورتیں پوچھتی ہیں: رسول خدا کی بیٹی کیسی ہو؟ بیماری کی کیا حالت ہے؟ جناب فاطمہ (س) فرماتی ہیں: خدا کی قسم تمہاری دنیا اب اچھی نہیں لگتی۔ میں تمہارے مردوں سے بیزار ہوں میں نے ان کے ظاہر و باطن کو آزمایا ہے۔ جو کچھ انہوں نے کیا ہے، میں اس سے نالاں اور ناراض ہوں۔ وہ زنگ آلودہ تلواریں کی مانند ہو گئے ہیں، جس کی دھار کند ہو چکی ہے۔ وہ کبھی آگے بڑھے ہیں اور کبھی پیچھے ہٹ جاتے ہیں۔ ان کے افکار نامعقول ہیں۔ وہ فضول باتوں کے دھنی ہیں۔ انہوں نے غضب الہی خرید لیا ہے اور وہ دوزخ کی آگ میں ہمیشہ رہیں گے۔

كَيْفَ اصْبَحْتَ مِنْ عَلَيَّكَ يَا بِنْتُ رَسُولِ اللَّهِ ؟
اصْبَحْتُ وَاللَّهِ عَائِقَةً لِدُنْيَاكُمْ . قَالِيَّةٌ لِرِجَالِكُمْ .
لَقَفْتُهُمْ بَعْدَ أَنْ عَجَمْتُهُمْ وَهَنَانُهُمْ بَعْدَ أَنْ
سَبَرْتُهُمْ . فَقُبْحًا لِقُلُولِ الْحَدِّ . وَخَوْرِ الْقَنَاقَةِ
وَخَطَلِ الرَّأْيِ ” وَبِنْسَمَا قَلَمْتُ لَهُمْ أَنْفُسَهُمْ أَنْ
سَخِطَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ وَفِي الْعَذَابِ هُمْ خَالِدُونَ .

(۱) شری مولانا رومی طبع میکسن دفتر ۲۱ ص ۴

لَا جَرَمَ لَقَدْ قَلَّدْتُهُمْ رَبَّقْتَهَا . وَشَنَنْتُ عَلَيْهِمْ
عَازَهَا . فَجَدَعَا وَغَفَرَا وَبُعَدَا لِلْقَوْمِ الظَّالِمِينَ .
وَيَحْتُمُّهُمُ أَنِّي رَحَزُحُوها عَنْ رَوَاسِي الرِّسَالَةِ .
وَقَوَاعِدِ النُّبُوَّةِ . وَمَهْبِطِ الرُّوحِ الْأَمِينِ . الطَّبِيبِ
بِأُمُورِ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ . إِلَّا ذَلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ
الْمُبِينُ . وَمَا الَّذِي نَقَمُوا مِنْ أَبِي الْحَسَنِ؟ نَقَمُوا
وَاللَّهِ تَكْبِيرَ سَيْفِهِ وَشِدَّةَ طَائِبِهِ . وَنَكَالَ وَقَعْتِهِ
وَتَنْمِرَهُ فِي ذَاتِ اللَّهِ .

وَتَا اللَّهَ لَوُتَكَ قُورُوا عَنْ زِمَامِ نَبَذَةِ إِلَهِ رَسُولِ اللَّهِ
(ص) لَسَابَرِيهِمْ سَبْرًا سَجَحًا لَا يَكَلُمُ خِشَاشَةً .
وَلَا يَتَنَعَّعُ رَاكِبُهُ . وَلَا يُورِدُهُمْ مَنَهْلًا نَمِيرًا
فَضْفَاضًا تَطْفَحُ صَفْتَاهُ . وَلَا أُصْدِرُهُمْ بِطَانًا قَدْ
تَحَيَّرَ بِهِمُ الرَّئْيُ . غَيْرَ مُتَحَلِّي بِطَائِلٍ . إِلَّا بِغَمْرِ
النَّاهِلِ . وَرَدْعَةِ سُورَةِ السَّاعِبِ . وَلَفْتَحَتْ
عَلَيْهِمْ بَرَكَاتٌ مِنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ ،
وَسَيَاخُلُهُمُ اللَّهُ بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ .
إِلَّا هَلَمَّنْ فَاسْمَعَنَّ .

وَمَا عِشْتُنْ أَرَأَيْتُكَ الدُّفْرُ عَجَبًا . إِلَى أَيِّ لَجَا
اسْتَدْنُوا وَيَأَيَّ عُرْوَةٍ تَمَسُّكُوا؟ ”وَلَبِئْسَ الْمَوْلَى
وَلَبِئْسَ الْعَشِيرُ وَلَبِئْسَ لِلظَّالِمِينَ بَدَلًا“ .
اسْتَبْدَلُوا وَاللَّهِ الدُّنَابِي بِالْقَوَادِمِ . وَالْعَجَزُ
بِالْكَاهِلِ . فَرَعْمًا لِمَعَاطِسِ قَوْمٍ يَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ
يُحْسِنُونَ صُنْعًا إِلَّا إِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُونَ وَلَكِنْ
لَا يَشْعُرُونَ .

میں نے مجبوراً اپنا معاملہ ان پر چھوڑ دیا ہے۔ ظلم و نا انصافی
کی ذلت کا طوق ان کی گردنوں میں ڈال دیا ہے۔ میں
ان مکاروں پر نفرین کرتی ہوں۔ وہ ظالم، شکر اور
رحمت الہی سے دور ہیں۔ دائے ہو ان پر۔ انہوں نے
کیوں حق کو اپنے مرکز پر قائم نہ ہونے دیا؟ اور خلافت
کو نبوت کی بنیادوں پر استوار کیوں نہ ہونے دیا؟ انہوں
نے اس سے رخ پھیرا جو جبرائیل علیہ السلام کے نزول
کا مقام ہے۔ اور علی کے حق میں جو امور دنیا اور دین کا
عالم ہے، یقیناً انہوں نے خسروان مبین اٹھایا ہے۔ خدا کی
قسم انہوں نے اس لیے علی کو پسند نہیں کیا کیونکہ ان
کی تلوار سے زخم کھا چکے تھے، ان کی استقامت اور
ثابت قدمی کو دیکھ چکے تھے۔ انہوں نے دیکھا کہ علی
کس طرح ان پر حملہ آور ہوتا ہے اور خدا کے دشمنوں
سے ساز باز نہیں کرتا ہے۔

واللہ! اگر وہ رختہ اندازی نہ کرتے اور علی کو پیغمبر کی
طرف سے لگائی گئی ذمہ داری کو ادا کرنے دیتے اور
رسول اللہ کی طرف سے منسوب منصب پر انہیں آنے
دیتے تو علی انہیں آہستہ آہستہ راہ راست پر لے آتے۔
ہر ایک کو اس کا حق دلاتے کسی کو کوئی نقصان نہ پہنچتا
اور ہر ایک اپنے کیے کا پھل کھاتا۔ عدالت کے پیا سے
چشمہ عدل و انصاف سے سیراب ہوتے۔ زبردست اور
کمزور ان کی بہادری کے سائے میں طاقتور بن جاتے۔
اگر وہ ایسا کرتے تو زمین و آسمان کی رحمت کے
دروازے ان پر کھل جاتے۔ لیکن افسوس! انہوں نے
ایسا نہ کیا جو کچھ انہوں نے انجام دیا خداوند بہت جلد
انہیں اس کی سزا دے گا اور عذاب میں مبتلا کرے گا۔
آؤ اور میری باتیں غور سے سنو!

کیا عجیب ہے! زمانے کے دامن میں کیا کیا عجیب پوشیدہ
ہیں ہر روز یکے بعد دیگرے کیا کیا عجیب رنگ اور عجیب
باتیں سامنے آرہی ہیں۔ کجا بتاؤ! تمہارے مردوں نے
کیوں ایسا کیا؟ انہوں نے اپنے لئے کیا بہانہ بنایا ہے؟
دوستوں سے غداری کرنے والے، دوستوں کے حق میں
دشمنی کرنے والے اور دوستوں پر ظلم و ستم ڈھانے
والے آخر کار اپنے انجام کو پہنچیں گے۔ اپنے برے
اعمال کی سزا پائیں گے۔ وہ دم دبا کر بھاگ کھڑے
ہوئے ہیں۔ وہ عالم کو چھوڑ کر جاہل کے پیچھے چل پڑے
ہیں۔ ایسے جو قوف فساد پھیلانے والے مردوں پر لعنت
ہو جو اپنے فساد کو نیکی اور بھلائی سمجھتے ہیں۔

وَيَهْدِيهِمْ ۚ أَفَمَنْ يَهْدِي إِلَى الْحَقِّ أَحَقُّ أَنْ يُتَّبَعَ أَمَّنْ لَا يَهْدِي إِلَّا أَنْ يُهْدَىٰ فَمَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُونَ ۚ أَمَّا لِعَمَرَ الْهَكُنِّ لَقَدْ لَقِيتُ فَنَظْرَةً ۚ رَيْثَمَا تَنْتَبِهُ ۚ ثُمَّ اخْتَلَبُوا ظِلَاقِ الْقَعْبِ دَمًا غَبِيظًا ۚ وَ دُعَاةً مُّمْقِرًا هُنَالِكَ يَخْشَرُ الْمُتَبِلُّونَ وَيَعْرِفُ التَّالُونَ غَيْبَ مَا أَسَسَ الْاَوَّلُونَ ۚ

ثُمَّ طَبَّوْا عَنْ أَنْفُسِكُمْ أَنْفُسًا ۚ وَطَامِنُوا لِلْفِتْنَةِ جَاشًا وَأَبْشَرُوا بِسَيْفِ صَارِمٍ ۚ وَبَقَرَحٍ شَامِلٍ وَاسْتَبْدَادٍ مِنَ الظَّالِمِينَ ۚ يَدْعُ فَيَنْكُمُ زَهِيدًا وَجَمْعَكُمْ حَصِيدًا فَيَا حَسْرَةً لَّكُمْ وَ أَنَّىٰ بِكُمْ وَقَدْ ” عَمِيَتْ عَلَيْكُمْ أَنْزَلُكُمْ مُوَهَّاءَ وَأَنْتُمْ لَهَا كَارِهُونَ “ (آیہ ۲۸ سورہ ہود)

دائے ہو ان پر! کیا اس کی پیروی کرنا زیادہ مناسب ہے جو لوگوں کو راہِ راست کی طرف ہدایت کرتا ہے یا اس کی جو خود گمراہ ہے؟ اس بارے میں تم کیا فیصلہ کرتے ہو؟ تمہارے اللہ کی قسم جو انہیں نہیں کرتا چاہیے تھا، وہی انہوں نے کیا۔ فتنہ و فساد کا آغاز ہو گیا ہے۔ اب وہ اپنے کردار کے خطرناک انجام کا کچھ دیر انتظار کریں۔ اس کے بعد انہیں ہوش آئے گا کہ کیا ہنگامے اٹھ کھڑے ہوئے ہیں اور کتنے خون بہائے گئے ہیں۔ زندگی کی لذتیں، زمین کی تمام تر وسعتوں کے باوجود، سب پر حرام ہو جائیں گی۔ اس دن نقصان اٹھانے والوں کی حالت دیکھنے والی ہوگی اور جو آئندہ آنے والے ہوں گے انہیں اپنے بزرگوں کے گناہوں کی سزا ملے گی اور ان کی پیدا کردہ مشکلات میں بے بس و مجبور نظر آئیں گے۔

اب تیار رہو! کیونکہ مصائب و مشکلات کی ہوا چل پڑی ہے اور خدا کی تلوار غضبِ نیامِ انتقام سے باہر آچکی ہے۔ تمہیں وہ ہرگز نہیں چھوڑے گی اور تمہیں اپنے گنہگار کردار تک پہنچا کر دم لے گی۔ اس وقت تمہارا بچتا ہوا تمہارے کسی کام نہ آئے گا۔ تمہاری وحدت کا شیرازہ بکھر جائے گا۔ تمہاری بنیادیں اکڑ جائیں گی۔ افسوس کہ تمہارے پاس بصیرت نہیں ہے۔ تمہاری آنکھیں حقیقت کو نہیں دیکھ سکتیں اور یہ ہم پر کوئی الزام نہیں ہے اگر تم حق کو ناپسند کرتے ہو۔

اگرچہ یہ باتیں اس دن ایک مظلوم، محروم اور دکھیلی خاتون کے گلے شکوے اور دل کی بھڑاس لگتی تھیں، لیکن حقیقت میں خطرے کا اعلان تھیں۔ یہ خطرہ صرف مہاجرین و انصار کے لیے نہیں تھا بلکہ حکمرانوں اور نظامِ اسلام کے مستقبل کے لیے تھا۔ زیادہ مدت نہ گزری تھی کہ نبی کی بیٹی نے مسلمانوں کے اجتماع میں جن خطرات اور ان کے عواقب سے مسلمانوں کو خبردار کیا تھا اور بسترِ بیماری پر جن امور کی پیشگوئی کی تھی وہ وقوع پذیر ہو گئے۔ علی علیہ السلام کو خلافت سے محروم کر کے انہوں نے کہا تھا کہ رسالت اور رہبری ایک ہی خاندان میں جمع نہیں ہونی چاہئیں اور کہا کہ قریش خود خواہ اور برتری کا طالب قبیلہ اسی طرح سرداری و حکمرانی کرے۔ اس وقت اس کے انجام کی طرف ان کی توجہ نہیں تھی۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ سرداری اور قیادت قریش سے بنی امیہ میں منتقل ہو جائے گی اور پھر ابوسفیان کے بیٹوں میں، وہاں سے حکم بن عاص کے خاندان اور مردانیوں کے قبضے میں چلی جائے گی۔ انہیں معلوم نہیں تھا کہ ان کے فیصلے کی جلد بازی کی تیز ہوا عراق اور شام کے درمیان دیرینہ دشمنی کی سلگتی ہوئی چنگاری کو بھڑکا اور اس کے شعلوں کو بلند کر سکتی ہے جو سب کو

اپنی پیٹ میں لے لیں گے۔ انہیں خبر نہ تھی کہ قحطانی اور عدنانی عداوت اور رقابت کا پھر سے آغاز ہو جائے گا اور دو گروہ دست و گریبان ہو جائیں گے اور اس شورش و ہنگامے میں کئی خلفاء کی جانیں تلف ہو جائیں گی اور آخر کار ایسی آگ بھڑکے گی جو تمام عالم اسلام، حجاز، شام اور مشرق کو اپنی پیٹ میں لے لے گی۔

ارشاد الہی ہے:

إِنَّ اللَّهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتَّىٰ يُغَيِّرُوا مَا بِأَنفُسِهِمْ (الرعد: ۱۱)
 اللہ لوگوں کی (موجودہ) حالت اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک وہ خود
 اپنی حالت نہ بدلیں۔

ان تبدیلیوں اور تغیرات اور ان پر مرتب ہونے والے نتائج سے مزید آگاہی کے لیے ہم
 ایک علیحدہ فصل بعنوان ”تاریخ سے عبرت“ بیان کریں گے۔

☆☆☆☆☆

وَإِنَّ لِلْمُتَّقِينَ لَحُسْنَ مَآبٍ ۝ جَنَّاتٍ عَذَبٍ مُّفْتَحَةٍ
لَهُمْ فِيهَا الْآبَاءُ ۝ (س: ۴۹-۵۰)

اور تقویٰ والوں کے لیے یقیناً اچھا ٹھکانا ہے۔ وہ دائمی جنتیں ہیں جن کے دروازے ان کے لیے کھلے ہوں گے۔

فاطمہ زہرا سلام علیہا کتنے دن بستر بیماری پر رہیں؟ صحیح معلوم نہیں ہے۔ باپ کی وفات کے بعد وہ کتنے دن زندہ رہیں؟ یہ بات واضح نہیں ہے۔ کم از کم مدت چالیس دن (۱) اور زیادہ سے زیادہ آٹھ ماہ بیان کی گئی ہے۔ (۲) ان دو اقوال کے درمیان مختلف روایات جو دو ماہ (۳) سے لے کر پچھتر دن (۴) تین ماہ (۵) اور چھ ماہ (۶) کا عرصہ بتاتی ہیں۔

اس اختلاف اور مختلف قسم کی روایات کی وجہ کیا ہے؟ اس سے پہلے ہم نے لکھا ہے کہ اس دور میں واقعات کی تاریخیں ایک ذہن سے دوسرے ذہن میں منتقل ہوئی تھیں اور اس بات کا کون دعویٰ کر سکتا ہے کہ یہ سب نقل کرنے والے غلطی اور اشتباہ سے مبرا تھے۔ یہ صرف اس صورت میں ہے جب دیگر عوامل کارفرمانہ ہوں۔ لیکن ہم جانتے ہیں کہ اس پر آشوب دور میں ابھی مسلمانوں میں سیاسی گردہ بندی اپنی اپنی قوت کے ساتھ باقی تھی، دوسری جانب مسلمان داخلی طور پر مصروف جنگ تھے۔ ان حالات میں کسے فرصت تھی کہ وہ واقعات کی تاریخوں کو درست محفوظ کرنے کی طرف توجہ دیتا۔ فرض کریں کہ اس واقعہ میں ان دو عوامل میں سے ایک بھی دخل نہیں تھا تو اس میں کسی قسم کا شک نہیں ہے کہ وہ سیاسی لوگ اور گردہ جو اس کے بعد برسرِ اقتدار آئے، جہاں تک ان سے

(۱) بحار ص ۱۹۱ ج ۳۳۔ روحۃ الواعظین ص ۱۵۱۔ (۲) الاشیاب ص ۳۹۹۔

(۳) بحار ص ۲۱۳ ج ۳۳۔ (۴) عون المجرات ج ۱ ص ۲۱۲۔

(۵) طبقات ج ۸ ص ۱۸۔ (۶) انساب الاشراف بلاذری ص ۳۰۲۔

بن پڑا انہوں نے واقعات کی تاریخوں میں گڑبڑ کی ہے۔

علامہ مجلسی نے دلائل الامامہ سے نقل کیا ہے کہ اس بیماری کے دوران تین اصحاب میں سے دو آدمی حضرت ابو بکر اور حضرت عمر نے جناب فاطمہ زہرا (س) سے ملنے کی اجازت چاہی، لیکن انہوں نے اجازت نہیں دی۔ علیؑ نے کہا کہ میں نے انہیں کہہ دیا ہے کہ تمہاری ان سے ملاقات کراؤں گا۔ جناب فاطمہ (س) نے کہا: جب ایسا ہے تو یہ آپ کا گھر ہے جیسے آپ کی مرضی۔ (۱) اگرچہ ابن سعد نے لکھا ہے کہ ابو بکر نے فاطمہ (س) سے اس قدر گفتگو کی کہ آخر انہیں راضی کر لیا۔ (۲) لیکن ظاہر اس ملاقات سے مطلوبہ نتائج برآمد نہ ہو سکے۔ رسول کی بیٹی نے ان سے کہا: تم نے نہیں سنا ہے کہ میرے بابا رسول اللہؐ نے فرمایا ہے کہ فاطمہ (س) میرا ٹکڑا ہے، جس نے اسے تکلیف پہنچائی، اس نے مجھے تکلیف پہنچائی ہے؟ انہوں نے جواب دیا: ایسا ہی ہے۔ فاطمہ (س) نے فرمایا: تم نے مجھے اذیت پہنچائی ہے اور میں تم سے ناراض ہوں۔ (۳) یہ سن کر وہ گھر سے چلے گئے۔

امام بخاری نے کتاب صحیح میں بیان کیا ہے:

جب دختر رسولؐ نے خلیفہ سے اپنی میراث کا مطالبہ کیا اور اس نے جواب دیا کہ پیغمبر سے سنا ہے کہ ہماری میراث نہیں ہوتی تو اس کے بعد فاطمہ زہرا (س) نے اس سے مرتے دم تک کوئی بات نہیں کی۔ (۴)

اپنی زندگی کے آخری ایام میں انہوں نے اسماء بنت عمیس، جو مہاجرین حبشہ میں سے تھیں اور ان کے قریبوں میں سے تھیں کو بلا بھیجا۔ جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے کہ اسماء بنت عمیس پہلے حضرت جعفر بن ابی طالب کی زوجہ تھیں۔ جب وہ جنگ موتہ میں شہید ہو گئے تو انہوں نے ابو بکر بن قافہ سے عقد کیا۔

جناب فاطمہ (س) نے اسماء سے کہا: مجھے یہ بات پسند نہیں ہے کہ عورت کی میت پر کپڑا ڈالا جائے اور اس کے بدن کی جسامت اس کپڑے سے نظر آئے۔

اسماء نے کہا: میں نے حبشہ میں ایک چیز دیکھی تھی۔ وہ میں ابھی بنا کر آپ کو دکھاتی ہوں۔ اس کے بعد اس نے چند تازہ اور سبز شاخیں منگوائیں۔ شاخوں کو اس نے ٹیڑھا کیا اور ان پر کپڑا ڈال دیا۔

جناب فاطمہ (س) نے کہا: کیا بہترین چیز ہے۔ یہ عورت کے جنازے کو مرد کے جنازے سے جدا کرتی ہے۔ جب میں مر جاؤں تو مجھے آپ غسل دیں اور کسی کو میرے جنازے کے قریب نہ آنے

(۱) بحار ج ۳ ص ۱۷۰، دلائل الامامہ نیز رجوع فرمائیے: علل الشرائع ج ۱ ص ۱۷۸

(۲) طبقات ص ۱۷ ج ۸۔ (۳) بحار ص ۱۷۱۔ (۴) صحیح بخاری ج ۵ ص ۱۱۷

دیں۔ (۱)

زندگی کے آخری دن انہوں نے پانی منگوایا۔ اپنے جسم کو خوب اچھی طرح دھویا اور غسل کیا نیا لباس زیب تن کیا اور اپنے حجرے میں چلی گئیں۔ اپنی خادمہ سے کہا کہ ان کا بستر حجرے کے درمیان بچھا دے۔ اس کے بعد وہ بستر پر رو بہ قبلہ ہو کر لیٹ گئیں۔ ہاتھوں کو اپنے رخساروں پر رکھا اور فرمایا میں اسی وقت مرنے والی ہوں۔ (۲) علماء شیعہ کے بقول ان کے شوہر علیؑ نے انہیں غسل دیا۔ ابن سعد نے بھی اسی روایت کو اختیار کیا ہے۔ (۳) لیکن جیسا کہ ہم نے بیان کیا ابن عبد البر کہتا ہے کہ فاطمہ (س) نے اسماء بنت عمیس کو غسل دینے کی وصیت فرمائی تھی۔ گویا فاطمہ (س) کو غسل دینے میں اسماء نے حضرت علیؑ کا ہاتھ بٹایا تھا۔

ابن عبد البر نے تحریر کیا ہے کہ جناب فاطمہ (س) نے اس دنیا سے آنکھیں بند کیں تو حضرت عائشہ نے ان کے حجرے میں آنا چاہا تو اسماء نے وصیت کے مطابق انہیں داخل نہ ہونے دیا۔ اس نے اپنے باپ سے شکایت کی: یہ خضعمیہ (۴) عورت میرے اور فاطمہ (س) کے درمیان حائل ہو گئی ہے اور مجھے ان کی میت پر نہیں جانے دیا اور مزید یہ کہ اس کے لئے اس نے جملہ عروسی کی طرح حجرہ سجایا ہے۔

ابو بکر جناب فاطمہ (س) کے حجرے کے دروازے پر آئے اور کہا: اسماء تم کیوں زوجات نبیؐ کو بنت نبیؐ کی میت پر آنے سے روک رہی ہو؟ اور تم نے اس کے لیے جملہ کیوں بنایا ہے؟ اسماء نے جواب دیا: فاطمہ (س) نے مجھے وصیت کی تھی کہ کوئی بھی ان کے جنازے پر نہ آئے اور جو چیز میں نے ان کے تابوت کے لیے بنائی ہے، جب وہ زندہ تھیں تو میں نے بنا کر انہیں دکھائی تھی تو انہوں نے مجھے حکم دیا تھا کہ میں یہ چیز ان کے جنازے کے لیے بناؤں۔ ابو بکر نے کہا: اگر ایسا ہے تو جیسے تمہیں کہا گیا ہے، ویسے ہی عمل کرو۔ (۵)

ابن عبد البر نے لکھا ہے کہ اسلام میں سب سے پہلی خاتون جس کے تابوت پر ایسا پردہ بنایا گیا وہ رسول خداؐ کی بیٹی فاطمہ زہراء (س) تھیں۔ اس کے بعد اسی طرح کا پردہ زینب بنت جحش (زوجہ رسولؐ) کے تابوت کے گرد بنایا گیا۔

(۱) استیعاب ص ۷۵۱۔ طبقات ابن سعد ج ۸ ص ۱۸۔ انساب الاشراف ص ۲۰۵ اور بحار ج ۳۳ ص ۱۸۹۔

(۲) بحار ج ۳۳ ص ۱۷۲ اہل ازہالی شیخ طوسی۔ انساب الاشراف ص ۳۰۲ اور طبقات ج ۸ ص ۱۷۔

(۳) طبقات ابن سعد ج ۸ ص ۱۸۔

(۴) ختم کا تعلق جنوبی عربوں سے تھا۔ یہ وہ علامت تھی جو عدنانی (جس میں قریش بھی شامل ہیں) قطانوں کی کرتے تھے۔

(۵) استیعاب ص ۷۵۱۔ جیسا کہ ہم نے لکھا ہے اس وقت اسماء حضرت ابو بکر کی زوجہ تھیں۔

الَّذِينَ إِذَا أَصَابَتْهُمْ مُصِيبَةٌ قَالُوا إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ
رَاجِعُونَ ﴿١٥٦﴾ (البقرہ: ۱۵۶)

جو مصیبت میں مبتلا ہونے کی صورت میں کہتے ہیں کہ ہم تو اللہ
ہی کے ہیں اور اسی کی طرف ہمیں پلٹ کر جانا ہے۔

شیعہ سیرت نگاروں اور علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ رسول خداؐ کی بیٹی کو رات کے وقت
دفن کیا گیا۔

ابن سعد نے بھی اپنی روایات میں جو اس نے ابن شہاب، عروہ، عائشہ، زہری اور دوسرے
ذرائع سے نقل کی ہیں، کہا ہے کہ فاطمہ زہرا (س) کو رات کی تاریکی میں دفن کیا گیا اور علی علیہ
السلام نے انہیں سپرد خاک کیا۔ (۱)

بلاذری نے بھی اپنی دو روایتوں میں اسی کو بیان کیا ہے۔ (۲) نیز امام بخاری لکھتے ہیں:
ان کے شوہر نے انہیں رات کو سپرد خاک کیا اور ابو بکر کو ان کے
جنازے پر آنے کی اجازت نہ دی۔ (۳)

یعقوب کلینی جو شیعہ علماء اور محدثین کے بزرگان میں سے ہیں، چوتھی ہجری کے آغاز میں
فوت ہوئے۔ انہوں نے اپنی کتاب تیسری صدی ہجری کے دوسرے نصف حصے میں لکھی ہے۔ ان کی
کتاب کو شیعہ متون میں قدیم ترین سند شمار کیا جاتا ہے۔ انہوں نے لکھا ہے:
جب فاطمہ زہرا (س) کی رحلت ہوئی تو حضرت علیؑ نے خفیہ طور پر انہیں دفن کیا اور ان کی قبر کا نشان
مٹا دیا۔ اس کے بعد رسول اللہؐ کے روضے کی طرف رخ کر کے کہا:

(۱) طبقات ابن سعد ج ۸ ص ۱۸-۱۹

(۲) انساب الاشراف ص ۳۰۵

(۳) صحیح بخاری ج ۵ ص ۷۷- بخاری ص ۱۸۳

السَّلَامُ عَلَيْكَ يَا رَسُولَ اللَّهِ عَنِّي. وَالسَّلَامُ
عَلَيْكَ عَنْ ابْنِكَ وَزَاوَرِكَ وَالْبَائِتَةِ فِي
النَّوْرِ بِقَعْنِكَ وَالْمُخْتَارِ اللَّهُ لَهَا سُرْعَةً
الْحَقِ بِكَ. قُلْ يَا رَسُولَ اللَّهِ عَنْ صَفِيَّتِكَ
صَبْرِي وَعَفَا عَنْ سَيِّدَةِ الْعَالَمِينَ تَجَلْدِي.
إِلَّا أَنْ فِي النَّاسِ لِي بِسُنَّتِكَ فِي فُرْقَتِكَ
مَوْضِعٌ تَعَزَّيْ فَلَقَدْ وَسَدْتُكَ فِي مَلْحُودَةِ قَبْرِكَ
وَفَاضَتْ نَفْسُكَ بَيْنَ نَحْرِي وَصَدْرِي. بَلَى
وَفِي كِتَابِ اللَّهِ (لِي) أَنْعَمُ الْقَبُولُ. إِنَّا لِلَّهِ وَأَنَا
إِلَيْهِ رَاجِعُونَ. قَدْ اسْتَرْجَعْتَ الْوَدِيعَةَ. وَأَخَذْتُ
الرَّهْيَنَةَ وَاخْتَلَسْتُ الزُّهْرَاءَ فَمَا أَقْبَحَ الْخَضِرَاءُ
وَالْقُبْرَاءُ. أَمَا حُزْنِي فَسَرَمْتُ

وَأَمَا لَيْلِي فَمُسَهَّدُ. وَهَمْ لَا يَبْرَحُ قَلْبِي أَوْ
يَخْتَارُ اللَّهُ لِي دَارَكَ الَّتِي أَنْتَ فِيهَا مُقِيمٌ. كَمَدُ
مُقْبِحٌ وَهَمْ مُهَيِّجٌ سَرْعَانِ مَا فُرِّقَ بَيْنَنَا وَإِلَى اللَّهِ
أَشْكُو وَتُسْتَبِيكَ ابْنُكَ بِتَطَافُرِ أُمِّكَ عَلَى
هَضْمِهَا. فَاحْفَظْهَا السُّؤَالَ. وَاسْتَخْبِرْهَا الْحَالَ.
فَكُنْ مِنْ غَلِيلٍ مُتَلَجِّجٍ بِصَدْرِهَا لَمْ تَجِدْ إِلَى بَيْتِهِ
سَبِيلًا. وَمَسْتَقُولٌ وَيَحْكُمُ اللَّهُ وَهُوَ خَيْرُ
الْعَاكِمِينَ.

سَلَامٌ مُؤَدَّعٍ لَا قَالٍ وَلَا سَمٍّ. فَإِنْ أَنْصَرَفَ فَلَا
عَنْ مَلَالَةٍ. وَإِنْ أَقِمَ فَلَا عَنْ سُوءِ ظَنٍّ بِمَا وَعَدَ
اللَّهُ الصَّابِرِينَ. وَاهَا وَاهَا وَالصَّبْرُ أَيْمَنُ وَأَجْمَلُ
وَلَوْ لَا غَلْبَةُ الْمُسْتَوِلِينَ لَجَعَلْتُ الْمَقَامَ وَاللَّبْتَ

یا رسول اللہ میری اور اپنی بیٹی کی طرف سے، جو ابھی
آپ کے پاس آئی ہیں، آپ کے نزدیک منوں مٹی تھے
سوئی ہیں، آپ پر درود و سلام ہو۔ اللہ کی مرضی یہی
تھی کہ وہ سب سے پہلے آپ سے ملحق ہو جائیں۔ ان
کے جانے کے بعد میرا صبر تمام ہو گیا، میری ہمت جواب
دے گئی، لیکن جس طرح آپ کی جدائی پر میں نے
صبر کیا، اسی طرح آپ کی بیٹی کی موت پر بھی صبر کے
علاوہ کوئی چارہ نہیں۔ کیونکہ مصیبت پر صبر کرنا سنت
ہے۔ اے رسول خدا! آپ نے اپنی جان میرے سینے پر
جان آفرین کے سپرد کی۔ میں نے اپنے ہاتھوں سے آپ
کو دفن کیا۔ قرآن نے خبر دی کہ زندگی کا آخری
انجام خدا کی طرف یاز گشت ہے۔ اب آپ کی امانت
آپ کے پاس پہنچ گئی ہے۔ زہرا (س) مجھ سے جدا
ہو گئیں اور آپ کے پاس محو آرام ہیں۔ یا رسول اللہ!
ان کے جانے کے بعد میری دنیا اندھیر ہو چکی ہے اور میرا
دل غم سے بھرا ہوا ہے۔ یہ غم مجھ سے بھلایا نہ جائے گا۔

میری نیند اڑ چکی ہے اور دل اس غم کی آگ میں کباب
رہے گا۔ یہاں تک کہ خدا مجھے بھی آپ کے پاس
بلالے گا۔ زہرا (س) کی موت بجلی بن کر مجھ پر گری۔
یہ ایسی چوٹ ہے جس نے میرے دل کو چکنا چور کر دیا۔
جس نے مجھے غم کا دائمی روگ لگا دیا۔ اس نے کتنی
جلدی ہمیں پریشانیوں اور مشکلات میں تنہا چھوڑ دیا۔ میں
اپنی شکایت خدا کی بارگاہ میں پیش کرتا ہوں اور آپ کی
بیٹی آپ کے سپرد کرتا ہوں۔ وہ آپ کو بتائیں گی کہ
امت نے آپ کے بعد ان پر کیا کیا ستم ڈھائے اور کیا
کیا ظلم توڑے۔ جو کچھ پوچھتا ہے ان سے پوچھیں اور جو
کچھ کہتا ہے ان سے کہیں، تاکہ ان کے غم کا بوجھ ہلکا
ہو اور جو خون جگر انہوں نے پیا ہے وہ باہر آئے اور
انہیں سکون میسر آئے۔ خدا ان کے اور ظالموں کے
درمیان فیصلہ کرے گا اور وہ بہترین فیصلہ کرنے والا

ہے۔
آپ پر جو بدیہ سلام بھیج رہا ہوں یہ سلام عقیدت ہے نہ
کہ رنج و ملال کا۔ یہ سلام شوق ہے نہ کہ سستی اور کم
ہمتی کا۔ اگر یہاں سے چلا جاؤں تو رنج و ملال اور
تھکاوٹ کے سبب نہیں اور اگر رہوں تو وعدہ خدا پر
بدگمان نہیں ہوں۔ خدا نے جو تک صابروں سے وعدہ
کیا ہے، لہذا میں اس کے اجر و ثواب کا انتظار کروں
گا۔ سب کچھ اسی کی طرف سے ہے اور صبر کا پھل میٹھا

لِزَامًا مَعْكُوفًا

وَلَا تَعُولُ إِغْوَالَ التَّكْلِ عَلَى جَلِيلِ الرِّزْيَةِ.
فَبَعَيْنِ اللَّهِ تَذَقَّنْ ابْتِكَ سِرًّا وَتَهَضَّمْ حَقُّهَا
وَتَمْنَعُ إِذْنَهَا. وَلَمْ يَتَبَاعِدِ الْمَهْدُ وَلَمْ يُخْلَقْ
مِنْكَ الذِّكْرُ. وَالَى اللَّهِ يَا رَسُولَ اللَّهِ
الْمُسْتَكِي وَلَيْكَ يَا رَسُولَ اللَّهِ أَحْسَنُ الْعَزَاءِ.
صَلَّى اللَّهُ عَلَيْكَ وَعَلَيْهَا السَّلَامُ وَالرَّضْوَانُ

(اصول کافی ج ۱ ص ۳۵۸، ۳۵۹)

ہے۔ اگر مجھے خالوں کی چیرہ دستی کا ڈر نہ ہوتا تو ہمیشہ
آپ کی قبر کے پاس ہوتا اور اس بھاری مصیبت
پر، جو ان بیٹے کی لاش پر پڑی ماب کی طرح آنسوؤں
کے دریا بہاتا۔ خدا گواہ ہے کہ آپ کی بیٹی کو بطور مخفی
لحد میں اتارا ہے۔ ابھی تو آپ کو رحلت فرمائے چند دن
نہ گزرے تھے۔ ابھی تو آپ کا نام مبارک لوگوں کی
زبان پر تھا کہ آپ کی بیٹی کا حق غصب کیا گیا اور ان
کے ترکہ کو ہڑپ کر لیا گیا۔ میں اپنا درد دل آپ سے
بیان کرتا ہوں اور اپنا حال دل آپ کو سناتا ہوں اور
آپ کی یاد میں دل کو خوش رکھتا ہوں۔ آپ پر خدا کا
درود و سلام ہو اور فاطمہ (س) پر درود و خوشنودی۔

اس مشہور روایت کے مقابلے میں ابن سعد ایک روایت نقل کرتے ہیں کہ حضرت ابو بکر
ؓ نے جناب فاطمہ زہرا (س) کے جنازے پر نماز پڑھائی اور چار تکبیریں کہیں۔ (۱) ظاہر ہے کہ یہ اور اس
طرح کی ایک دو اور روایتیں اس مشہور روایت کے مقابلے میں کوئی اہمیت نہیں رکھتیں۔ بعید نہیں
کہ انہیں وقتی مصلحتوں کے پیش نظر جعل کیا گیا ہو۔

سیدہ زہرا (س) کی موت نے علی علیہ السلام کو سخت رنجیدہ خاطر کر دیا۔ اس غم کا کچھ
مشاہدہ ہم نے امیر المومنینؑ کے کلام سے کر لیا جو انہوں نے ان کی قبر کے نزدیک کھڑے ہو کر
رسول خداؐ سے کیا ہے۔ قدیم ترین کتب میں درج ذیل دو اشعار کی نسبت بھی ان کی طرف دی گئی
ہے جو ان کی اندرونی غمزدہ کیفیت کی عکاسی کر رہے ہیں۔ البتہ بعد والے ماخذ اور منابع میں ان اشعار
کی تعداد زیادہ ہے۔ جیسا کہ امیر المومنینؑ سے منسوب دیوان میں ان کی تعداد انیس ہے۔ (۱)

زہیر بن بکار اپنی کتاب الاخبار الموفقیات جسے اس نے تیسری صدی کے دوسرے نصف
حصے میں تحریر کیا ہے اور اس کا شمار قدیمی منابع میں ہوتا ہے، یوں رقمطراز ہے:

مدائنی نے کہا ہے کہ جب امیر المومنین علی ابن ابی طالبؑ جناب
فاطمہ (س) کی تدفین سے فارغ ہوئے تو ان کی قبر پر کھڑے ہو کر دو
اشعار پڑھے:

لِكُلِّ اجْتِمَاعٍ مِنْ خَلِيلَيْنِ فُرْقَةٌ وَكُلُّ أَلَدَى ذُوْنَ الْمَمَاتِ قَلِيلٌ
وَإِنَّ الْفِتَادَى وَاحِدًا بَعْدَ وَاحِدٍ دَلِيلٌ عَلَى أَنِّي لَا يَذُومُ خَلِيلٌ

☆ جب کبھی دو دوست جمع ہوں آخر کار انہیں جدا ہونا ہے اور موت کے علاوہ ہر چیز

(۱) طبقات ابن سعد ج ۸ ص ۱۹

چھوٹی ہے۔

☆ میرے دوست یکے بعد دیگرے مجھ سے جدا ہو رہے ہیں جو اس بات کی دلیل ہے کہ کوئی دوست ہمیشہ کے لیے باقی نہیں رہ سکتا۔
یہ دو اشعار بعض مصادر میں یوں بیان ہوئے ہیں:

لِكُلِّ اجْتِمَاعٍ مِنْ خَلِيلَيْنِ فُرْقَةٌ وَكُلُّ الَّذِي ذُوْنَ الْفِرَاقِ قَلِيلٌ
وَإِنَّ الْفِتْقَادِي فَاطِمًا بَعْدَ أَحْمَدَ ذَلِيلٌ عَلَى أَنْ لَا يَذُومُ خَلِيلٌ

بحار الانوار (طہران) کی آخری اشاعت کے فاضل مصحح نے اس کی جلد ۴۳ کے صفحہ ۱۸۷ پر حاشیے میں ایک عبارت درج کی ہے جس کا ترجمہ یہ ہے:

بعض نسخوں میں وان الفتقادی واحد بعد واحد کا مصرعہ آیا ہے اور یہ درست ہے۔ کیونکہ علی نے ان دو شعروں کے ذریعے تمثیل پیش کی ہے نہ کہ انشاء کیا ہے۔ لیکن زبیر بن بکار کی عبارت یوں ہے: وانشا يقول۔ اس کے علاوہ یہ دو بیت، ان سے منسوب دیوان میں بھی موجود ہیں جس کا ذکر گزر چکا ہے۔

علامہ مجلسی نے لکھا ہے: روایت کی گئی ہے کہ ہاتف نے ان کے شعر کا جواب دیا ہے۔ اس کے علامہ نے چار ابیات لکھے ہیں۔ (۱)

☆☆☆☆☆

وَلَا يَأْتِي الْأُمُورَ تُدْفَنُ لَيْلًا بِضَعَةِ الْمُصْطَفَى وَيُغْفَى
 نَرَاهَا
 محمد مصطفیٰ (ص) کے جگر کے ٹکڑے کو کن اسباب کی وجہ سے
 رات کے وقت دفن کیا گیا اور اس کی قبر کا نام و نشان تک مٹا
 دیا گیا۔

انہائی افسوس کی بات ہے کہ دختر رسولؐ کی قبر بھی نامعلوم ہے۔ جو کچھ بھی ان کی وفات کے بارے میں لکھا گیا اور جو کوشش ان کی وفات کی خبر مخفی رکھنے کے لئے کی گئی، اس کے پیش نظر معلوم ہے کہ قبر کے بارے میں اہل بیت پریشان تھے۔ یہ پریشانی کس لئے تھی؟ صحیح طور پر کچھ نہیں معلوم۔ اس کا ایک پہلو ممکن ہے جناب زہرا (س) کی وصیت کو عملی جامہ پہنانا تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھیں کہ جن سے وہ ناراض تھیں وہ ان کے نماز جنازہ اور تدفین میں شریک ہوں، لیکن قبر کے نشانات کو کیوں مٹا دیا گیا؟ یا انہیں سپرد خاک کرنے کے بعد قبرستان بقیع یا ان کے گھر میں سات یا چالیس قبروں کی شکلیں کیوں بنائی گئیں؟ کیوں ان کے مزار کو مخفی رکھنے کے لیے اس قدر اہتمام کیا گیا؟ اگر سن چالیس ہجری کو فرزند ان زہرا (س) نے اپنے باپ کی قبر کو لوگوں سے خفیہ رکھا تو اس کی وجہ دشمنوں کی طرف سے بے حرمتی کا ڈر تھا۔ لیکن حضور اکرمؐ کی رحلت کے چالیس دن یا زیادہ سے زیادہ آٹھ ماہ بعد مدینے کے حالات کو چالیس ہجری میں کوفہ کے حالات کو ایک طرح اور یکساں قرار نہیں دیا جاسکتا۔

وہ لوگ جو سیاسی مسائل اور جاہ و منصب کے حصول کی خاطر علیؑ سے ستیزہ کار تھے، وہ لوگ نہ تھے جو گیارہ ہجری کو مدینے میں موجود تھے۔ مدینے میں رہنے والے لوگ علی علیہ السلام کو فاطمہ زہرا (س) سے الگ دیکھتے تھے۔ ظاہری طور پر ہی سہی، وہ رسول خداؐ کی بیٹی کا احترام کرتے تھے اور مسلم ہے وہ قبر کے ساتھ کوئی گستاخی نہ کرتے۔ لیکن میں یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ ان کے مزار

سے لایا جی کا موجب راویوں کی فراموشی یا زمانے کا گزرنہ ہے۔ کیونکہ آنحضرتؐ کے دو صحابیوں کی قبریں آپؐ کے روضے کے ساتھ مشخص اور معین ہیں۔ اسی طرح فاطمہ زہرا (س) کے بیٹے جو جنت البقیع میں محو آرام ہیں کے مزارات بھی تقریباً مشخص کیے جاسکتے ہیں۔ پس جناب زہرا (س) کا مزار پوشیدہ رکھنے کا سبب کوئی اور امر ہے۔ اس کا سبب وہی ہے جس کی طرف گزشتہ فصل میں اجمالی طور پر اشارہ کیا گیا ہے۔ اس کا موجب وہی ہے جسے انہوں نے خود گفتگو میں بیان فرمایا ہے۔ شاید یہ ان کی آخری گفتگو تھی جو ان کی زبان سے جاری ہوئی۔ وہی باتیں جو انہوں نے عیادت کے لیے آنے والی خواتین سے کہی تھیں: ”مجھے تمہاری دنیا سے نفرت ہو گئی ہے اور تمہارے مردوں سے بیزار ہوں۔“ ان کی خواہش تھی کہ ان ناقدر اور حق ناشناس لوگوں کی نظروں سے اوجھل دفن ہوں۔ حتیٰ ان کی قبر کے نشان پر بھی ان لوگوں کی نگاہیں نہ پڑیں۔

ابن شہر آشوب نے ذکر کیا ہے حضرت ابو بکر اور حضرت عمرؓ نے حضرت علیؓ پر اعتراض کیا اور انہیں سرزنش کی کہ انہوں نے دختر رسولؐ کے جنازے میں انہیں شرکت کی کیوں اجازت نہیں دی۔ انہوں نے قسم کھا کر کہا کہ فاطمہ (س) نے یونہی وصیت کی تھی اور ان دونوں نے یہ بات مان لی۔ (۱) البتہ مرحوم کلینی نے احمد بن ابی نصر کی روایت نقل کی ہے اور اس نے امام رضا (ع) سے روایت کی ہے۔ اس میں بیان ہے کہ امام علیؓ سے احمد نے جناب فاطمہ (س) کے محل دفن کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے جواب دیا:

انہیں گھر میں سپرد خاک کیا گیا تھا اور جب بنی امیہ نے مسجد نبوی میں توسیع کی تو یہ قبر مسجد نبوی کے اندر آ گئی۔ (۲)
ابن شہر آشوب نے شیخ طوسی کا قول نقل کیا ہے:
جوابات زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ انہیں گھر کے اندر یا روضہ رسولؐ میں دفن کیا گیا۔ (۳)

اس روایت کے برخلاف ابن سعد جس کا تیسری صدی کے آغاز میں انتقال ہوا، عبد اللہ بن حسن سے روایت کرتے ہیں:

میں نے مغیرہ بن عبد الرحمن بن حارث بن ہشام کو گرم دن میں دوپہر کے وقت بقیع میں کھڑے ہوئے دیکھا۔ میں نے اس سے پوچھا: ابو ہاشم

(۱) مناقب ابن شہر آشوب ج ۱ ص ۵۰۴

(۲) اصول کافی ج ۱ ص ۳۶۱

(۳) مناقب ابن شہر آشوب ج ۳ ص ۳۶۵

اس وقت کیوں یہاں کھڑے ہو؟ اس نے جواب دیا: تیرے انتظار میں تھا۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ فاطمہ زہرا (س) کو اس گھر میں (جناب عقیل کا گھر) جو جحشیتین کے گھر کے ساتھ ہے، سپرد خاک کیا گیا۔ میں تجھ سے تقاضا کرتا ہوں کہ اس گھر کو خریدو اور مجھے یہاں دفن کرنا۔ میں نے جواب دیا: خدا کی قسم یہ کام ضرور کروں گا۔

لیکن جناب عقیل کے بیٹوں نے اس گھر کو فروخت نہ کیا۔ عبد اللہ بن جعفر نے کہا کسی کو کوئی شک نہیں ہے کہ جناب فاطمہ (س) کی قبر یہاں پر ہے۔ (۱)

اگر احمد بن ابی نصر کی روایت کے خلاف قرینہ موجود نہ ہوتا تو قائل قبول تھی لیکن علماء شیعہ نے ایسی روایات نقل کی ہیں جو یہ بتاتی ہیں کہ جناب زہرا (س) کو جنت البقیع میں سپرد خاک کیا گیا۔ اس کے علاوہ انہی روایات میں یہ بات بھی بیان ہوئی ہے کہ دختر رسولؐ کی قبر پوشیدہ رکھنے کے لیے سات نقلی قبریں (۲) اور ایک روایت کے مطابق چالیس نقلی قبریں بنائی گئیں۔ یہ اس بات کا قرینہ ہے کہ قبر مطہر گھر میں نہیں تھی۔ کیونکہ ان کے چھوٹے سے گھر میں اتنی ساری قبریں بنانے کی جگہ کہاں تھی۔ نیز بحار الانوار کی ایک روایت میں آیا ہے کہ جس رات بی بی نے انتقال کیا اسی کی صبح جب مسلمان بقیع میں آئے تو انہوں نے تازہ بنائی گئی چالیس قبریں دیکھیں۔ (۳)

علامہ مجلسی نے دلائل الامامہ سے اور انہوں نے اپنے ذرائع سے امام صادق (ع) سے ایک روایت نقل کی ہے کہ اس دن صبح (بعض) لوگوں نے چاہا کہ جناب زہرا (س) کا جنازہ قبر سے نکال کر اس پر نماز پڑھی جائے۔ لیکن علیؑ کی طرف سے سخت مخالفت اور شدید دھمکی کے بعد انہوں نے اس کام سے صرف نظر کر لیا۔ (۴)

بہر حال حضرت زہرا (س) کی قبر کا حقیقی ہونا چند افراد سے ان کی ناراضگی کا پتہ دیتا ہے اور ظاہر ہے کہ وہ اس ذریعے سے اپنی ناراضگی آشکار کرنا چاہتی تھیں۔

☆☆☆☆☆

(۱) طبقات ج ۸ ص ۲۰

(۲) بحار ص ۱۸۲

(۳) بحار ص ۱۷۱

(۴) ایضاً

برائے عبرتِ تاریخ

خدا کی قسم! اگر وہ مداخلت نہ کرتے اور علیؑ کو وہ فریضہ
انجام دینے دیتے جو رسول خدا نے ان پر عائد کیا تھا تو وہ
آہستہ آہستہ سب کو راہِ راست پر لے آتے اور ہر ایک کو
اس کا حق دے دیتے.... -

اگر وہ ایسا کرتے تو زمین و آسمان کی رحمتوں کے دروازے
ان پر کھل جاتے لیکن انہوں نے ایسا نہ کیا.... -
جو انہیں نہیں کرنا چاہیے تھا وہ انہوں نے کر دکھایا۔ اب
وہ انتظار کریں کہ کتنا خون خرابہ ہو گا اور کتنی جنگیں لڑی
جائیں گی.... -

بہتر بیماری پر جناب سیدہ کے خطبے سے ایک اقتباس

جس دن دختر رسولؐ نے بستر بیماری پر انصار کی عورتوں سے گلے شکوے پر مبنی مذکورہ گفتگو کی اس کے بعد چوتھائی صدی بھی نہ گزری تھی کہ عرب کی پر امن اور متحد سر زمین شورش زدہ اور جنگ و جدال میں تبدیل ہو گئی۔ اسلام سے پہلے کی مخالفتیں اور دشمنیاں جو بیس سال سے زیادہ مدت تک فراموش ہو گئی تھیں یا ان کے اظہار کا موقع نہیں ملا تھا وہ سب عود کر آئیں۔ قبیلہ پرستی اور نسل پرستی کا دور واپس آ گیا۔ دور جاہلیت کے امتیازات کو دوبارہ افکار سمجھا جانے لگا۔ مسلمان دو گروہوں بلکہ چند گروہوں میں بٹ گئے اور انتشار نے دوبارہ اپنا قبیح چہرہ ظاہر کر دیا۔ ایک بار پھر قحطانی اور عدنانی عرب ایک دوسرے کے مد مقابل آ گئے اور ایک دوسرے پر اس طرح ٹوٹ پڑے کہ ”ایام العرب“ (۱) کی یاد تازہ ہو گئی۔

غیر عرب لوگ جو رحمت کی امید یا نعمتوں کے حصول کے لیے مسلمان ہوئے تھے، جزیرۃ العرب کے علاوہ دیگر علاقوں سے عراق کے شہروں جیسے کوفہ، بصرہ یا شمالی علاقوں میں آ کر بس گئے تھے۔ ان میں ہر جماعت یا خاندان قبائلی عہد و پیمان کے ساتھ زندگی گزار رہا تھا۔ جب وہ مطلوبہ اہداف نہ پاسکے یعنی جس چیز کی خاطر انہوں نے دامن اسلام میں پناہ لی تھی وہ انہیں نظر نہ آئی تو انہوں نے اس افراتفری اور کشمکش کی صورت حال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے گروہ بندی شروع کر دی یا ان گروہوں کے ساتھ ہو گئے جہاں ان کے مفادات کی تکمیل ہوتی نظر آئی۔

اس کتاب میں کئی مرتبہ قحطانی اور عدنانی نام لیے گئے ہیں۔ ایک دو جگہوں پر مختصر طور پر ان کے بارے میں وضاحت بھی کی گئی ہے۔

تاریخ اسلام کا مطالعہ رکھنے والے افراد کے لیے ان دو الفاظ کا معنی اور مفہوم واضح ہے۔ لیکن ممکن ہے سب قارئین مصنف کا مقصود نہ سمجھ سکیں یا ان دو الفاظ کا زیر بحث موضوع سے ربط اور تعلق نہ جان سکیں۔ پس مناسب ہے کہ ان دو گروہوں کے بارے میں ذرا تفصیل سے بات کی

قبل از اسلام کی جنگیں جو جزیرہ نما عرب میں مختلف قبیلوں کے درمیان چلی آتی تھیں۔ مختلف دنوں کے ناموں سے موسوم تھیں۔ ملاحظہ فرمائیں۔ مجمع الامثال میدانی لفظ یوم کے تحت۔

جائے۔

اگر آپ عرب کے نقشے پر نگاہ ڈالیں تو جزیرۃ العرب کے جنوبی حصے کے آخر میں ایک مثلث شکل کا علاقہ آپ دیکھیں گے۔ جس کا مشرقی ضلع بحیرہ عرب کا ساحل ہے۔ مغربی ضلع بحیرہ احمر پر مشتمل ہے اور جب آپ ظہران (مغرب میں) سے وادی حضر موت (مشرق میں) تک ایک خط کھینچیں گے تو اس مثلث کا تیسرا ضلع بن جائے گا۔ ان حدود کے اندر ایک علاقہ ہے جسے قدیم زمانے میں خوش بخت عرب یا یمن کہتے تھے۔ آج یہ علاقے شمالی یمن اور جنوبی یمن کے ممالک پر مشتمل ہیں۔

ظہور اسلام سے صدیوں پہلے اپنے مناسب جغرافیائی حالات اور موبھی بارشوں کی بہتات کی وجہ سے یہ علاقہ سرسبز و شاداب اور زرخیز تھا۔ اس کے باشندے کھیتی باڑی اور زمین سے زیادہ سے زیادہ پیداوار حاصل کرنے میں خاص مہارت رکھتے تھے۔ اس علاقے کی سب سے اہم برآمد (کھنڈر) مشہور شاہراہ بخور سے ہوتی ہوئی بندر، صور، صیدا اور ضلع عقبہ کے راستے یورپ پہنچتی تھی۔ وہاں کے عبادت خانوں میں اسے استعمال کیا جاتا تھا۔ اس ذریعے سے جنوبی عرب کے باشندوں کو خاطر خواہ آمدنی ہوتی تھی۔ طبیعی امر ہے کہ سرمایہ حیات (پانی) کی فراوانی، خوشگوار آب و ہوا اور انواع و اقسام کی فصلیں اور پیداوار کے لیے زمین کی آمدگی، لوگوں کے لیے کشش اور جاذبیت کا باعث ہیں، لوگوں کی کشش آبادی میں اضافے کا باعث بنتی ہے اور زیادہ آبادی، مکانات و تعمیرات اور گھریلو زندگی کی ضروریات کو ایجاد کرتی ہے۔ اسی سے ایک گھر، چھوٹا گاؤں، دیہات قصبے اور چھوٹے بڑے شہر وجود میں آتے ہیں۔ اس قسم کی اجتماعی زندگی کا لازماً رفاه و آسائش، تہذیب و تمدن، دولت اور حکومت کا معرض وجود میں آتا ہے۔ جو اس قسم کی معاشرتی زندگی کے مظاہر ہیں۔

انہی مختلف عوامل کے نتیجے کے طور پر ہم دیکھتے ہیں کہ ہزار سال قبل مسیح سے لے کر چوتھی صدی عیسوی تک علاقے میں معین، قنبان، سبا اور حمیر جیسی حکومتوں کی بنیادیں ڈالی گئیں۔ کبھی ان کی حکومتوں کا دائرہ کار اپنے سے دور دراز علاقوں تک پھیل گیا۔ اس لیے یہ بھی ایک فطری امر ہے کہ اس قسم کی مہذب زندگی گزارنے والے لوگ، صحرائنشین، خانہ بدوش عربوں کو غیر تہذیب یافتہ اور غیر متمدن سمجھیں گے یا انہیں کم اہمیت یا بالکل اہمیت نہیں دیں گے۔

جنوبی یا خوشحال عرب کے برعکس عرب کا شمالی علاقہ بے آب و گیاہ سگت ہوا صحرا ہے۔ اس کی سرزمین بجز اور ریت کے وسیع سمندر پر مشتمل ہے۔ اس کی وادیاں ایک دوسرے سے کٹی ہوئی ہیں۔ جیسا کہ ہم نے شروع میں لکھا ہے کہ اس کے رہنے والے ہر وقت سفر میں ہیں اور زندگی کی بقاء کے لیے مسلسل حرکت میں نظر آتے ہیں۔

صحرائی بودوباش اور ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقلی صحرائنشین کو خود غرض، خود پسند، بے پرواہ بنا دیتی ہے۔ شہر اور شہری زندگی کے اصول و قوانین سے اسے بیزار کر دیتی ہے۔ یہاں تک کہ

وہ شہر سے بالکل متنفر ہو جاتا ہے اور اگر کبھی اسے مجبوراً شہر آنا پڑے اور ناچار شہری آداب کا اپنے آپ کو پابند بھی بنانا پڑے تو وہ شہریوں اور شہری زندگی کا مذاق اڑاتا ہے۔

ظہور اسلام سے تقریباً دو صدیاں پہلے جزیرۃ العرب کی معاشرتی زندگی میں ایک بہت بڑا انقلاب رونما ہوا۔ جنوبی علاقے میں آپاشی کے لیے بنائے گئے پانی کے بندوں کی تباہی اور بیرونی حملہ آوروں کی وجہ سے اس علاقے کے لوگوں نے ایک ایک کر کے اپنے گھروں کو خیر آباد کہہ دیا۔ کچھ لوگوں نے شمال کا رخ کیا اور زندگی گزارنے کے لیے مناسب مقامات پر سکونت اختیار کر لی۔ ان ہجرت کرنے والوں میں سے ایک گروہ نے کاریزوں اور چشموں کی وجہ سے شہر یرشب کو رہائش کے لیے پسند کر لیا۔

صحرائینی کی زندگی میں بھی کچھ تبدیلیاں آئیں۔ بندر گاہوں اور تجارتی راستوں میں تبدیلیوں کی وجہ سے امن و اطمینان کے ساتھ مال تجارت لے جانے کے لئے تاجروں کو مجبوراً راستہ بنانے والے (گائیڈز) رکھنے پڑے۔ عرب کے بدوؤں نے تاجروں کی نوکریاں اختیار کر لیں اور مال تجارت کو ایک سے دوسری جگہ لے جانے کی ڈیوٹی انہیں دی گئی۔ اس کے نتیجے میں جن مقامات پر سامان اتارنا اور لادنا مناسب معلوم ہوا وہاں راستے میں ایسی جگہیں وجود میں آ گئیں۔ اس معاشرتی تبدیلی سے متاثر ہو کر چند عرب شیوخ نے بھی تجارت کا پیشہ اپنا لیا۔ وہ مقامات جو اس کام کے لیے نہایت موزوں تھے ان میں سے ایک شہر مکہ تھا جو بحیرہ احمر سے ساتھ کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔

جغرافیائی خصوصیات کے علاوہ مکہ کی مذہبی حیثیت بھی تھی۔ خانہ کعبہ میں ہر سال ایک مرتبہ زائرین کا اجتماع ہوتا تھا۔ یہ دو چیزیں صحرائینوں کے اس شہر کی طرف آنے کا باعث بنیں۔ اس لحاظ سے ہم دیکھتے ہیں کہ ظہور اسلام سے سالہا سال پہلے کے کی آبادی شمال کے عربوں پر مشتمل تھی۔ وہی خود غرض، سرکش غیر مہذب بالخصوص کھیتی باڑی کی باقاعدہ زندگی سے بیزار لوگ مکہ میں رہائش پذیر تھے۔ دونوں شمالی اور جنوبی علاقوں کے عرب اپنے آپ کو حضرت ابراہیمؑ کے فرزند حضرت اسماعیلؑ کی اولاد سمجھتے تھے اور طرفین کے پاس اپنے اپنے شجرہ نسب سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دو نسلیں اپنے اپنے جد امجد ”عدنان“ اور ”قحطان“ سے ایک دوسرے سے جدا ہوتی ہیں۔

جب معاشرتی اور معاشی لحاظ سے یہ دو نسلیں ایک دوسرے کے یہ مقابل قرار پائیں تو ایک دوسرے کے طرز حیات کی تحقیر کرنے لگیں۔ نسلی اعتبار سے بھی ہر ایک اپنے آپ کو حضرت اسماعیلؑ کا حقیقی وارث سمجھتا تھا اور دوسرے کو غاصب گردانتا تھا۔ اگرچہ ان میں ہر دو گروہ متعدد قبیلوں، خاندانوں اور طائفوں میں تقسیم ہو گئے، لیکن انہوں نے اپنی بنیاد کو کبھی بھی فراموش نہیں کیا تھا۔

کبھی کبھار خود قحطانی یا عدنانی قبائل کی آپس میں لڑائیاں اور جنگیں ہوتی تھیں۔ وہ ایک

دوسرے پر حملے کرتے تھے۔ جونہی کوئی غیر قحطانی یا غیر عدنانی ان پر حملہ کر دیتا، وہ چھوٹے قبائل اپنی دشمنیاں فراموش کر دیتے اور حملہ آور دشمن کے خلاف متحد ہو جاتے تھے۔

مثلاً ممکن تھا کہ ہمدان اور قصاعہ کئی سالوں سے آپس میں نبرد آزما ہوں، لیکن اچانک قبیلہ ربیعہ ان دو میں سے کسی ایک پر حملہ کر دے تو یہ دونوں آپس کی سالوں سے جاری جنگ کو ترک کر دیں گے اور ایک دوسرے کے شانہ بشانہ ربیعہ سے جنگ کریں گے۔ عربوں میں ضرب المثل ہے: ”میں اپنے بھائی اور چچا زاد بھائی کے خلاف برسر پیکار ہوں، میں اور چچا زاد بھائی غیروں سے برسر پیکار ہیں۔“ (۱)

جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے کہ عدنانی یا شمالی علاقوں کے عرب اپنی زندگی کی ضروریات پوری کرنے کے لئے ہمیشہ سفر اور حرکت میں رہتے تھے۔ ایسی گردش میں مصروف زندگی کے لیے لڑائی جھگڑا، لوٹ مار اور قتل و غارت ناگزیر چیزیں تھیں۔ ہم نے کہا کہ صحرا اپنے فرزند کو دو سبق سکھاتا ہے: اولاً جو مقابلے پر آئے اس سے جنگ کرو ثانیاً اپنے رشتہ داروں، عزیز واقارب اور پناہ حاصل کرنے والوں کا دفاع کرو۔ اسی عادت اور خصلت کو تعصب یا عصیت سے تعبیر کیا گیا ہے۔ قرآن حکیم نے اسے ”حمیت جاہلی“ سے یاد کیا ہے۔ مثلاً: فَنِي قُلُوبِهِمُ الْحَمِيَّةُ حَمِيَّةُ الْجَاهِلِيَّةِ (الفتح: ۲۶)۔ اپنے دلوں میں تعصب رکھا تعصب بھی جاہلیت کا...

اس ماحول میں پرورش کے نتیجے میں صحرائین اپنے آپ کو ہر قسم کی پابندیوں سے آزاد سمجھتا ہے۔ شہری اور دیہاتی زندگی کا مذاق اڑاتا ہے، محنت اور کام جسے شہری اور دیہاتی لوگ اپنا شعار سمجھتے ہیں وہ اسے ذلت اور پستی گردانتا ہے۔ پانچویں صدی عیسوی کے آغاز میں شہر مکہ کی اہمیت کے پیش نظر جو لوگ وہاں آکر آباد ہو گئے تھے وہ اسی قبیل کے لوگ تھے۔ قصی بن کلاب نے شہر مکہ کی سرداری جنوبی مہاجرین (خزاعہ) سے چھین لی اور اپنے قبیلے (قریش) کو شہر لے آیا۔ یہ قبیلہ مکہ سے باہر بیابانوں اور دروں میں رہتا تھا۔ اس طرح مکہ شہر کا انتظام عدنانیوں (شمالی علاقوں کے عربوں) کے ہاتھوں میں آ گیا۔ انہوں نے تجارت کو اپنا پیشہ بنالیا یا تجارتی قافلوں کی پاسبانی کی ذمہ داری انجام دینے لگے۔ اس کے باوجود انہوں نے اپنی پرانی خصلت نہ چھوڑی۔ خصوصاً قحطانی یعنی جنوبی علاقوں کے عربوں سے رقابت بلکہ ان سے دشمنی کو اسی شد و مد سے باقی رکھا۔ پس قدرتی طور پر اہل مکہ اور اہل مدینہ کے درمیان خوشگوار تعلقات نہیں ہونے چاہیے تھے۔

جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ اسلام کی دعوت کا آغاز پہلے مکہ میں ہوا۔ مکہ وہ شہر تھا جس کا کنٹرول اور انتظام عدنانی سرداروں اور شیوخ کے ہاتھوں میں تھا۔ رسول اکرمؐ نے تیرہ سال تک ان

(۱) اَنَا وَ اُنْعَى عَلَى ابْنِ عَمِيٍّ وَ اَنَا وَ ابْنُ عَمِيٍّ عَلَى الْغَرِيبِ (تاریخ تمدن اسلامی - ج ۲، ص ۱۳)

لوگوں کو خدا پرستی کی دعوت دی، لیکن جو افراد آپؐ پر ایمان لے آئے وہ زیادہ تر مظلوم، محروم، غریب یا نچلے طبقوں سے تعلق رکھنے والے تھے۔ مالدار، دولت مند، رئیس، طبقے اور سرداروں میں سے نہ صرف کوئی ایمان نہ لایا بلکہ جہاں تک ان سے بن پڑا انہوں نے آپؐ اور آپ کے پیروکاروں کو طرح طرح کی تکلیفیں پہنچائیں۔ اس کے برعکس اسلام کا پیغام جو نئی یثرب پہنچا تو اس شہر کے لوگ رسول خداؐ سے عہد و پیمان باندھنے لگے۔ انہوں نے آپؐ کو اپنے شہر آنے کی دعوت دی۔ اس تاریخ کے بعد اس شہر کے لوگوں کو انصار کے لقب سے یاد کیا جانے لگا۔ اس شہر کو بعد میں ”مدینہ الرسول“ (رسول کا شہر) کہا جانے لگا جو بعد میں مخفف ہو کر مدینہ رہ گیا۔ وہ لوگ جو مکہ میں مسلمان ہوئے اور یثرب آئے وہ مہاجرین کہلائے۔

البتہ ہمیں فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ مہاجرین کی اکثریت عدنانی تھی یا عدنانیوں کی حمایت میں تھی۔

جب مہاجرین یثرب میں رہائش پذیر ہو گئے تو رسول اللہؐ نے ہجرت کے ابتدائی مہینوں میں ان کے اور انصار کے درمیان اخوت و برادری رشتہ قائم کر دیا۔ اس طرح قحطانی اور عدنانی اسلامی بھائی بن گئے۔ اس پیمان اخوت کے نتیجے میں جو الفت ان کے درمیان پیدا ہوئی، اس نے ان دونوں کے درمیان ظاہری طور پر کینہ و عداوت کو ختم کر دیا۔ ہم قرآن مجید میں پڑھتے ہیں:

وَإِذْ تَمْشِي غُلَامَتَانِ مِنْكُمْ لِيُحْكَمَ لَكُمْ بَيْنَ الْمَآءِ وَالْخِلَافَةِ فَأَخَذَتْ الْغُلَامَتَانِ مِنْ الْمَاءِ جَمْعًا فَلَوْ أَنَّهُمَا صَبَحَا عَلَىٰ ذُنُوبِهِمَا لَبَيِّنَاتُ لَكُمْ فَصَدَّكَ عَنْهَا لِيَتَكَلَّمَ بَيْنَهُمَا وَخَوَّاهُنَا لَعَنَ اللَّهُ الْفَاحِشِينَ (النور: ۲۴)

تم لوگ خود پر اللہ کی نعمت کو یاد کرو کہ جب تم (ایک دوسرے کے) دشمن تھے تو اللہ نے تمہارے دلوں میں الفت پیدا کر دی اور تم اس کی نعمت کے زیر اثر بھائی بھائی بن گئے۔

لیکن حقیقت میں کیا یہ ممکن تھا کہ وہ عداوت اور دشمنی جو صدیوں سے نسل در نسل چلی آرہی تھی، دس سال کے مختصر عرصے میں بالکل ہی ختم ہو جائے؟ اگر چند افراد اپنے آپ کو مکمل طور پر اسلامی سانچے میں ڈھال لیں اور دور جاہلیت کی خصلت کو کلی طور پر جڑ سے اکھاڑ دیں تو کیا یہ امر سب کے لیے ممکن ہے کہ وہ بھی اسی طرح کے مسلمان بن جائیں؟ نہایت افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ اس کا جواب منفی ہے۔ تاریخ اسلام کے دقیق مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبر اکرمؐ کی زندگی میں باوجود اس کے کہ یہ دونوں گروہ براہ راست آپؐ کے زیر تربیت تھے اور آپؐ کے وعظ و نصیحت سنتے تھے، پھر بھی جب کبھی انہیں موقع ملتا وہ اپنے آباء و اجداد پر فخر و مباہات اور مخالف حریف کی مذمت کرنے سے گریز نہیں کرتے تھے۔

کبھی کبھار تو ایسا بھی ہوتا تھا کہ دو مختلف عدنانی قبیلوں کے افراد یا دو مختلف قحطانی قبائل کے

افراد آپس میں بحث و مباحثہ میں اسلام سے پہلے کی سنت پر عمل پیرا ہو کر ایک دوسرے کے نسب کی تحقیق و تذلیل کرتے تھے۔

لکھا ہے کہ ایک دن مغیرہ بن شعبہ اور عمرو بن عاص کے درمیان تکرار ہو گئی۔ مغیرہ نے عمرو کو گالی دی۔ عمرو نے کہا ”ھصیص“ کہاں ہے؟ (اپنے بزرگ کا نام لیا) اس کے بیٹے عبد اللہ نے کہا ”انا لله وانا اليه راجعون“ بابا جان، جاہلیت کی طرف چل پڑے ہیں۔ کہتے ہیں کہ اس نے اپنے اس عمل کی وجہ سے تیس غلام آزاد کیے۔ (۱) فتح مکہ کے دن قبیلہ خزرج کے سردار سعد بن عبادہ لوگوں کے آگے چل رہے تھے۔ جب شہر میں داخل ہوئے تو انہوں نے با آواز بلند یہ نعرہ لگایا کہ آج خون بہایا جائے گا اور عزتیں پامال ہوں گی۔ (۲) انہوں نے اپنے طور پر یہ گمان کیا کہ آج عدنانوں کی حکومت کے خاتمہ کا اعلان کریں اور انصار یعنی قبیلہ قحطانی کی عظمت کی ان پر دھونس جمائیں اور کئی سالوں کی دشمنی کا انتقام ان سے لیں۔ رسول اکرمؐ اس فخر و مباہات کو برداشت نہ کر سکے۔ آپؐ نے علیؑ سے فرمایا: جائیں اور سعد سے پرچم لے لیں اور انہیں ایسی غلط باتیں کرنے سے باز رکھیں آج مرحمت (و معافی) کا دن ہے۔

اگر جنگ حنین کے بعد جو پیغمبر اکرمؐ کی زندگی میں جزیرۃ العرب کے اندر آخری لڑائی تھی، چند سال مزید رسول اللہؐ کا سایہ ان لوگوں پر قائم رہتا، اسلام قبول کرنے والے سب لوگ ان کی تربیت کی برکت سے کم و بیش بہرہ مند ہو جاتے، موجودہ نسل ان تعلیمات کو آئندہ نسل تک منتقل کر دیتی تو یقینی طور پر اسلامی تعلیمات دینی اخوت و برادری اور عدالت اجتماعی کے زیر سایہ باہمی چپقلش، کینہ و عداوت اور قومی و نسلی عصبیت بالکل ختم ہو جاتی۔ ہر دو گروہ یہ باور کر لیتے کہ ہمیں وحدت کلمہ (توحید) کی پیشرفت کے لیے اکٹھے کوشش کرنی چاہیے۔ لیکن افسوس کہ جب مختلف اور پراگندہ قبائل اسلام کی طرف متوجہ ہوئے اور انہوں نے یہ سمجھا کہ قبائلی سرداری اور حکومت کا دور گزر گیا ہے، وہ ایک دوسرے سے لڑائی جھگڑے ختم کر دیں اور خدا کے نام پر مدینہ میں قائم ہونے والی حکومت کی اطاعت کریں، تو رسول خداؐ اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔

ہم جانتے ہیں کہ حکومت اسلامی دین کی بنیاد پر معرض وجود میں آئی۔ حکومت کے سربراہ کا لوگوں نے انتخاب نہیں کیا تھا، بلکہ اللہ نے انہیں پیغمبر بنا کر بھیجا تھا۔ جو کچھ آپؐ نے کہا وہ وحی آسمانی اور کلام الہی تھا (سوائے ان مواقع کے جہاں اصحاب سے آپؐ نے مشورہ کیا اور ان کی رائے قبول کی)۔ رسول اکرمؐ کی وفات کے بعد دور نبوت کا خاتمہ ہو گیا۔ اگر مسلمانوں کی سربراہی اور

(۱) کنز العمال ج ۱ ص ۳۶۲ طبع دوم

(۲) ابن ہشام ص ۶۶

حکومت کسی خاص نسل و نژاد کے ہاتھوں میں نہ دی جاتی، اگر برتری اور فضیلت کا معیار صرف قریشی ہونے کو نہ بنایا جاتا اور اگر رسول اللہ کی وصیت کو پس پشت نہ ڈالا جاتا تو یہ بات اطمینان اور یقین کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ انصار کو برتری جتانے کا موقع نہ ملتا اور آخر کار وہ صلح کرنے پر آمادہ نہ ہوتے اور یہ نہ کہتے کہ ایک امیر ہم میں سے اور ایک امیر عدنانوں میں سے ہے۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ یہاں پر دین کا عنصر (رسول خدا سے منقول حدیث) تھا، جس نے انصار کو خاموش کر دیا اور وہ اپنے دعویٰ سے دستبردار ہو گئے اور وہ یہ کہ حضرت ابو بکر نے کہا کہ میں نے رسول اکرم سے سنا ہے کہ سربراہ اور حکمران، قبیلہ قریش سے ہوں۔ بہر حال یہ سب سے پہلا امتیاز تھا جو رسول خدا کی رحلت کے بعد شمالی عربوں کو حاصل ہوا۔ جیہ الوداع کے موقع پر حضور اکرم کے مختصر خطبے سے قریش کے تمام امتیاز اور برتری ختم ہو گئی تھی۔ (۱) وہ دوسرے قبائل کے ساتھ ایک ہی صف میں آگئے تھے۔ اب انہیں اپنے پاؤں مضبوط کرنے کا موقع مل گیا۔ انہوں نے انصار یعنی قحطانیوں کو اپنا دست نگر بنا لیا۔ ان سب باتوں کے باوجود حضرت ابو بکر کی خلافت کے دوران چونکہ مسلمان ایک طرف مرتدوں کی سرکوبی میں مشغول تھے اور دوسری طرف نئی حکومت ابھی پوری طرح سنبھل نہیں پائی تھی اور پوری طرح براجمان نہیں ہوئی تھی یا کم از کم حکومتی عہدے اور منصب کسی امتیاز اور آمدنی کا باعث نہیں بنے تھے، ان دو گروہوں کے درمیان کشمکش واضح طور پر نظر نہیں آتی۔

حضرت عمر کی خلافت کے زمانے میں ان کے ہلکار بڑے بڑے شہروں کے حکمران بن بیٹھے۔ جنگی غنائم اور ایران اور روم کے جزیہ اور خراج کی وجہ سے حکومتی خزانے (بیت المال) کے اموال اور مال دولت میں بہت زیادہ اضافہ ہو گیا۔ خلیفہ کی سخت پالیسی کی وجہ سے ممکن حد تک ان دو گروہوں کے درمیان توازن قائم رہا۔ خلیفہ نے اگر ایک شہر کی حکومت عدنانوں کے سپرد کی تو دوسرے شہر کا گورنر قحطانی کو بنایا۔ سقیفہ کے واقعہ کو ابھی چوتھائی صدی بھی نہیں گزری تھی کہ نہ صرف قریش اور عدنانی بڑے بڑے عہدوں اور وزارتوں پر قابض ہو گئے بلکہ بیت المال کی آمدنی کے سیلاب جنے ان کے گھروں کا رخ کر لیا۔ ان کے گھر سکوں کے جھنکار سے گرج رہے تھے۔ حروان بن حکم، معاویہ بن ابی سفیان، طلحہ بن عبید اللہ، زبیر بن عوام، عبدالرحمن بن عوف اور یحییٰ بن امیہ میں سے ہر ایک نے اس دور میں لاکھوں درہم و دینار جمع کر لیے تھے۔ قریش اور فرقہ وارانہ امید نے صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ انہوں نے حتی المقدور یہ کوشش کی کہ جنوبی عربوں کو بڑے بڑے عہدوں اور کام پر نہ رہنے دیا

(۱) قبل اس کے کہ رسول اکرم مراسم حج کی تعلیم فرمائیں قریش نے اپنے لیے خاص امتیاز رکھ لیے تھے۔ چنانچہ دو عرفات سے مٹی کی طرف

کو ج کرتے وقت دوسرے حاجیوں سے جدا ہو جاتے تھے وغیرہ۔ (ملاحظہ ہو: دروہ خانہ خدا۔ تالیف مؤلف کتاب حجاز)

جائے۔

تاریخ میں آیا ہے کہ بنی جفنه کا ایک شخص عثمان کے پاس آیا اور کہا تمہارے خاندان میں کوئی بچہ نہیں ہے کہ اسے آپ حکمران بنائیں۔ یہ بوڑھا (ابو موسیٰ) کب تک بصرے پر حکومت کرتا رہے گا۔ (۱) یہ اس وقت کی بات ہے جب شام میں معاویہ، کوفہ میں ولید بن عقبہ بن ابی معیط اور مصر میں عمرو بن العاص حکمران تھے۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ یہ تینوں مضرى بالفاظ دیگر عرب عدنانی یا شامی تھے۔ صرف بصرے کا حکمران (ابو موسیٰ) قحطانیوں میں سے تھا۔ کوئی زیادہ عرصہ نہ گزرا کہ بنی امیہ کا خاندان دوسرے قریشی خاندانوں سے آگے نکل گیا۔ یہ بات بھی ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ اس خاندان نے کبھی بھی دل سے اسلام قبول نہیں کیا بلکہ انہوں نے اسلام کو اس دن قبول کیا جب اس کے سوا ان کے پاس کوئی چارہ کار نہ تھا۔

ایک خاندان میں حکومت کے منحصر ہونے کے نتیجے میں خوابیدہ کینے اور عداوتیں بیدار ہو گئیں ابتداء میں شورش کا آغاز سرحدوں سے ہوا۔ پھر شہروں میں بھی صورت حال کشیدہ ہو گئی۔ آخر کار اس نے مرکز خلافت کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اس کا انجام یہ ہوا کہ اس کشمکش میں خلیفہ کی جان چلی گئی۔

اس دور کے اشعار ہمارے پاس موجود ہیں جو بنی امیہ کی اندرونی کیفیت کی نشاندہی کرتے ہیں اور یہ بتاتے ہیں کہ شاعر کے پیش نظر اگر کوئی چیز نہیں ہے تو وہ دین اسلام اور عدالت اجتماعی ہے۔ جس چیز کی طرف اس کی شدید توجہ ہے وہ خاندانی افتخارات، اور دوسرے قبائل پر اپنے قبیلے کی برتری اور فضیلت ہے۔

جس دن حضرت عثمان کو قتل کیا گیا، ماں کی طرف سے ان کے بھائی ولید بن عقبہ نے ان کے سوگ اور غم میں بنی ہاشم سے مخاطب ہو کر یوں کہا:

بَنِي هَاشِمٍ اِيْهِ فَمَا كَانَ بَيْنَنَا وَسَيْفِ ابْنِ اَرْوَى بَعْدَ كُمْ وَخِزَانُهُ
بَنِي هَاشِمٍ رُدُّوْا سِلَاحَ ابْنِ اُخْتِكُمْ وَلَا تَنْهَبُوْهُ لَا تَعْلُ مِنْاْهِ
بَنِي هَاشِمٍ كَيْفَ الْهُوَادَّةُ بَيْنَنَا وَعَنْدَ عَلِيٍّ دِرْعُهُ وَنَجَاتُهُ
لَعْمُرُكَ لَا اَنْتَ اَبْنُ اَرْوَى وَقَتْلُهُ وَهَلْ يُنْسِنُ الْمَاءُ مَا عَاشَ شَارِبُهُ ؟

☆ بنی ہاشم! ہم سے اور کیا چاہتے ہو؟ عثمان کی تلوار، مال و متاع اور اس کا خزانہ

(۱) انقلاب بزرگ تالیف طہ حسین ترجمہ مؤلف کتاب حد ۱۳۰ - ۱۳۱ ہجری حضرت عثمان کی والدہ کا نام ہے

- ☆ تمہارے پاس ہے
☆ اے بنی ہاشم! اپنے بھانجے کا اسلحہ واپس کر دو۔ اسے مال غنیمت نہ سمجھو۔ یہ تمہارے لیے مناسب نہیں ہے
☆ بنی ہاشم! ہم کس طرح تمہارے ساتھ نرم سلوک کر سکتے ہیں جبکہ عثمان کی زرہ اور گھوڑا علیؑ کے پاس ہے۔
☆ جس طرح کوئی ساری زندگی پانی پینے کو نہیں بھول سکتا اس طرح میں عثمان اور اس کے قتل کو ہر گز نہیں بھلاؤں گا۔

ان اشعار پر خوب غور کریں۔ کہنے والا خلیفہ حضرت عثمان کا بھائی ہے۔ یہ وہ شخص ہے جو خلیفہ کی طرف سے کوفہ کا حکمران تھا۔
جس دن آنحضرتؐ کی آنکھیں بند ہوئیں اس وقت سے لے کر ان اشعار کے کہنے تک پچیس سال سے زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اسلامی اصول کس طرح مدینہ (دعوت اسلام کی نشر و اشاعت اور تبلیغ کا مرکز) میں اس بظاہر مسلمان کی زبان سے برباد ہو رہے ہیں۔
ان اشعار میں اس بات کی طرف کوئی اشارہ نہیں ہے کہ عثمان کیوں قتل ہوئے، ناحق قتل ہوئے یا صحیح طور پر؟ جس دن انہیں قتل کیا گیا سنت رسولؐ اور سیرت شیخین پر تھے یا اس سے عدول کر چکے تھے؟ ان میں یہ سوال بھی نہیں کیا گیا کہ حملہ آوروں نے کیوں اور کس لیے خلیفہ پر حملہ کیا اور انہیں قتل کیا؟ صرف اور صرف فرزندان امیہ کی فرزندان ہاشم کے ساتھ رقابت، عداوت اور بغض و کینہ کا اظہار ہے۔

اگر قتل عثمان میں بالواسطہ یا بلا واسطہ ہاشمیوں کا ہاتھ ہوتا تو پھر بھی ہم کہنے والے کو قصور وار نہ ٹھہراتے، لیکن وہ کھلم کھلا الزام تراشی کر رہا ہے کہ عثمان کا سب خزانہ اور ترکہ علیؑ کے گھر ہے اور ہمیں معلوم ہے کہ جب لوگوں نے عثمان کے گھر کا محاصرہ کر لیا تو حضرت علیؑ نے ان کی حمایت کی اور اگر عثمان کے رشتہ داروں کے بقول علیؑ نے عثمان کی مدد نہیں کی تو کم از کم ان کے خلاف جنگ تو نہیں لڑے۔ ان کے مخالفین کی بھی مدد نہیں کی اور عثمان کے ترکے اور خزانے کو بھی نہیں لوٹا۔

پس بنی ہاشم سے بیزاری اور مخالفت کی وجہ اس کے علاوہ اور کیا ہو سکتی ہے کہ پیغمبر اکرمؐ ان میں سے مبعوث ہوئے؟ حضرت عثمان کے قتل کے بعد چونکہ مسلمانوں نے خاندان بنی ہاشم سے خلیفہ بنا لیا تھا۔ یہ انتخاب اس کے لیے ناقابل برداشت تھا۔ کیا اس کے علاوہ کوئی اور وجہ تھی؟ اس بارے میں کیا ہم اس کے علاوہ کوئی اور تاویل کر سکتے ہیں کہ بعض قبائل کے افراد اور سرداروں نے

دوسرے قبائل سے بغض و کینے اور دشمنی و عداوت کو فراموش نہیں کیا تھا؟ بلکہ اسلام لانے کے بعد واقعی طور پر اس سے چشم پوشی کر لی۔ چونکہ نئی سرگرمیوں میں مشغول ہو گئے تھے اور جو نئی انہیں موقع ملا وہ اپنی پرانی عادتوں کی طرف پلٹ گئے۔ یہ وہی امر تھا جس کے خطرات سے قرآن انہیں خبردار کر رہا تھا:

وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ أَفَإِنْ مَاتَ أَوْ قُتِلَ
انقلبتم على أعقابكم مَن يقلب على عقبيه فَلَن يضر الله
شَيْئاً وَسَيُجْزَى اللَّهُ الشَّاكِرِينَ (آل عمران: ۱۴۴)

اور محمد تو صرف رسول ہیں۔ ان سے پہلے دوسرے بہت سے پیغمبر گزر چکے ہیں۔ پھر کیا اگر (محمد) اپنی موت مر جائیں یا مار ڈالے جائیں تو کیا تم اٹے پاؤں (اپنے کفر کی طرف) پلٹ جاؤ گے اور جو اٹے پاؤں پھرنے لگا تو (سمجھ لو کہ) ہر گز خدا کا کچھ نہ بگاڑے گا اور عنقریب خدا شکر کرنے والوں کو اچھا بدلہ دے گا۔

حضرت عثمان کی خلافت کا آخری دور تھا کہ دوبارہ عدنانی اور قحطانی صفیں نئے سرے سے ایک دوسرے سے علیحدہ ہو گئیں۔ جس طرح قحطانی حضور اکرم کو عدنانی شہر سے اپنے شہر لے گئے اسی طرح انہوں نے آپ کے چچا زاد بھائی کو مدینہ سے کوفہ دعوت دی یا دوسرے الفاظ میں ہم یہ کہیں کہ ان دنوں میں علی علیہ السلام کی پسندوں کی دعوت پر جاز سے عراق آ گئے۔ انہوں نے حضرت علی سے مدد و نصرت کا وعدہ کیا اور ان کا ساتھ دیا۔ اس کے برعکس معضی یا عدنانی بصرہ میں اکٹھے ہوئے اور علی اور ان کے لشکر سے جنگ کی۔

حضرت عثمان کے دور خلافت کے آخری پانچ سالہ اور معاویہ اس کے بیٹے یزید اور یزید کے بیٹے کی حکومتوں کے بیس سالہ دور میں معضیوں سے جہاں تک ہو سکا انہوں نے یمنیوں سے سخت رویہ رکھا۔ یمنیوں نے بھی جب یہ دیکھا کہ اسلامی دور حکومت اختتام پذیر ہو گیا ہے اور دوبارہ نسلی اور قومی برتری کا دور شروع ہو گیا ہے تو انہوں نے ایسے گردہ کا دامن تھام لیا جو لوگوں کو حکم قرآن اور عدالت کی طرف بلاتا تھا۔ اسی لیے ہم دیکھتے ہیں کہ جنگ صفین میں انصار، معاویہ اور شامیوں کو یہ کہتے تھے:

کل تنزیل قرآن کے حکم پر تمہارے ساتھ ہم نے جنگ کی اور آج تاویل

قرآن کی خاطر تمہارے ساتھ نہ رہا۔ آزمات ہیں۔ یہ وہی لوگ تھے جنہوں نے علی کی شہادت کے بعد ان کے بیٹے حسن سے کہا تھا کہ اپنا ہاتھ آگے کریں تاکہ ہم کتاب الہی، سنت رسول اور بدعت گذاروں سے جنگ کی خاطر آپ کی

بیعت کریں۔ (۱) جیسا کہ انہوں نے حضرت علیؑ کے دوسرے بیٹے کو لکھا تھا کہ تیرا دشمن بیت المال دولت مندوں اور بد معاش افراد کے درمیان تقسیم کرتا ہے۔ (۲)

سنہ ۶۱ ہجری میں جب عراقیوں نے انتہائی بزدلانہ طریقے سے حسین (ع) کو ان کے دیرینہ دشمن کے حوالے کر دیا۔ اس کے بعد ظاہری طور پر ایک بار معز یوں کی خواہشات پوری ہو گئیں اور وہ اپنے ہدف میں کامیاب ہو گئے۔ لیکن ابھی اس سانحہ کو چار سال بھی نہ گزرے تھے کہ مروجِ ذابیط میں یمنیوں کے ساتھ ان کا مقابلہ ہو گیا۔ اس لڑائی میں معز بن قیس (قیسی) ابن زبیر کی حکومت کے طرفدار تھے اور یمنی (جنہیں اس وقت کلبی کہا جاتا تھا) بنی امیہ کی حکومت کے حق میں تھے۔ آخر کار کلبیوں نے قیسوں پر یمنیوں نے معز یوں پر فتح پائی اور مروان بن حکم خلیفہ بن گیا۔

عربی میں ایک ضرب المثل ہے ”أَذَلُّ مِنْ قَيْسِي بِحُمْص“ حمص (شام کا ایک شہر) میں قیسی سے زیادہ ذلیل۔ قوی احتمال یہ ہے کہ یہ مثال اس دور کی ایجاد ہے جب کلبیوں نے سر اٹھایا۔ اس تاریخ کے بعد دو قبیلوں کے درمیان جنگ وجدال سے دین کا رنگ مکمل طور پر اتر گیا اور یہ جنگ شمال اور جنوب کے دو بڑے عرب گروہوں کے درمیان ذاتی بغض و عناد کی مکمل تصویر بن گئی۔

ان دونوں گروہوں نے جو جنگی اشعار کہے ہیں۔ ان سے دین و شریعت کی ذرا بھی بو نہیں آتی۔ جو کچھ ہے وہ آباء و اجداد پر فخر و مباہات اور اپنے قوم و قبیلے کی امتیازی خصوصیات کا بیان ہے۔

حیران کن بات تو یہ ہے کہ اس جنگ میں جسے زیادہ مدد پہنچا وہ ابن زبیر (خاندان ابو سفیان کا کٹر مخالف) کی خلافت کا حامی ضحاک بن قیس ہے۔ جس نے معاویہ کے پورے دور حکومت میں دل و جان سے اس کی خدمت کی۔ اسی شخص نے یزید کی خلافت کے لیے بلائے گئے جلسے میں اس بات کی پوری پوری نگرانی کی کہ کوئی بھی معاویہ کے خلاف رائے نہ دے اور معاویہ کی مرضی کے خلاف کوئی بات نہ کہے۔

اسی شخص نے یزید کو حوارین کے ذریعے سے دمشق بلوایا اور اسے تخت حکومت پر بٹھایا۔ لیکن یزید کے مرنے کے بعد اس کے نھالی رشتہ دار، جو قبیلہ کلبی (جنوبی) سے تھے، یزید کے بیٹے خالد کی خلافت کی حمایت کرنے لگے۔ ان کا رویہ ضحاک (جو قبیلہ معز بن قیس سے تھا) پر سخت ناگوار گزرا۔ اس نے ان کی ضد میں آکر یہ فیصلہ کیا کہ ایک معز بن قیس (عبداللہ بن زبیر) کو تخت پر بٹھایا جائے۔

تاریخ اسلام پر نگاہ ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ اس تاریخ کے بعد صدیوں تک جہاں بھی شورش پیدا ہوئی اس کا سبب مذکورہ دو گروہ تھے یا کسی نہ کسی طرح ان کا شورش میں ہاتھ تھا۔

(۱) قبلی از تاریخ اسلام ج ۲ ص ۸

(۲) پس از ہجاء سال ۱۱۳

مروان بن حکم سے لے کر مروان ثانی کے دور حکومت تک ہر خلیفہ یا حکمران نے اپنی مصلحت کے پیش نظر مضریوں کی طرفداری کی یا یمنیوں کی حمایت کی۔ البتہ ان میں سے اکثر نے مضریوں کی حمایت کی۔ اس واقعہ کو ملاحظہ کریں جو ایک تاریخی حقیقت سے زیادہ لطیفہ لگتا ہے۔ زیاد بن عبید حارثی کہتا ہے:

میں مروان بن محمد کے دور خلافت میں چند آدمیوں کے ساتھ اس سے ملاقات کرنے گیا۔ پہلے ہمیں مروانی پولیس کے سربراہ ابن ہبیرہ کے پاس لے جایا گیا۔ اس نے ایک ایک مہمان کا حال پوچھا۔ ہر ایک نے مروان اور ابن ہبیرہ کی تعریفوں کے پل باندھ دیئے۔ اس کے بعد ابن ہبیرہ نے ان کے نسب کے بارے میں پوچھا۔ میں ایک طرف ہو گیا کیونکہ میں جانتا تھا کہ اس بات چیت کا انجام بخیر نہیں ہو گا۔ میں دل ہی دل میں پر امید تھا کہ سب مہمان اپنی چرب زبانی اور طویل باتوں سے اسے تھکا دیں گے اور مسئلہ ختم ہو جائے گا اور میری نوبت ہی نہیں آئے گی، لیکن ایسا نہ ہوا۔ سب سے اس نے پوچھ لیا۔ اب میرے سوا کوئی باقی نہیں بچا تھا اس کے بعد اس نے مجھے اپنے پاس بلایا اور پوچھا:

تمہارا تعلق کس قوم سے ہے؟

یمنی قوم سے۔

کس قبیلے سے؟ مذحج سے۔

اپنی بات کو مختصر کر۔

بنی حارث بن کعب سے۔

حارثی بھائی! لوگ کہتے ہیں یمنیوں کا باپ بندر تھا، تمہارا کیا خیال ہے؟

اس کا پتہ چلانا مشکل کام نہیں۔

ابن ہبیرہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور کہنے لگا: تیرے پاس کیا دلیل ہے؟

میں نے جواب دیا: تم بندر کی کنیت کو دیکھو اگر انہیں ابوالیمن کہا جاتا

ہے تو یمنیوں کا باپ بندر ہے، لیکن اگر اس کی کنیت ابو قیس ہے تو پھر

بندر دوسروں کا باپ ہے۔

ابن ہبیرہ اپنی باتوں پر شرمندہ ہوا۔^(۱)

(۱) الحفوات النادرہ ص ۱۳۱-۱۳۲ یاد رہے کہ بندر کی عربی میں کھیتوں میں سے ایک ”ابو قیس“ ہے۔

ان دو گروہوں کا پہلے قحطانی اور عدنانی نام تھا، لیکن بعد میں آپس کی پوری جنگی تاریخ میں ان کے نام مختلف رہے ہیں، جیسے: یمنی اور قیس، مصری اور یمنی، قیس اور کلبی، ازدی اور تمیمی۔ ان کا میدان جنگ خراسان سے لے کر خوزستان اور سیستان، یہاں سے لے کر مغربی ایران تک، عراق سے شام تک، حجاز سے مصر تک، تمام افریقہ، سسیل اور رودس جزیروں سے لے کر جنوبی ہسپانیہ تک کا علاقہ تھا۔

اس وسیع و عریض سر زمین پر جہاں بھی دو فریقوں کے درمیان جنگ ہوئی، اس میں جنوبی اور شمالی عربوں کے اثرات دیکھے جاسکتے ہیں۔

سن چالیس ہجری سے جب معاویہ نے اپنے آپ کو مسلمانوں کا خلیفہ کہلوانا شروع کیا۔ ۱۳۲ ہجری تک صرف عبدالملک بن مروان کے دور حکومت کو نسبتاً امن و سکون کا دور کہا جاسکتا ہے۔ وہ بھی اس لحاظ سے نہیں کہ اس وسیع و عریض مملکت اسلامی میں عدل و انصاف کا راج تھا بلکہ اس لحاظ سے کہ حجاج بن یوسف جیسے حاکموں نے جبر و استبداد سے لوگوں کے سانسوں کو ان کے سینوں میں محبوس کر دیا تھا۔ جو کوئی ابوسفیان کے سپہوتوں یا ان کے گماشتوں کے خلاف کوئی بات کرتا اس کا سر اڑا دیا جاتا یا زندان میں ڈال دیا جاتا۔ مروانیوں کے دور حکمرانی کے آخری نصف حصے میں بالبصیرت اور دور اندیش افراد نے دین میں یکے بعد دیگرے وجود میں آنے والی بدعتوں کا اصلی اور بنیادی سبب جان لیا اور وہ اس بات کی تہہ تک پہنچ گئے۔ رسول خدا کی رحلت کے بعد جب یہ کہا گیا کہ نبوت اور خلافت ایک خاندان میں جمع نہیں ہونی چاہیے تو وہ اس سے بے خبر تھے کہ خلافت و حکومت قبیلہ تیم و عدی سے نکل کر ابوسفیان اور مروان کے خاندان میں منتقل ہو جائے گی اور اسلام کے بدترین دشمن اسلامی حکومت پر قابض ہو جائیں گے۔ عبدالملک کے دور حکومت کے اواخر میں آہستہ آہستہ یہ سوچ اور فکر زور پکڑنے لگی کہ اگر ابتدائی ایام میں حق کو صاحبان حق سے غصب نہ کیا جاتا تو امویوں کو یوں ان گستاخیوں کا موقع ہر گز نہ ملتا اور مسلمانوں کی حالت زار یہاں تک نہ پہنچتی۔ یہی وہ زمانہ ہے جس کی پیش گوئی فاطمہ زہرا (س) نے کی تھی کہ رسول اکرم کی رحلت کے بعد مسند اقتدار اگر عادل شخص کے سپرد کی جاتی تو وہ سب کو عدل و انصاف کے چشمے سے سیراب کرتا۔

ہم دیکھتے ہیں اس دور میں مظلوم عوام نے دوبارہ علویوں کا دامن پکڑا اور ان کا ساتھ دیا اگرچہ ان کے قیام کے یکے بعد دیگرے وہ سرکوب کر دیئے گئے لیکن آخر کار سنت پیغمبر کے عقیدت مند اور پیر و کار اس نتیجے پر پہنچے کہ ان سب مشکلات، پریشانیوں اور مصیبتوں کا حل یہ ہے کہ حکومت بنی امیہ کے خاندان سے بنی ہاشم کے خاندان میں منتقل ہو اور ابوسفیان کے پوتوں کے بجائے علی کے پوتے برسر اقتدار آئیں۔

ابھی پہلی صدی ہجری اختتام پذیر نہیں ہوئی تھی کہ پہلے دور دراز (مشرقی ایران) کے علاقوں

میں پھر مرکز ایران اور آخر میں کوفہ و بصرہ میں خاندان پیغمبرؐ اور فرزند ان فاطمہ (س) بنت رسولؐ کی حمایت کے نام پر مزاحمتی گروہ تشکیل دیئے گئے۔ حکومت سے ناراض افراد بھی ان مزاحمتی دستوں سے منسلک ہو گئے۔ پھر آہستہ آہستہ مفاد پرست اور اقتدار کے لالچی افراد بھی ان دستوں میں شامل ہو گئے۔ یہ وہ افراد تھے جو ہدف تک پہنچنے کے لیے ہر ذریعے اور وسیلے کو جائز سمجھتے تھے۔ ان کا نعرہ یہ تھا کہ اموی حکومت کو سرنگوں کیا جائے اور اس کی جگہ پر آل علیؑ کو بٹھایا جائے۔ جنہوں نے اس قتل و غارت، اذیت و آزار، قید و بند کی صعوبتوں پر سیاست کی اور فائدہ اٹھایا، وہ نہ تو فرزند ان فاطمہ (س) تھے نہ اولاد علیؑ۔ ان حالات میں ایک موقع پرست، چالاک و عیار اور سازشیں تیار کرنے والا ماہر شخص میدان سیاست میں وارد ہوا اور الرضا من آل محمدؑ (۱) کی بجائے الرضا من آل عباس کی مسند خلافت پر براجمان ہو گیا۔ جس دن ابوالعباس سفاح نے حیرہ میں ایک جلسہ کیا جس میں پہلے سے طے شدہ پروگرام کے تحت شعراء نے آل ہاشم اور عباسی خاندان پر بنی امیہ کے مظالم کو گنویا۔ اس کے بعد خراسان کے سپاہی ”کافر کوہوں“ (۲) کے ساتھ امویوں کے سروں پر ٹوٹ پڑے اور ان کے پیچھے نکال دیئے۔ اس کے بعد امویوں کی نیم جان لاشوں پر قالین بچھائے گئے اور رسول خداؐ کا خلیفہ اور اس کے قریبی لوگ دسترخوان لگا کر کھانے میں مشغول ہو گئے۔ قالین کے نیچے سے ان نیم جان لاشوں کے کراہنے اور آہ و فریاد کی آوازیں آتی رہیں۔ خلیفہ کھانے میں مشغول رہا اور اس نے کہا کہ جو لذت آج کھانے میں تھی وہ زندگی بھر کسی کھانے میں نہیں پائی۔ (۳) کچھ ہی عرصہ بعد اسلامی عدل و انصاف کے پیاسوں نے دیکھا کہ الرضا من آل محمدؑ کے نام پر اقتدار حاصل کرنے والے الرضا من آل ابوسفیانؑ سے کسی طرح کم نہیں ہیں۔ عباسی خاندان نے سب سے پہلے ان لوگوں کی خبر لی اور ان کا حساب چکایا جنہوں نے ان کے اقتدار کی راہیں ہموار کی تھیں۔ اس سے فارغ ہونے کے بعد وہ آل علیؑ کے خون کے پیاسے ہو گئے۔

علویوں کو یا تو تہہ تیغ کر دیا گیا یا وہ زندانوں اور قید خانوں میں گل سڑ گئے یا پھر بیابانوں، پہاڑوں اور دیہاتوں میں جان کے خوف سے گمناہی کی زندگی گزارنے لگے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب رسول اللہؐ کے طرفدار دن اور متوالوں نے اپنی دلی کیفیات اور غم و غصے

(۱) محمد بن علی بن عبد اللہ بن عباس پہلا عباسی امام شروع میں اپنے داعیوں سے کہتا تھا کہ کسی خاص شخص کا نام خلافت کے لیے نہ لو بلکہ لوگوں کو آل محمد کے رضا ”الرضا من آل محمد“ کی طرف بلاؤ۔ اس نے ان سے کہا ہوا تھا کہ عدنانی عربوں کو نیست و نابود کر دو اور قطائعوں کو اپنے ساتھ رکھو۔

(۲) ایک قسم کا گرز جس کا یہ نام رکھا گیا تھا۔

(۳) اثنائی ج ۴ ص ۳۲۶-۳۳۷

کی حالت کو قصیدوں اور حکایتوں کے قالب میں بیان کیا۔ انہوں نے نہایت مؤثر اور دل خراش انداز اور مناسب ترین الفاظ میں ان چیزوں کو دوسروں تک پہنچایا۔ خفیہ مجالس میں رسول خدا کی بیٹی اور ان کی اولاد پر ڈھائے جانے والے ظلم و ستم پر نوحہ خوانی کا آغاز ہوا۔ اس کے بعد بازاروں میں اور کھلے عام یہ مجالس برپا ہوئیں۔ انہی سالوں میں ہم ملاحظہ کرتے ہیں کہ آل محمد کی مظلومیت کا راز دختر رسول زہراء اطہر (س) ہیں۔

یا قوت نے خالغ (حسین بن محمد بن جعفر، چوتھی صدی کے مشہور شاعر) سے روایت کی ہے:

میں سنہ ۳۴۶ ہجری میں بچہ تھا۔ میں نے اپنے باپ کے ہمراہ بازار وراقان اور زرگران کے درمیان واقع مسجد میں منعقد ایک غمگین مجلس میں شرکت کی۔ مسجد لوگوں سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھی کہ اچانک ایک شخص خاک آلودہ عصا ہاتھ میں لیے پھٹے پرانے لباس میں اپنا غذا اور پانی کا کنورہ ساتھ لیے ظاہر ہوا۔ اس نے بلند آواز کے ساتھ حاضرین کو سلام کیا اور کہا: میں زہرا (س) کا بھیجا ہوا ہوں۔ حاضرین نے اسے خوش آمدید کہا اور اسے مجلس میں صدارت والی جگہ پر بٹھادیا۔ اس کے بعد اس نے پوچھا: کیا آپ نوحہ خواں احمد مزدق (۱) کے بارے میں مجھے بتا سکتے ہیں؟ یہیں موجود ہیں (مجمع میں سے آواز آئی)۔ میں نے جناب سیدہ کو خواب میں دیکھا ہے۔ انہوں نے مجھے حکم دیا ہے بغداد جاؤ اور احمد سے کہو کہ ناشی کے شعر کے ذریعے میرے بیٹے پر نوحہ سرائی کرے جس میں انہوں نے کہا ہے:

بَنِي أَخْمَدٍ قَلْبِي لَكُمْ يَتَقَطَّعُ بِمِثْلِ مُضَابِي فِيكُمْ لَيْسَ يُنْصَحُ
اے احمد کے فرزند، میرا دل تمہارے لئے خون ہے اور جو مصیبتیں تم پر
پڑیں اس جیسی مصیبتیں کبھی سننے میں نہیں آئیں۔

ناشی بھی اس مجلس میں موجود تھا۔ جب اس نے یہ بات سنی تو اس نے اپنا منہ پیٹ لیا، احمد مزدق اور دوسروں نے بھی یونہی کیا۔ ناشی اور اس کے بعد مزدق نے سب سے زیادہ ماتم کیا۔ اس کے بعد انہی اشعار کے

(۱) "ناشی" اور "خن آراء" دونوں معنی ہیں

ساتھ نماز ظہر تک نوحہ خوانی کی گئی۔ مجلس ختم ہو گئی۔ اس مرد کو کچھ ہدیہ دینے کی بہت کوشش کی گئی لیکن اس نے قبول نہ کیا بلکہ کہا: خدا کی قسم اگر مجھے پوری دنیا بھی دے دو تو پھر بھی نہیں لوں گا کیونکہ جناب سیدہ (س) کا پیامبر ہوں اور اس پیام رسانی کے بدلے کوئی چیز بھی قبول نہیں کروں گا۔^(۱)

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس بحث کے آخر میں ایک فصل ان مرثیوں اور قصیدوں کے لئے مخصوص کریں۔ ہم نے عربی شاعروں کے بعض نمونے جو آٹھویں صدی ہجری سے پہلے کہے گئے، دیئے ہیں اور فارسی اشعار میں سے ان اشعار کے نمونے جو نویں صدی ہجری کے آخر تک کے ہیں، ہم نے انہی پر اکثفا کیا ہے۔ کیونکہ جیسا کہ ہمیں علم ہے دسویں صدی ہجری کے بعد شیعہ مذہب پھیل گیا اور عہد صفوی کے اشعار میں (جب شیعہ مذہب کو سرکاری حیثیت حاصل ہو گئی) اہل بیت کی شان میں بکثرت قصیدے دیکھے جاسکتے ہیں۔



(۱) معجم الادباء ج ۱۳ ص ۲۹۲ - ۲۹۳

شیعہ شعرائے عرب کے اشعار
انتخاب

ظہور اسلام سے دسیوں سال قبل سے سرزمین عرب میں ہمدردی اور دشمنی کے جذبات کو ابھارنے کے لیے عربی اشعار ایک موثر ذریعہ رہے ہیں۔ کتنے ہی قصیدے اور قطعے کہے گئے اور ان کے کہنے اور زبان پر لانے سے ایک شخص یا افراد لوگوں کے ذہنوں میں بڑے بن کر جلوہ گر ہوئے یا اپنی قدر و منزلت کھو بیٹھے۔ چنانچہ کئی بار ایسا ہوا کہ ایک اجتماع اور محفل میں کچھ شعر پڑھے گئے اور حاضرین آپس میں الجھ گئے اور ایک دوسرے کی جانوں کے درپے ہو گئے۔

جذبات و احساسات پر اشعار کی تاثیر، صرف عربی اشعار کا ہی خاصہ نہیں ہے۔ البتہ اس میدان میں ان کا استعمال اور اس علاقے کے لوگوں پر اشعار کا اثر دیگر علاقوں کی نسبت زیادہ ہے۔ اسی خصوصیت کی بناء پر دور جاہلیت اور اسلام کے ابتدائی ادوار میں مختلف قبائل مدح خواں شعراء کو اپنی طرف متوجہ کرنے یا جھوگو کو راضی رکھنے کے لیے ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کیا کرتے تھے اور نہایت قیمتی انعامات دے کر اپنے لئے فخر و مباہات کا سامان فراہم کرتے یا اپنی عزت و وقار خریدتے۔

جو نہی مدینہ منورہ میں حکومت اسلامی کی بنیاد پڑی قرآن کے احکامات اور فرامین پیغمبرؐ کی رو سے شعراء حضرات کو دوسروں کی عزت و احترام کی حدود سے تجاوز کرنے سے منع کر دیا گیا۔ البتہ بعض اشعار کو دین کی خدمت کے عنوان سے بروئے کار لایا گیا۔ سیرت اور تاریخ کی کتب کا مطالعہ یہ بتاتا ہے کہ غزوہ بدر، احد، خندق اور دوسری بڑی جنگوں میں دونوں طرف کے شعراء نے اپنے گروہ کی کامیابیوں کو بڑھا چڑھا کر دکھانے کی کوششیں کیں اور نقصانات کو کم سے کم ظاہر کیا گیا۔

رسول خداؐ کے لشکر میں ایسے مجاہد شاعر بھی تھے جو دیگر مجاہدین کے ساتھ دشمنوں پر حملے بھی کرتے تھے۔ انہیں رسول اللہؐ فرماتے:

تمہارے اشعار تیروں کی طرح دشمن پر ضرب کاری لگاتے ہیں۔ (۱)

(۱) مسند احمد۔ جمل از معجم الفہرس ذیل کلمہ شعر

جنگ جمل میں جب علوی اور عثمانی صفوف متحس ہو گئیں اور پھر نئے سرے سے عرب ایک دوسرے کے مقابل ہوئے تو خلافت علیؑ کے طرفدار شعراء اور بیعت شکن گروہ کے شعراء قدیمی روایت زندہ کرتے ہوئے ایک دوسرے پر فخر و مباہات کا اظہار کرنے لگے۔ پھر یہ روش اور طرز عمل جنگ صفین اور جنگ نہروان میں پوری قوت کے ساتھ برقرار رہا۔

معاویہ کے بیس سالہ دور حکومت میں شیعہ شدید دباؤ میں رہے اور انہوں نے سخت ترین حالات میں ایام زندگی بسر کیے۔ ان حالات میں علوی شعراء کے لیے اپنے افکار اور تخیلات کو شعری قالب میں ڈھالنے کا موقع نہ تھا۔ لیکن محرم سن ۶۱ ہجری کے افسوس ناک واقعہ، دوسرے مدینہ میں قتل عام اور ابوسفیان کے خاندان اور آل مردان کے ہاتھوں دین اور اہل بیت رسولؐ کی جو بے حرمتی کی گئی، ان امور نے یزید کی ہلاکت کے بعد آل رسولؐ کے مدح خوانوں میں یہ جرأت پیدا کی اور انہوں نے اپنی زبانیں کھولیں۔ مروانی دور حکومت سے اس طرح کے اشعار زبانوں سے جاری ہوئے۔ حضرت علی بن حسینؑ کی ستائش میں اور ہشام بن عبد الملک کی مذمت میں فرزدق کا میمئہ قصیدہ اور کیت کا سلسلہ قصائد جو ہاشمیت کے نام سے معروف ہے، اہل بیت کی مدح سرائی یا نوحہ سرائی کا پیش خیمہ ثابت ہوئے۔ ان کے بعد سید اسماعیل حمیری، دعبلی خزاعی، منصور نمری، عبدی کوفی اور دیسوی دیگر شعراء نے اس مشعل کو مزید روشن کرنے کی سعی کی۔ آل علیؑ کی مظلومیت اور آل ابوسفیان کے ظلم و ستم کو زیادہ سے زیادہ واضح کرنے کی کوشش کی۔ باوجود اس کے کہ اس دور میں اس قسم کے اشعار کہنا اپنی جان گنوانے کے مترادف تھا، شیعہ شعراء رضائے الہی کی خاطر موت سے نہ ڈرے اور حق کو بیان کیا۔

ان شعراء کی نظر میں خاندان رسالت میں سے دو ہستیاں ایک رسولؐ اللہ کی بیٹی اور دوسرا ان کا نواسہ، سب سے زیادہ مظلوم ہیں۔ شیعہ شعراء نے لوگوں کے جذبات و احساسات بیدار کرنے اور ابھارنے کے لیے ان دو شخصیات پر ڈھائے جانے والے مظالم بیان کرنے میں ذرا بھی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کی۔ ایسے اشعار کی مثالیں بہت زیادہ ہیں۔ چونکہ یہ کتاب دختر رسولؐ خدا کے بارے میں تحریر کی گئی ہے اس لیے صرف ان اشعار کو اہمیت دی گئی ہے جو ان کی مدحت یا سوگ میں کہے گئے ہیں۔

جن اشعار کو نقل کیا گیا ہے ان کا تعلق پہلی صدی ہجری سے لے کر آٹھویں صدی تک سے ہے۔ کیونکہ اس کے بعد جیسا کہ ہم جانتے ہیں تشیع کے اثرات میں وسعت اور ایران میں شیعہ حکمرانوں کے آنے سے اس طرح کے اشعار (عربی اور فارسی) میں وسعت آگئی اور ان کی تعداد میں بہت زیادہ اضافہ ہوا۔

ابو المستھل، گنمیت بن زیاد اسدی

یہ سنہ ۶۰ ہجری میں پیدا ہوئے اور ۱۲۶ ہجری میں ان کی وفات ہوئی۔ ان کا شمار ان شیعہ شعراء میں ہوتا ہے جنہوں نے سخت ترین حالات اور مردائیوں کے دور حکومت میں بنی ہاشم کی مدح سرائی کی جب انعام کی بجائے جان کا خطرہ تھا۔ انہوں نے مخلوق کے انعام کی لالچ کے بغیر صرف رضائے الہی کی خاطر عظیم الشان قصائد اور قطعے اہل بیت کی مدح میں کہے۔ اس کے بدلے میں ہاشمیوں نے انعام دینے کی بہت کوشش کی لیکن انہوں نے قبول نہ کیا۔

ان کا سلسلہ قصائد ”ہاشمیات“ کے نام سے معروف ہے جو کئی مرتبہ چھپ چکا ہے۔ عربی کے علاوہ دیگر زبانوں میں اس کا ترجمہ ہو چکا ہے۔ انتہائی مناسب ہو گا کہ انگریزی کے مرکز، سرزمین ایران میں عربی زبان کے ماہرین ان قصائد کا فارسی میں ترجمہ کر دیں۔

أَهْوَى عَلِيًّا أَمِيرَ الْمُؤْمِنِينَ وَلَا الْيَوْمَ يَوْمًا أَبَا بَكْرٍ وَلَا عُمَرَ
وَلَا أَقُولُ وَإِنْ لَمْ يَنْعُطِيَا فَذَكَاءُ بِنْتِ النَّبِيِّ وَلَا مِيرَاثُهُ كَفَرَا
أَلَلَّهُ يَعْلَمُ مَاذَا يَأْتِيَانِ بِهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ مِنْ عَذَابٍ إِذَا اغْتَدَرَا

(ہاشمیات: ص ۸۴ صحیح محمد محمود رافعی۔ شرکۃ التمدن العناعم۔ مصر)

☆ میں علیؑ امیر المؤمنین کو پسند کرتا ہوں۔ لیکن ابو بکر اور عمر کو سرزنش نہیں کروں گا۔

☆ اگرچہ انہوں نے دختر رسولؐ کو فدک نہیں دیا اور ان کی میراث ان سے چھین لی۔ لیکن میں یہ نہیں کہوں گا کہ وہ کافر ہو گئے۔

☆ اللہ بہتر جانتا ہے کہ وہ دونوں قیامت کے دن کیا عذر پیش کریں گے۔

اس کے اشعار میں سے چند بیت اس نے عباسیوں کی حمایت میں کہے اور خالد کے بھائی اسد بن عبد اللہ قسری کے خلاف قیام پر خراسانیوں کو برا بھانتہ کیا۔ اسد اپنے بھائی کی جانب سے حکومت

خراسان میں تھا۔ چند آیات ملاحظہ ہوں۔

أَلَا أُنَبِّئُ جَمَاعَةً أَهْلِ مَرْوٍ عَلَىٰ مَا كَانُوا مِنْ نَارٍ وَ يُعَدِّ
رِسَالَةً نَاصِحٍ يُهْدِي سَلَامًا وَيَأْمُرُ فِي الدِّينِ زَكُوا بِجِدَّةٍ
فَلَا تَهْنُوا وَلَا تَرْضَوْا بِخُسْفٍ وَلَا يَغُرُّكُمْ أَسَدٌ بِعَهْدٍ
وَالَا فَارِقُوا الرِّيَابِ سَوْدًا عَلَىٰ أَهْلِ الضَّلَالَةِ وَالْتَعَدِّ

(شوق حنیف تاریخ الادب العربی۔ العصر الاسلامی، ص ۳۱۷)

- ☆ دور دراز کے بسنے والے اہل مرو کو پیغام پہنچا دو۔
- ☆ انہیں خیر و بھلائی کا پیام سنا دو کہ وہ تمہیں سلام بھیجتا ہے اور کہتا ہے کہ اپنے قیام پر ثابت قدم رہو۔
- ☆ تم سستی نہ دکھاؤ عقب نشینی نہ کرو اور اس کے دھوکے میں نہ آؤ۔
- ☆ چنانچہ سیاہ پرچوں کو اٹھائے رکھو اور گمراہوں اور ظالموں پر چڑھ دوڑو۔

☆☆☆☆☆

سید اسماعیل حمیری

ان کی پیدائش سنہ ۱۰۵ ہجری اور وفات سنہ ۱۷۳ھ میں ہوئی۔ پہلے یہ مذہب کیسانی پر تھے اور محمد بن حنفیہ کی امامت اور رجعت کا عقیدہ رکھتے تھے۔ بعد میں امامیہ مذہب کے پیروکار بن گئے۔ ان کا دیوان زیور طباعت سے کئی مرتبہ آراستہ ہوا۔ آخری مرتبہ یہ شاکر حادی شاکر کی سعی و کوشش اور صحیح کے ذریعے بیروت میں چھپا ہے۔

وَفَاطِمٌ قَدْ أَوْصَتْ بَأَن لَّا يُصَلِّيَا عَلَیْهَا وَأَن لَّا يَذْنُوَا مِنْ رَجَا الْقَبْرِ
عَلِیَّآ وَ مَقْدَادَا أَوْ أَن یَخْرُجُوا بِهَا رُوْنِدَا بِلَیْلِ فِی سُكُوتٍ وَ فِی سَمَرٍ

(مناقب: ج ۳، ص ۳۶۳ دیوان ص ۲۲۳-۲۲۴)

- ☆ حضرت فاطمہ (س) نے وصیت کی کہ فلاں دو شخص ان کی نماز جنازہ میں شریک نہ ہوں اور نہ ہی ان کی قبر پر آئیں۔
- ☆ فاطمہ نے علیؑ اور مقداد کو وصیت کی کہ انہیں رات کے سناٹے میں لوگوں سے چھپ کر خاموشی کے ساتھ سپرد خاک کریں۔
- ☆ فاطمہ تمام رشتہ داروں میں سے سب سے پہلے رحلت کریں گی اور مجھ سے ملحق ہوں گی ان کی وفات پر زیادہ آہ و فریاد نہ کرنا۔

إِنَّهَا أَسْرَعُ أَهْلِي مِیْنَةً وَ لِحَاقًا بِي، فَلَا تُكْثِرْ جَزَعُ
فَمَضَى وَ اتَّبَعْتَهُ وَالِهَا بَعْدَ غَيْضِ جَزَعْتَهُ وَ وَجَعُ

(دیوان ص ۲۸۹، مناقب ج ۳ ص ۳۶۲)

- ☆ رسول خداؐ کوچ کر گئے اور فاطمہؑ رنج و الم کے داغ سہنے کے بعد بڑے اشتیاق کے ساتھ ان کے پیچھے چلی گئیں۔

منصورِ نمری

منصور بن زبرقان بن مسلم یا مسلمہ بن زبرقان دوسری صدی ہجری کے شعراء میں سے ہیں۔ خاندان براکہ کے مدح خوان تھے۔ انہوں نے عباسیوں کی تعریف میں کئی قصائد لکھے۔ ان میں سے بعض میں بنی ہاشم کی توہین بھی کی گئی ہے۔ لیکن شوقی ضیف لکھتا ہے:

وہ شیعہ تھا اور اس تعریف و ستائش کو اس نے اپنے عقیدے کے لیے سہرا بنایا۔ ایک قصیدے میں جس کے چند اشعار میں نے ذکر کئے ہیں۔ اس طرح اس نے آل محمدؐ پر مظالم ڈھانے والوں کی مذمت کی ہے کہ ہارون نے اس قتل کا حکم جاری کر دیا۔ مگر اس کے حکم کے اجراء سے پہلے منصور فوت ہو گیا۔ اس کی وفات دوسری صدی ہجری کے اختتام پر ہوئی۔

تُفْتَلُ ذُرِّيَّةُ النَّبِيِّ وَبَرٌّ جُودَ جَنَانِ الْخُلُودِ لِلْقَاتِلِ
وَيَلْكَ يَا قَاتِلَ الْحُسَيْنِ لَقَدْ نَوَتْ بِحَمْلٍ يَنْوُءُ بِالْحَامِلِ
دِينُكُمْ جَفْوَةَ النَّبِيِّ وَمَا الْخَافِي لَالِ النَّبِيِّ كَالْوَاوِصِلِ
مَظْلُومَةً وَالنَّبِيَّ وَالْذُّهَاءَ قَرِيرُ أَرْجَاءِ مُقَلَّةٍ حَافِلِ
أَلَا مَصَالِيَتْ يَغْضَبُونَ لَهَا بِسَلَةِ الْبَيْضِ وَالْقَنَا الذَّابِلِ

(الشعر والشعراء: ص ۸۳۶-۸۳۷ اور تاریخ الادب العربی شوقی ضیف ج ۳ ص

۳۱۷۔ الاغانی: ج ۱۳ ص ۱۴۰، تاریخ بغداد ج ۱۳ ص ۶۵ اور مقالہ الطالعیین ص ۵۲۲)

☆ ذریت رسولؐ کو تہ تیغ کیا جا رہا ہے اور ان کے قاتلوں کے لئے بہشت جاوداں کی امیدیں لگائی جا رہی ہیں۔

☆ وائے ہو تجھ پر اے قاتل حسینؑ! تیرے کندھوں پر وہ سنگین بوجھ ہے جو اٹھانے والے پر مزید بھاری ہو جاتا ہے۔

- ☆ تمہارا دین رسول پر ظلم و ستم ہے۔ نجات اور حصول مقصد میں آل رسول کا دوست اور ان پر ظلم کرنے والا ایک درجے پر نہیں ہے۔
- ☆ ایک مظلومہ پیغمبر کی لخت جگر ہیں، جن کی آنکھوں سے اشک رواں ہیں۔
- ☆ بہادر اور شجاع شمشیر زن کہاں ہیں؟ کیوں انہیں غیرت نہیں لگا رہی اور کیوں وہ نیزہ و تلوار نہیں اٹھاتے؟

ان آیات کو ”الشعر و الشعراء“ کے تصحیح شدہ نسخے سے نقل کیا گیا ہے۔ اس کی تصحیح احمد محمد بن شاہ کرنے کی ہے۔ مذکورہ مآخذ اور منابع میں الفاظ کے نقل میں بہت زیادہ اختلاف پایا جاتا ہے۔ چوتھے شعر میں گرامر کی بھی ایک غلطی ہے۔ میں اپنے دانشور دوست جناب ڈاکٹر مہدوی دامغانی کا شکر گزار ہوں جنہوں نے ان صفحات کی نقول فراہم کیں۔

☆☆☆☆☆

دُعِیْل

ان کا نام ابو علی بن رزین بن عثمان بن عبداللہ بن بدیل اور لقب دُعِیْل ہے۔
قبیلہ خزاعہ سے ان کا تعلق ہے۔ سنہ ۱۳۸ھ میں پیدا ہوئے اور سنہ ۲۳۶ھ میں قتل
ہوئے۔ وہ تند و تیز زبان، صریح لہجے اور موت کے ڈر سے بے نیاز شاعر کے عنوان
سے پہچانے جاتے ہیں۔ ذیل میں مذکور ان کا قصیدہ تائبہ اشعار عربی کا ایک شاہکار،
جاوداں، نمونہ اور اہل بیت پیغمبر کی حرمت و توقیر کے دفاع کا مظہر ہے۔
جیسا کہ مشہور ہے کہ یہ قصیدہ امام علی بن موسیٰ الرضا (ع) کے سامنے پڑھا
گیا۔ اس قصیدے کے منتخب اشعار یہاں ذکر کیے گئے ہیں جو گزشتہ فصل میں اخذ شدہ
تاریخی نتائج کی تائید کرتے ہیں۔

أَلَمْ تَرَ لِلْإِيَامِ مَا جَرَّ جَوْرُهَا
عَلَى النَّاسِ مِنْ نَقْصٍ وَطَوِيلِ شِتَابِ
كَكَيْفَ وَمِنْ أَنَّى يُطَالَبُ زُلْفَةً
إِلَى اللَّهِ بَعْدَ الصُّومِ وَالصَّلَاةِ
يَسُوى حُبُّ ابْنَاءِ النَّبِيِّ وَرَهْطِهِ
وَبُغْضُ بَنِي الزُّرْقَاءِ وَالْقَبَلَاتِ
وَهِنْدٍ وَمَا أَذْثُ سُمِّيَتْ وَأَبْنُهَا
أُولُو الْكُفْرِ فِي الْإِسْلَامِ، وَالْفَجَرَاتِ
هُمْ نَقَضُوا عَهْدَ الْكِتَابِ وَفَرَضُوا
وَمُحْكَمَهُ بِالزُّوْرِ وَالشُّبُهَاتِ
تُرَاثٍ بِأَلْفِ قُرْبَى وَمُلْكٍ بِأَلْفِ هَدَى
لَوْ قَلَّدُوا الْمُوصَى إِلَيْهِ زِمَامُهَا
وَحُكْمٌ بِأَلْفِ شُورَى بِغَيْرِ هُدَاةٍ
سَقَى اللَّهُ قَبْرًا بِالْمَدِينَةِ غِيَّةً
لَزُمْتُ بِمَأْمُونٍ مِنَ الْعَثَرَاتِ
نَبِيُّ الْهُدَى صَلَّى عَلَيْهِ مَلِيكُهُ
فَقَدْ حَلَّ فِيهِ الْأَمْنُ بِالْبَرَكَاتِ
الْفَاطِمُ لَوْ خَلَبَ الْحُسَيْنَ مُجَدَّلًا
وَبَلَغَ عَنَّا رُوحَهُ التَّحَفَاتِ
إِذَنْ لِلظُّلُمِ أَخَذَ فَاطِمٌ عِنْدَهُ
وَقَدْ مَاتَ عَطْشَانًا بِشَيْطِ قُرَابِ
الْفَاطِمُ قُومِي يَا بَنَةَ الْخَيْرِ وَأَنْدَبِي
وَاجْرَيْتِ دَمْعَ الْعَيْنِ فِي الرَّجَنَاتِ
نُجُومَ سَمَاوَاتٍ بِأَرْضِ فَلَاةٍ

أَرَىٰ فَيَأْخُذُهُمْ فِي غَيْرِهِمْ مُتَقَسِّمًا وَ أَيْدِيَهُمْ مِنْ فَيَنْهَمُ صَفَرَاتِ
 دِيَارِ رَسُولِ اللَّهِ أَصْبَحْنَ بَلْقَعًا وَ آلُ زِيَادٍ تَسْكُنُ الْحُجُرَاتِ
 وَ آلُ رَسُولِ اللَّهِ تُلْذِمِي نُحُورَهُمْ وَ آلُ زِيَادٍ آمَنُوا السَّرْبَاتِ
 خُرُوجِ إِمَامٍ لَا مَخَالَفَةَ خَارِجٍ يَقُومُ عَلَى اسْمِ اللَّهِ وَ الْبَرَكَاتِ
 يُمَيِّزُ فِينَا كُلَّ حَقٍّ وَ بَاطِلٍ وَ يُجْزِي عَلَى النُّعْمَاءِ وَ النِّقَمَاتِ
 فَيَا نَفْسَ طَيِّبِي ثُمَّ يَا نَفْسَ أَبْشِرِي فَفَعِيرُ بَعِيدٍ كُلُّ مَا هُوَ آتٍ

(دیوانِ صبح - عبدالصاحب عمران دجلی، ص ۱۲۶-۱۲۷)

- ☆ کیا تم نہیں دیکھتے ہو کہ زمانہ کس طرح لوگوں پر اپنے مظالم کا جال پھیلا رہا ہے۔ انہیں ختم کر رہا اور ان کے اجتماع کو منتشر کر رہا ہے۔
- ☆ پس نماز اور روزے کے بعد کہاں سے اور کس طرح سے خدا کے نزدیک ہوا جاسکتا ہے؟
- ☆ ہاں! رسول اللہ کی بیٹیوں اور اقرباء سے محبت و دوستی اور بنی زرقا (مروان بن حکم) اور ان کے یاروں سے دشمنی کے ذریعے۔
- ☆ ہند، سہیہ (زیاد کی ماں) اور اس کے بیٹوں نے اسلام کے اندر کفر اور فسق و فجور کے جو کرتب دکھائے ہیں۔
- ☆ انہوں نے جھوٹ اور فریب کے ذریعے کتاب الہی کا پیمان توڑا اور اس کے واجبات ترک کیے اور اس کی تعلیمات کو پس پشت ڈال دیا۔
- ☆ جس میراث کے یہ حق دار نہ تھے اس پر قابض ہوئے اور ہدایت و مشورت کے بغیر حکم و حکومت کو چلایا۔
- ☆ اگر حکومت اور مسلمانوں کے امور کی باگ ڈور وحی رسول کے سپرد کر دیتے تو وہ انہیں بلا خوف و خطر راہ راست پر لے جاتے۔
- ☆ اللہ تعالیٰ بارانِ رحمت سے مدینے میں موجود قبر مقدس کو سیراب کرے کہ وہ امن اور برکات کا گہوارہ ہے۔
- ☆ ہادی برحق، ختم رسل پر خدا کے فرشتوں کا درود و سلام ہو اور ہماری طرف سے آپ کی روح پر ہدیہ سلام و درود ہو۔
- ☆ اے فاطمہ! کیا آپ کو پتہ ہے کہ آپ کا حسین فرات کے کنارے پیاسا مارا گیا۔
- ☆ اگر آپ ان کے پاس ہوتیں تو اپنا منہ پیئیں اور آنسوؤں کی لڑیاں پروتیں۔

- ☆ اے خیر البشر کی بیٹی فاطمہ! اٹھو اور ان آسمان کے ستاروں پر نوحہ کرو جو صحرا کی ریت پر پڑے ہیں۔
- ☆ میں دیکھتا ہوں کہ ان کا حق دوسروں میں تقسیم ہو رہا ہے اور ان کے ہاتھ اپنے مال سے خالی ہیں۔
- ☆ رسول اللہ کا گھرویران و برباد ہے جبکہ آل زیاد کے گھر میں رونقیں ہیں۔
- ☆ آل رسول کی گردنوں کو تہ تیغ کیا جاتا ہے اور آل زیاد آرام و سکون میں ہے۔
- ☆ لامحالہ امام و رہبر کو قیام کرنا چاہیے اور خدا کے نام اور برکات سے ظالموں سے برسر پیکار ہونا چاہیے۔
- ☆ جو حق کو باطل سے جدا کر دے، ظالم و سنگر کو کیفر کردار تک پہنچائے اور فرمانبردار کو نعمات سے نوازے۔
- ☆ اے دل! خوش ہو جا، اے دل! تجھے بشارت ہو کہ جو کچھ ہونا چاہیے وہ جلد ہو کر رہے گا۔

☆☆☆☆☆

سَلَامَةُ الْمُوصَلِي

لَمَّا قَضَتْ فَاطِمَةُ الزَّهْرَاءُ غَسَلَهَا عَنْ أَمْرِهَا بَغْلَهَا الْهَادِي وَ سَبَّحَاهَا
وَقَامَ حَتَّى أَتَى بَطْنَ الْبَقِيعِ بِهَا لَيْلًا فَصَلَّى عَلَيْهَا ثُمَّ وَاوَاهَا
وَلَمْ يُصَلِّ عَلَيْهَا مِنْهُمْ أَحَدٌ خَاشَا لَهَا مِنْ صَلَاةِ الْقَوْمِ خَاشَاهَا

(مناقب: ج ۳، ص ۳۶۳)

- ☆ جب فاطمہ (س) اس دنیا سے رخصت ہوئیں تو ان کی وصیت کے مطابق ان کے شوہر نامدار اور دو بیٹوں نے انہیں غسل دیا۔ (وضاحت: سبط کے معنی نواسہ یا پوتا زیادہ مشہور ہوئے ہیں لیکن اس کے دوسرے معنی حقیقی فرزند کے بھی ہیں۔) (لسان العرب)
- ☆ رات کی تاریکی میں جب سب لوگ محو خواب تھے ان کے شوہر ان کا جنازہ بقیع میں لائے۔ ان کی نماز جنازہ ادا کی اور ان کی قبر کو دنیا والوں کی نظروں سے مخفی رکھا۔
- ☆ (جن سے زہرا (س) ناراض تھیں) ان میں سے کوئی بھی ان کے جنازے میں شریک نہ ہوا کیونکہ انہیں ان کی نماز کی ضرورت نہ تھی۔

يَا نَفْسُ إِنْ تَلْتَقِي ظُلْمًا فَقَدْ ظَلِمْتَ بِنْتُ النَّبِيِّ رَسُولِ اللَّهِ وَ ابْنَاهَا
تِلْكَ الَّتِي أَحْمَدُ الْمُخْتَارُ وَاللَّهَ وَ جَبْرئِيلُ أَمِينُ اللَّهِ رَبَّاهَا
اللَّهُ طَهَّرَهَا مِنْ كُلِّ فَاحِشَةٍ وَكُلَّ رَيْبٍ وَصَفَّاهَا وَزَكَّاهَا

(مناقب: ج ۳، ص ۳۵۸)

- ☆ اے نفس! اگر تم پر مظالم ڈھائے جائیں تو کوئی بڑی بات نہیں۔ یہاں تو رسول اللہ کی بیٹی اور ان کے فرزندوں پر ظلم دسم کیا گیا۔

☆ وہ تو احمد مختارؒ کی لخت جگر تھیں اور ان کی پرورش کرنے والا جبرائیل امین تھا۔
☆ خدا نے انہیں ہر عیب اور نقص سے پاک کیا اور ہر برائی و نجاست سے طاہر قرار دیا۔

☆☆☆☆☆

صنوبری

احمد بن محمد بن حسن، زر کلی کی نقل کے مطابق سنہ ۳۳۴ھ میں فوت ہوئے۔
ابن کثیر نے ان کی وفات سنہ ۳۰۰ھ کے لگ بھگ بیان کی ہے جو کہ غلط ہے۔
ثعالبی نے یتیمہ میں، ابن ندیم نے الفہرست میں اور دیگر افراد نے ان اشعار کی
تعریف کی ہے۔

مَنْ ذَا لِفَاطِمَةَ الْهَفَاءِ يُنْبِئُهَا عَنْ بَغْلَهَا وَابْنِهَا إِنْبَاءَ لَهْفَانِ
مِنْ قَابِضِ النَّفْسِ فِي الْمَحْرَابِ مُنْتَصِبَا وَقَابِضِ النَّفْسِ فِي الْهَيْجَاءِ عَطْشَانِ
نَجْمَانِ فِي الْأَرْضِ بَلْ بَلْدَانِ قَدْ أَفْلَا نَعَمْ وَشَمْسَانِ أَمَا قُلْتُ شَمْسَانِ

(الحدید: ج ۲، ص ۳۷۱)

- ☆ ظلم و ستم سہنے والی فاطمہؑ کو کون خبر بتائے کہ ان کے شوہر اور بیٹے پر کیا گزری؟
- ☆ ایک محراب عبادت میں خون میں نہا گیا اور ایک میدان کارزار میں پیاسا مارا گیا۔
- ☆ وہ دو ستارے تھے جو زمین میں غروب ہو گئے بلکہ وہ دو چاند تھے۔ چاند کیا ہے؟ بلکہ خورشید بھی ان سے روشنی حاصل کرتا ہے۔

☆☆☆☆☆

ناشی صغیر

ان کا نام علی بن عبد اللہ بن وصیف اور کنیت ابو الحسن تھی۔ ان کی پیدائش سنہ ۲۷۱ھ اور وفات سنہ ۳۶۵ھ میں ہوئی۔ ان کا نام گزشتہ فصل میں بھی ذکر ہوا ہے۔ معجم الادباء کے مؤلف کی نقل کے مطابق کبودی کی مجلس میں ایک شخص نے اپنے آپ کو فاطمہ الزہراء کا پیام رساں ظاہر کیا اور احمد مزوق سے کہا کہ ناشی کے چند ابیات، جنہیں یہاں نقل کیا گیا ہے پڑھیں اور نوحہ کریں۔

بَنِي أَحْمَدٍ قَلْبِي لَكُمْ يَنْقَطِعُ بِمِثْلِ مُصَابِي فِيكُمْ لَيْسَ يَسْمَعُ
فَمَا بَقَعَةُ فِي الْأَرْضِ شَرْقًا وَ مَغْرِبًا وَ لَيْسَ لَكُمْ فِيهَا قَبِيلٌ وَ مَضَرَعٌ
ظَلِمْتُمْ وَ قَتَلْتُمْ وَ قَسَمَ فِيكُمْ وَ ضَافَتْ بِكُمْ أَرْضٌ فَلَمْ يَنْحَمْ مَوْضِعُ
عَجِبْتُ لَكُمْ تَفْنُونَ قَتْلًا بِسَيْفِكُمْ وَ يَسْطُو عَلَيْكُمْ مَنْ لَكُمْ كَانَ يَخْضَعُ
جُسُومٌ عَلَى الْبُوغَاءِ تُرْمَى وَ أَرْؤُسٌ عَلَى أَرْؤُسِ اللَّذَائِلِ تُرْفَعُ
كَأَنَّ رَسُولَ اللَّهِ أَوْصَى بِقَتْلِكُمْ وَ أَجْسَامُكُمْ فِي كُلِّ أَرْضٍ تُورَعُ

(معجم الادباء ج ۱۳ ص ۲۹۳ وفيات الاعيان ج ۵۱ ص ۵۱۳ القدر ج ۲ ص ۲۸)

- ☆ اے فرزند ان احمد! تمہاری مصیبت میں میرا دل ٹکرے ٹکرے ہے اور جو مصائب تم پر گزرے انہیں سننے کی تاب نہیں۔
- ☆ مشرق و مغرب میں کوئی ایسی زمین نہیں جہاں تمہارا خون نہ بہایا گیا ہو اور تمہیں قتل نہ کیا گیا ہو۔
- ☆ تم پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑے گئے۔ تمہیں خاک و خون میں غلطان کیا گیا۔
- ☆ تمہارے مال و جائیداد اور حق کو غارت کیا گیا۔ یہاں تک کہ زمین تم پر تنگ ہو گئی اور لوگ تم سے بدسرپیکار ہوئے۔
- ☆ میں تمہارے بارے میں سراپا حیرت ہوں کہ تمہاری ہی تلوار سے تمہیں ذبح کیا

☆ جارہا ہے اور جو تمہارے زیر دست تھے وہ تم پر حکم چلانے لگے ہیں۔
☆ تمہارے جسموں کو تھقی ریت پر لٹا یا گیا اور سروں کو نیزوں پر اٹھایا گیا۔
☆ (ان مظالم کو دیکھ کر یوں لگتا ہے) جیسے رسول اللہ نے وصیت کی ہو کہ تمہیں قتل کیا جائے اور تمہارے جسموں کو روئے زمین پر پھیلا دیا جائے۔

☆☆☆☆☆

ابن حماد

علی بن حماد بن عبید اللہ بن حماد بصری شیعہ شاعر تھے۔ آپ چوتھی صدی ہجری کی شخصیت ہیں۔ مناقب ابن شہر آشوب میں ان کے اشعار مختلف مناسبتوں سے مذکور ہیں۔ ان کے حالات زندگی رجال اور تذکرے کی کتابوں میں موجود ہیں۔ ان کے مفصل ترین حالات زندگی القدر کی چوتھی جلد میں مذکور ہیں جہاں ان کے طولانی قصائد بھی بیان ہوئے ہیں۔

وَرَوَى لِي عَبْدُ الْعَزِيزِ الْجَلُودِيُّ وَقَدْ كَانَ صَادِقًا مَبْرُورًا
عَنْ إِهَابَةِ الْحَدِيثِ أَغْنَى الْعَالَمِي هُوَ أَكْرَمُ بِذَا وَذَا مَذْكُورًا
يُسَيِّدُهُ عَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ يَوْمًا قَالَ كُنَّا عِنْدَ النَّبِيِّ حُضُورًا
إِذَا تَنَهَّى الْبَتُولُ فَاطِمَةُ تَبْكِي وَتُوَالِي شَهيقَهَا وَالزَّفِيرَا
قَالَ مَالِي أَرَاكَ تَبْكِينَ يَا فَاطِمَةُ قَالَتْ وَأَخْفَتِ التَّغْيِيرَا
اجْتَمَعْنَ النِّسَاءُ نَحْوِي وَاقْبَلْنَ يُطْلَنَ التَّقْرِيعُ وَ التَّغْيِيرَا
قُلْنَ إِنَّ النَّبِيَّ زَوَّجَكَ الْيَوْمَ عَلَيْنَا بَغْلًا عَدِيمًا فَقِيرًا
قَالَ يَا فَاطِمَةُ اسْمَعِي وَاشْكُرِي اللَّهَ فَقَدْ نِلْتِ مِنْهُ فَضْلًا كَبِيرًا
لَمْ أَرْوِجْكَ ذُونِ إِذْنٍ مِنَ اللَّهِ وَمَا زَالَ يُحْسِنُ التَّدْبِيرَا

☆ میں نے تمہاری شادی حکم خدا کے سوا نہیں کی اور خدا اپنے بندوں کے لیے احسن تدبیر کرتا ہے۔

☆ مجھ سے عبدالعزیز جلودی نے روایت کی ہے جو سچے اور پاکباز انسان ہیں۔

☆ ان کا شمار ثقات حدیث میں ہوتا ہے اور وہ امانت اور بزرگواری میں معروف ہیں۔

☆ انہوں نے سند معتبر سے ابن عباس سے روایت کی ہے کہ ایک دن ہم رسول خدا

- ☆ کی خدمت میں حاضر تھے۔
- ☆ فاطمہ زہرا (س) آپ کے پاس آنسو بہاتی، دردِ دل بیان کرتی اور عورتوں کا شکوہ کرتی ہوئی آئیں۔
- ☆ آنحضرتؐ نے پوچھا: بیٹی تمہیں کس بات نے رلایا ہے؟ تو انہوں نے جواب دیا
- ☆ مجھے عورتوں کے طعنوں اور ان کی زبانوں کے زخموں نے رلایا ہے۔
- ☆ عورتوں نے آج کہا ہے کہ رسولؐ خدا نے تمہیں علیؑ جیسے نادار فقیر شوہر کے ساتھ بیاہ دیا ہے۔
- ☆ آپؐ نے فرمایا: اے فاطمہ! غور سے سنو۔ خداوند تعالیٰ کا شکر ادا کرو کہ اس نے تمہیں عظیم فضل سے نوازا ہے۔

☆☆☆☆☆

يَا بَنِي اَحْمَدٍ عَلَيْنَكُمْ عَمْدِي وَ اِتَّكَلِيْ اِذَا اَرَدْتُ النُّشُوْرَا
و بِكُمْ يَسْعِدُ الْمَوَالِي وَيَنْشَقِيْ مَنْ يُعَادِيَكُمْ وَ يُضْلِيْ سَعِيْرًا^(۱)

- ☆ اے رسول اللہ کے فرزندو! قیامت کے دن میرا سہارا اور میری امیدوں کا مرکز آپ ہیں۔
- ☆ تمہارے دوست اور محب، سعادت مند اور خوشحال ہیں اور تمہارے دشمن بد بخت اور آتشِ جہنم میں جلتے رہیں گے۔

☆☆☆☆☆

(۱) الفدر: ج ۳ ص ۱۶۷-۱۶۸۔ مناقب نے ان ابیات کو عہدی کوئی کے نام سے لکھا ہے لیکن ”الفدر“ کے مصنف نے ابنِ حماد کے نام سے جو قصیدہ نقل کیا ہے یہ اشعار اس قصیدے کا حصہ ہیں۔

مہیار د یلمی

ابوالحسن مہیار مرزویہ پہلے دین زرتشت کے پیروکار تھے۔ اس کے بعد شریف رضی (نچ البلاغہ کو جمع کرنے والے) کے ہاتھوں پر اسلام قبول کیا۔ شاعری شریف رضی سے نیکی اور پھر اس میں شہرت کی بلندیوں پر پہنچے۔ سنہ ۳۲۸ھ میں وفات پائی۔

(مقدمہ دیوان -- طبع دارالکتب اور وفیات الاعیان و دیگر مصادر)

الْأَسْلَ قُرَيْشًا وَ لَمْ مِنْهُمْ
وَقُلْ: مَا لَكُمْ بَعْدَ طُولِ الضَّلَا
أَتَاكُمْ عَلَى فِتْرَةٍ فَانْتَقَام
وَوَلَّى حَمِيدًا إِلَى رَبِّهِ
وَقَدْ جَعَلَ الْأَمْرَ مِنْ بَعْدِهِ
وَسَمَاءَ مَوْلَىٰ بِأَفْرَارٍ مَنْ
فَعَلْتُمْ بِهَا حَسَدَ الْفَضْلِ عَنْهُ
وَقُلْتُمْ بِذَاكَ قَضَى الْأَجْتِمَاعِ
سَيَقْلَمُ مَنْ فَاطِمُ خَضْمُهُ
مَنْ اسْتَوْجَبَ اللُّؤْمَ أَوْفَيْدِ
لَمْ تَشْكُرُوا نِعْمَةَ الْمُرْسِدِ؟
بِكُمْ جَانِبَيْنِ عَنِ الْمَقْصِدِ
وَمَنْ مَسَّنْهُ يُحْمَدُ
لِيَحِيدَ بِالْخَبَرِ الْمُسْنَدِ
لَوْ اتَّبَعَ الْحَقُّ لَمْ يُجْحِدِ
وَمَنْ يَكُ خَيْرَ الْوَرَى يُحْسِدِ
إِنَّمَا الْحَقُّ لِلْمُفْرَدِ
بِأَيِّ نِكَالٍ غَدَا يَرْتَدِي

(دیوان مہیار۔ طبع دارالکتب۔ ج ۱ ص ۲۹۸۔ ۳۰۰)

ہاں! قریش سے سوال کرو اور انہیں ملامت و سرزنش کا مستحق سمجھو۔
کہو! ایک طویل عرصہ ضلالت و گمراہی میں گزرنے کے بعد تم نے رہبر اور ہادی
کی نعمت پر شکر ادا کیوں نہیں کیا؟
جب دنیا جہالت و گمراہی کے اندھیروں میں سرگرداں تھی انہوں نے تم منخر

☆

☆

☆

- لوگوں کے لیے چراغ ہدایت روشن کیا۔
- ☆ وہ مقرب درگاہ حق ہوئے اور جو ان کی سنت پر چلا وہ بھی قابل ستائش ہوا۔
- ☆ اپنے بعد انہوں نے امت کے امور حیدر کے سپرد کیے اور یہ حدیث درست اور قابل اعتماد ہے۔
- ☆ علیؑ کی فضیلت و برتری سے حسد کی بناء پر تم نے خلافت کو کسی اور کے حوالے کر دیا اور جو سب سے افضل ہیں دنیا ان سے حسد کرتی ہے۔
- ☆ تم نے کہا کہ یہ اکثریت کا فیصلہ ہے تم نے حق کے فیصلے کو تسلیم نہ کیا۔
- ☆ اور آپؐ نے انہیں ”مولیٰ“ کا لقب دیا جس نے سنا اور قبول کیا۔ اگر کوئی حق کا تابع ہو تو وہ انکار نہیں کرے گا۔
- ☆ جو فاطمہ زہرا (س) کا دشمن ہے اسے جلد معلوم ہو جائے گا کہ کل اس کے لیے کون سا عذاب تیار کیا ہوا ہے؟

☆☆☆☆☆

ابن العودی

سنہ ۴۷۸ھ میں پیدا ہوئے اور سنہ ۵۵۸ھ ہجری میں وفات پائے۔

مَنْعُمْ تَرَالِي ابْنَتِي لَا أَبَا لَكُمْ فَلَمِ اَنْتُمْ آبَاءُكُمْ قَدْ وَرِثْتُمْ
وَقُلْتُمْ نَبِيٌّ لَا تَرَاثُ لِوَلَدِهِ اِلَّا جَنَبِيْ اَلَا زُفْرٌ فِيمَا رَعَمْتُمْ
فَهَذَا سُلَيْمَانُ لِداوُدَ وَاَرَاثُ وَ يَحْيَى لِزَكَرِيَّا فَلَمِ ذَا مَنْعْتُمْ

- ☆ تم نے اپنے آباء سے تو میراث پائی ہے لیکن تم کیوں میری بیٹی سے میری وراثت چھینتے ہو۔
- ☆ تم کہتے ہو کہ پیغمبرؐ اپنی اولاد کے لیے وراثت نہیں چھوڑتا۔ کیا تمہارے خیال میں بیگانہ وراثت کا حقدار بن سکتا ہے؟
- ☆ یحییٰ زکریا کا وارث تھا اور داود کا وارث سلیمان (علیہم السلام) تھا۔ میری بیٹی کو تم نے کیوں وراثت سے محروم کر دیا۔

☆☆☆☆☆

علاء الدین حلی

ان کا نام ابوالحسن علاء الدین علی بن حسین حلی ہے۔ یہ چھٹی صدی ہجری کے علماء اور شعراء میں سے ہیں۔ ان کے سات قصیدے معروف ہیں۔ یہ شہید اول کے ہم عصر ہیں اور شہید اول نے ان قصائد میں سے ایک کی تشریح کی ہے۔

وَاجْمَعُوا الْأَمْرَ فِيمَا بَيْنَهُمْ وَعَوْتُ لَهُمْ أَمَانِيَهُمْ وَالْجَهْلُ وَالْأَمَلُ
أَنْ يُحْرِقُوا مَنْزِلَ الزُّهْرَاءِ فَاطِمَةَ قِيَا لَهُ حَدِيثُ مُسْتَضْعَبٍ جَلَلُ
بَيْتُ بِهِ خَمْسَةُ جَبْرِيلُ سَادِسُهُمْ مِنْ غَيْرِ مَا سَبَبِ بِالنَّارِ يُشْتَعَلُ

(القدر ج ۶، ص ۳۹۱ قصیدہ ہفتم)

☆ امیدوں آرزوؤں اور جہالت نے انہیں ورغلا یا۔ وہ ایک امر پر اکٹھے اور متفق ہو گئے۔

☆ فاطمہ زہرا (س) کے گھر کو جلا دیا جائے! کتنا بڑا کام اور کتنا کٹھن اور دشوار امر!
☆ جس گھر میں بچپن پاک اور چھٹے جبرائیل ہوں اسے کسی وجہ کے بغیر کیوں آگ کے شعلوں کی نذر کیا جائے!

☆☆☆

و دَارُ عَلِيٍّ وَ الْبَتُولِ وَ أَحْمَدُ وَ شَبَّهَهَا مَوْلَى الْوَرَى وَ شَبَّهَهَا
مَعَالِمَهَا تَبَكَّى عَلَى غُلَمَائِهَا وَ زَانَتْهَا تَبَكَّى لِفَقْدِ مَزُورِهَا
مَنَازِلُ وَحْيِ أَفْقَرَتْ فَضْدُورُهَا بَوَاحِشَتِهَا تَبَكَّى لِفَقْدِ صُدُورِهَا

(القدر ج ۶، ص ۳۷۶ قصیدہ دوم)

- ☆ علی و بتول، پیغمبرؐ اور ان کے دو بیٹے شبیر اور شیر جو مخلوقات میں افضل ہیں کا گھر۔
- ☆ اس کے گھر کے در و دیوار اس کے مکینوں کے فراق میں گریاں و نالاں ہیں اور اس کے زائر گھر کے مالک کو نہ پا کر آنسو بہا رہے ہیں۔
- ☆ نزول وحی کے مقامات بے آب و گیاہ بیابان کی طرح ہو گئے اس گھر کا ماحول اپنے بانیوں کے غم فراق اور وحشت و تنہائی سے نوحہ کتا ہے۔

☆☆☆☆☆

فارسی شاعری
میں
حضرت فاطمہ (س) کا ذکر

.

.

جیسا کہ آپ نے گزشتہ باب میں ملاحظہ کیا، دوسری صدی ہجری کے وسط سے حکومت دمشق کے رجحان کے برعکس عربی شاعری میں خاندان رسالت سے محبت کے آثار پیدا ہو گئے تھے۔ (۱) اس شاعری میں ان کا حق پر ہونا، ان کی مصیبت پر سو گواہی اور ان پر ڈھائے جانے والے مظالم کے خلاف اظہار نفرت شامل ہیں اور بعض اوقات ان لوگوں کی بھی مذمت کی گئی ہے جو اس ظلم کا باعث تھے۔

یہاں صرف ان اشعار کا انتخاب کیا گیا ہے جو دختر پیغمبرؐ کی زندگی سے متعلق تھے۔ کیونکہ جو اشعار امیر المومنین حضرت علیؑ اور واقعہ کربلا کے بارے میں کہے گئے ہیں وہ اتنے زیادہ ہیں کہ ان کے لئے کئی بڑی جلدیں درکار ہوں گی۔

۱۳۲ھ میں بنی امیہ کی حکومت کے خاتمہ کے بعد ان جیسے شاعروں کو بیان کرنے کے لیے وسیع تر میدان ملا اور باوجود اس کے کہ عباسی لوگ اولاد علیؑ سے دل سے خوش نہیں تھے لیکن خاندان بنی امیہ کے باقی ماندہ لوگوں کی بیخ کنی کے لئے انہوں نے بنی ہاشم کی مدح کرنے والوں کو آزاد چھوڑ دیا تھا۔ اگر وہ لوگ خاندان رسالت کی مدح کے ساتھ عباسی خاندان کی بھی تعریف کرتے تھے تو ان کو اس کا صلہ اور انعام بھی ملتا تھا۔ بہر حال ان کی آزادی صرف وہاں تک محدود تھی کہ اولاد علیؑ کی مدح کے ساتھ عباسیوں کی مذمت نہ ہو، ورنہ ان کی جان کی خیر نہ ہوتی۔

جیسا کہ آپ نے منصور نمری کے بیان میں ملاحظہ کیا ہے بعض اوقات بعض عباسی فرمانروا جیسے متوکل اور مختصم اولاد علیؑ سے کم ترین محبت بھی برداشت نہیں کرتے تھے اور ان کی مدح کرنے والے شعراء کو ایذا رسانی سے باز نہیں آتے تھے۔

بغداد میں دیکھیوں کے تسلط کے ساتھ اس شہر میں جو کئی سال پہلے ہی شیعہ شعراء کا مرکز بن گیا تھا ایسی انجمنوں کی تشکیل عمل میں آئی جن میں اہل بیت کی فضیلت بیان ہوتی اور لوگ ان کی

(۱) ان اشعار سے مراد وہ اشعار ہیں جو آل نبی کی مظلومیت بیان کرتے ہیں۔ وگرنہ مدینہ میں حکومت اسلامی کے آغاز سے ہی اہل بیت کی مدح میں اشعار کہے گئے۔

مظلومیت پر گریہ و زاری کرتے۔ اس طرح کی انجمنوں کی مثال اس باب میں جس کا عنوان ”تاریخ سے عبرت“ ہے محترم قاری کی نظر سے گزر چکی ہے۔

فارسی شاعری میں، جیسا کہ اس باب میں ملاحظہ کریں گے، رسول اکرمؐ کی مدح اور علیؑ اور خاندان علیؑ سے محبت چوتھی صدی ہجری سے شروع ہو گئی تھی اگرچہ ان اشعار کی تعداد (جو ہماری دسترس میں ہیں) سامانی، غزنوی، سلجوقی اور خوارزم شاہی ادوار میں کم ہے۔

ان اشعار میں جو دردی زبان کے اولین اشعار کے طور پر دئے گئے ہیں فطرت کی تصویر کشی اور حکومت وقت کی تعریف کے علاوہ ہمیں کچھ نہیں ملتا۔

کیا یہ کہا جاسکتا ہے کہ اسلامی دور کے ایران میں عام فارسی اشعار جو چوتھی صدی ہجری تک دردی یا دوسرے ایرانی لہجوں میں کہے گئے صرف اسی طرح کے اشعار تھے؟ اگرچہ اس سوال کا جواب مثبت نہیں دیا جاسکتا، لیکن یہ خیال بھی نہیں کیا جاسکتا کہ ہمارے موضوع بحث کے بارے میں اشعار کہے گئے ہوں گے۔ ایسی صورت میں اس کا سبب کیا ہے؟ کیا اس کا سبب حکومت کا سخت دباؤ تھا؟ اس احتمال کا امکان ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ سنہ ۴۳ھ سے ولید بن عبدالملک بن مردان کی حکومت کے خاتمہ تک ایران اور مشرقی علاقوں پر بعض حاکموں کا دباؤ تھا جیسے زیاد، عبید اللہ (بن زیاد)، حجاج بن یوسف، ابن اشعث اور ایسے دوسرے حکام جن کے ماتحت لوگ زندگی گزار رہے تھے۔ لیکن کیا سبب ہے کہ مدینہ میں جو خاندان بنو امیہ کے براہ راست زیر نظر تھا کیت جیسا شاعر جو بنو ہاشم کی مدح کرتا تھا، پیدا ہوا جبکہ نیشاپور، طوس، غزنی اور ہرات میں اس جیسا شاعر نظر نہیں آتا؟

کیا یہ کہا جاسکتا ہے کہ پہلی صدی ہجری میں ایرانی لوگوں کو خاندان رسالت اور جو کچھ ان کے ساتھ پیش آیا، اس کی کوئی خبر نہ تھی؟ اس احتمال کا ہرگز امکان نہیں ہے۔ اس سے قطع نظر، ولید بن عبدالملک کی سلطنت سے مردان بن محمد کے خاتمہ تک تقریباً نصف صدی کے دوران جبکہ ایران میں حکومت کے مخالف اپنے کام میں سرگرم تھے اور خاندان رسالت کے فرزند حضرت امام رضا (ع) کی حکومت کے حق میں نعرے لگا رہے تھے، کیا کہا جاسکتا ہے؟ کیا اس زمانے میں کسی قسم کے اشعار جو اس رجحان کے آئینہ دار ہوں نہیں کہے گئے ہوں گے؟ ہم جانتے ہیں کہ شاعری عوام کے جذبات اور احساسات کو براہِ مختصر کرنے میں نہایت اہم کردار ادا کرتی ہے۔ کیا کہا جاسکتا ہے کہ حکومتوں اور ان کے کارندوں نے اس قسم کے اشعار کو غائب کر دیا ہو گا؟ اگر ایسا ہے تو یہی عمل عربی اشعار کے ساتھ کیوں نہیں کیا گیا؟ بعض اشعار کا مضمون خلفائے بنو امیہ اور بنو عباس کی براہ راست مذمت تھا۔ جبکہ اگر اس قسم کے اشعار فارسی میں کہے جاتے تو صنعاری، سامانی یا غزنوی خاندانوں کے حکام کو اس پر کوئی اعتراض نہ ہوتا، کیونکہ ان مظالم میں ان کا کوئی ہاتھ نہیں تھا۔

یہ بات صحیح ہے کہ ہمارا موضوع بحث دردی شاعری ہے اور اس لہجہ کو تیسری صدی ہجری سے

سرکاری حیثیت حاصل ہو گئی تھی۔ لیکن (تعب اس بات پر ہے کہ) ان عربی اشعار میں بھی جو ایران کے عربی گو شعراء نے کہے ہیں اس قسم کے نمونے نہیں ملتے۔ چوتھی صدی ہجری سے یعنی مرکزی ایران میں شیعہ حکومتوں کے قیام کے زمانہ میں ان مضامین کے نمونے کبھی کبھی فارسی شاعری میں نظر آتے ہیں، مثلاً کسائی مروزی کہتا ہے:

☆ مدحت کن بستای کسی را کہ پیغمبرؐ بستود و ثنا کرد و بدو داد همه کار
تم اس کی تعریف اور ستائش کرو جس کی تعریف و ستائش اور ثنا پیغمبر نے کی اور
تمام کام اس کے سپرد کر دیئے۔

یا فردوسی کے یہاں یہ نمونہ ملتا ہے:
☆ چنین زادم وهم بدین بگزردهمین دان کہ خاک رہ حیدرم
میں اسی طرح پیدا ہوا اور اسی طرح سے اپنی زندگی گزار دوں گا۔ تمہیں سمجھ لینا
چاہیئے کہ میں حیدر کی خاک راہ ہوں۔

یا خضارِی رازی کے یہ اشعار ہیں:
☆ مرا شفاعت این پنجتن بسندہ بود کہ روز حشر بدین پنجتن رسانم تن
بہین خلق و برادرش و دختر و دو پسر محمدؐ و علیؑ و فاطمہؑ حسینؑ و حسنؑ
میرا سہارا اور میرا اعتماد پنجتن آل عبا کی شفاعت پر ہے۔ میں روز حشر پنجتن پاک
کا دامن تھاموں گا۔
☆ کائنات کی بہترین مخلوق اور اس کا بھائی اور اس کی بیٹی اور اس کے دو بیٹے یعنی محمد
و علی و فاطمہ حسن و حسین (علیہم السلام)

چوتھی صدی ہجری کے اواخر میں جب فاطمیوں نے مصر پر قبضہ کر لیا اور مضبوط حکومت کی
بناء ڈالی اور ان کی شہرت دوسرے اسلامی ممالک میں پہنچی تو مشرقی ایران میں بعض حامی پیدا ہو گئے۔
اس خطہ کے فارسی گو شعراء نے اہل بیتؑ کی مدح میں زبان کشائی کی جس کی ممتاز مثال ناصر خسرو
علوی ہے۔ تاہم پانچویں اور چھٹی صدی ہجری میں سراسر ایسے اشعار جو فارسی میں اہل بیتؑ کی مدح میں
کہے گئے، زیادہ نہیں ہیں۔ تعب اس بات پر ہے کہ پانچویں صدی ہجری میں شیعوں نے بغداد اور عباسی
حکومت کے مرکز میں انجمنیں قائم کیں جن میں اہل بیتؑ کے مصائب پر گریہ وزاری کرتے تھے اور

اس قسم کی انجمنوں کا نمونہ اس باب میں جس کا عنوان ”تاریخ سے عبرت“ ہے قاری کی نظر سے گزر چکا ہے۔ لیکن مشرقی ایران میں مرکز خلافت سے دور ترین نقطہ میں ناصر خسرو بیچارہ در بدر ایک ویرانہ سے دوسرے ویرانہ میں اپنی جان بچاتا پھرتا رہا۔

اس قسم کی سخت گیری کو بنو عباس کے حساب میں ڈالنا چاہیے یا ان مقامی حکومتوں کی اچھی خدمت کے حساب میں جو اپنے استحکام کی خاطر کوشش کرتی تھیں کہ جس طرح بھی بنو عباس کی خوشنودی حاصل کی جائے، یا اس خطہ کے لوگوں کی اہل سنت و الجماعت سے سخت وابستگی کے حساب میں یا ان لوگوں کی تھوڑی مزاحمت کے بعد حالات کو بدستور قبول کرنے کے حساب میں ڈالنا چاہیے۔ البتہ یہ ایک جداگانہ بحث ہے کہ ایک ہزار سال گزرنے کے بعد جو کچھ اس بارے میں لکھا جائے وہ خیال و گمان سے زیادہ نہیں ہو گا جس کا سرچشمہ بحث کرنے والے کا اپنا جذبہ یا طرز تفکر ہو گا۔

بہر حال جیسا کہ ہم عرض کر چکے ہیں مشرقی ایران میں دری لہجہ کی پیدائش سے ساتویں صدی کی پہلی دہائی تک فارسی شاعری میں اہل بیتؑ کی تعریف میں بہت کم نمونے ملتے ہیں اور دختر رسول (س) کا نام ان بعض اشعار میں کنایہ یا ضمناً دکھائی دیتا ہے۔ ایران پر منگولوں کے حملہ کے ساتھ ہی سو سال سے زیادہ مدت تک ہر چیز درہم برہم ہو گئی اور آٹھویں صدی ہجری میں کہیں جا کر شیعہ شعراء نے ایران کے مختلف علاقوں میں اہل بیتؑ کی مدح میں زبان کھولی۔

اس باب کے آخر میں ان اشعار کے نمونے محترم قارئین کی نظر سے گزریں گے اور جیسا کہ ہم ملاحظہ کریں گے ان مدحیہ اشعار میں طویل ترین اشعار خواجہ کرمانی اور ابن حسام خوشنوی کے ہیں۔

اس باب میں جو اشعار درج کئے گئے ہیں وہ نویں صدی ہجری کے اختتام تک کے ہیں کیونکہ دسویں صدی ہجری میں ایران میں شیعہ مذہب کو سرکاری حیثیت دے دی گئی۔ اس دور میں اہل بیتؑ کی مدح میں اشعار اور ان کے مرثیے فارسی شاعری کا اہم حصہ قرار پاتے ہیں۔



ناصر خسرو

ابومعین ناصر خسرو بن حارث قبادیانی بلخی جس کی ولادت سنہ ۳۹۴ھ اور وفات سنہ ۴۸۱ ہجری قمری میں ہوئی اسماعیلی شیعوں میں سے تھا اور فاطمی خلفاء کا مداح تھا اور خراسان میں ان کی طرف سے ”حجت“ مقرر کیا گیا تھا۔ حضرت فاطمہؑ کی شان میں اس کے اشعار حسب ذیل ہیں۔

آنروز در آن هول و فزع بر سر آن جمع پیش شہدا دست من و دامن زہرا
تا داد من از دشمن اولاد پیمبر بدهد بتمام ایزد داد ارتعالی

(دیوان تقوی ص ۴)

شمس وجود احمد و خود زہرا ماہ ولایتست ز اطوارش
دخت ظہور غیب احد احمد ناموس حق و صندوق اسرارش
ہم مطلع جمال خداوندی ہم مشرق طلیعہ انوارش
صد چون مسیح زندہ ز انفاسش روح الامین تجلی پندارش
ہم از دمش مسیح شود پران ہم مریم دسیہ ز گفتارش
ہم ماہ بارد از لب خندانش ہم مہر ر یزد از کف مہیارش
این گوہر از جناب رسول اللہ پاکست و داور است خریدارش
کفوی نداشت حضرت صدیقہ گرمی نبود حیدر کرارش
جنات عدن خاک در زہرا رضوان زہشت خلد بود عارش
رضوان بہشت خلد نیارد سر صدیقہ گر بحشر بود یارش
باکش ز ہفت دوزخ سوزان نی زہرا چو ہست یارو مدد کارش

(دیوان ص ۲۰۹)

گفتا کہ منم امام و میراث بستد زنبیر گان و دختر

صعبی تو و منکری گر این کار نزدیک تو صعب نیست و منکر
ورمی بر وی توبا امامی کاین فعل شده است زومشهر
من با تونیم که شرم دارم از فاطمه و شبیر و شبر

(ناصر خسرو. دیوان. مینوی و محقق ص ۹۲)



سنائی

اس کا نام ابوالمجد مجدو دین آدم ہے۔ اس کا شمار پانچویں اور چھٹی صدی کے شعراء میں ہوتا ہے۔ وہ چھٹی صدی کے اوائل (۵۱۸ھ) میں فوت ہوا۔

نشوی غافل از بنی ہاشم و ز ید اللہ فوق ایدیہم
داد حق شیر این جهان ہمہ را جز فطامش نداد فاطمہ را

(حدیقہ، مدرس رضوی ص ۲۶۱)

در صفت کربلا و نسیم مشہد معظم

آل یاسین بدادہ یکسر جان عاجز و خوار و بی کس و عطشان
کردہ آل زیاد و شمر لعین ابتدای چنین تہ در دین
مصطفی جامہ جملہ بدریدہ علی از دیدہ خون بیاریدہ
فاطمہ روی را خراشیدہ خون بیاریدہ بی حد از دیدہ

(حدیقہ ص ۲۷۰)

☆☆☆☆☆

قوامی رازی

بدرالدین قوامی کا شمار چھٹی صدی ہجری کے پہلے نصف کے معروف شعراء میں ہوتا ہے۔ وہ چھٹی صدی ہجری کے دوسرے نصف میں فوت ہوا۔

در مرثیۃ سید الشهداء

زہرا و مصطفیٰ و علی سوختہ زدرد ماتم سرای ساخته بر سدرہ منتھا
در پیش مصطفیٰ شدہ زہرای تنگدل گریان کہ چیست درد حسین مرا دوا

☆☆☆

ایشان درین کہ کرد حسین علی سلام جدش جواب داد و پدر گفت مرحبا
زہرا ز جای جست وبہ رویش دراو فتاد گفت ای عزیز ماتو کجانی وما کجا
چون رستی از مصاف وجہ کردند باتوقوم مادر در انتظار تودیر آمدی چرا

☆☆☆

حب یاران پیمبر فرض باشد بی خلاف لیکن از بہر قرابت هست حیدر مقتدا
بود با زہرا و حیدر حجت پیغمبری لا جرم بنشانند پیغمبر سزائی باسزا

(دیوان، ص ۱۲۶، ۱۲۷)

☆☆☆☆☆

اثیر اخسیکتی

اس کا شمار ساتویں صدی ہجری کے شعراء میں ہوتا ہے۔ اس کی وفات سنہ ۵۷۷ یا ۵۷۹ قمری میں ہوئی۔

سبزہ فکنده بساط برطرف آبگیر لاله حقہ نمای شعبده بوالعجب
پیش نسیم ارغوان قرطہ خونین بکف خون حسینیان باغ کردہ جو زہرا طلب
(دیوان رکن الدین ہمایوں فرخ ص ۲۷)



خواجہ کرمانی

اس کا نام ابوالعطا کمال الدین محمود مرشدی ہے وہ سنہ ۶۸۹ھ میں پیدا ہوا اور
۷۵۳ھ میں فوت ہوا۔

روشنان قصر کحلی گرد خاک پای او سرمہ چشم جهان بین ثریا کردہ اند
بارجود شمسہ گردون عصمت فاطمہ زہرہ را این تیرہ روزان نام زہرا کردہ اند
خون او را تحفہ سوی باغ رضوان بردہ اند تا از آن گلگونہ رخسار حورا کردہ اند



باز دیگر بر عروس چرخ زیور بستہ اند پردہ زر بفت بر ایوان اخضر بستہ اند
چرخ کحلی پوش را بند قبا بگشودہ اند کوہ آہن جنگ را زرین کمردر بستہ اند
اطلس گلریز این میما بگون خرگاہ را نقش پردازان چینی نقش ششتر بستہ اند
مہد خاتون قیامت می برند از بہر آن دیدہ بانان فلک را دیدہ ہا پرستہ اند
دانہ ریزان کبوتر خانہ روحانیان نام اہل بیت ہر بال کبوتر بستہ اند
دل در آن تازی غازی بند کاندلر غروروم تاز یانش شیبہ اندر قصر قیصر بستہ اند

(دیوان، ص ۱۳۳-۱۳۴)



منظومہ محبت زہرا وآل او بر خاطر کواکب از ہر نوشتہ اند

دوشیز گان پردہ نشین حریم قدس نام بتول برسر معجر نوشتہ اند
(دیوان، ص ۵۸۳)



از آن بوصلت او زہرہ شد بدلالی کہ از شرف قمرش در سراچہ دربان بود
چون شمع مشرقی از چشم سائر انجم زبس اشعۃ انوار خویش پنهان بود
نگشت عمروی از حی فزون ز روی حساب چرا کہ زندگی او بجای حنان بود
ورای ذر وۃ افلاک آستانہ اوست زمر غزار فردا پس آب ودانہ اوست
بدستہ بندر یا حین باغ پیغمبر کہ بود نیرۃ برج قدس را خاور
عروس نہ تنق ۲ لالہ برگ ہفت چمن ۳ تذر و ہشت گلستان ۴ و شمع شش منظر
ز نام اوشدہ نامی سہ فرع ۵ و چار اصول ۶ بیمن اوشدہ سامی دو کاخ و پنج قمر ۷
کھینہ سوری ۸ بیت العروس اوسارۃ ۹ کمینہ جاریۃ خانہ دار او ہاجر۱۰
بمطبخش فلک دود خوردہ را در پیش زمہ طبقۃ سیم زمہر ہاون زر
ز سفرۃ انا املح ۱۱ طعام او نمکین زشکرانا افصح ۱۲ کلام او شیرین

(دیوان ص ۶۱۵)



۱۔ جی بحراب ایچہ بمعنی ۱۸ ہے۔ دختر پیغمبر کی عمر کی طرف اشارہ ہے ۲۔ نہ افلاک ۳۔ ہفت سیارہ ۴۔ ہشت بہشت ۵۔ موالید سر گانہ: حیوان۔ نبات
معاذن ۶۔ چہار آخشیبیج: آب۔ باد۔ خاک۔ آتش ۷۔ ہفت افلاک ۸۔ مہمان ۹۔ زن ابراہیم (ع) و مادر اسحاق ۱۰۔ مادر اسماعیل (ع) ۱۱۔ ماخوذ از
حدیث ”کان یوسف حسننا و لکننی املح“ (سفینۃ البحار ج ۲ ص ۵۳۶) ۱۲۔ ماخوذ از حدیث انا افصح العرب بیدانی من قریش (سفینۃ
البحار ج ۲ ص ۳۶۱)

ابن یمین

اس کا نام محمود بن یمین الدین فریومدی ہے۔ اس کا شمار آٹھویں صدی ہجری کے شعراء میں ہوتا ہے۔ وہ سرمداری خاندان کے مدح سرا اور اس خاندان سے وابستہ شعراء میں سے تھا۔ اس کی وفات سنہ ۷۶۹ ہجری قمری میں ہوئی۔

شندم زگفتار کار آگهان	بزرگان گیتی کھان و مہان
کہ پیغمبر پاک والا نسب	محمد سر سروران عرب
چنین گفت روزی باصحاب خود	بخاصان درگاہ و احباب خود
کہ چون روز محشر درآید ہمی	خلایق سوی محشر آید ہمی
منادی برآید بہفت آسمان	کہ ای اہل محشر کران تا کران
زن و مرد چشمان بہم بر نہید	دل از رنج گیتی بہم بر نہید
کہ خاتون محشر گذر می کند	ز آب مژہ خاک تر می کند
یکی گفت کای پاک بی کین و خشم	زنان از کہ پوشند باری دو چشم
جوابش چنین داد دارای دین	کہ ہر جان پاکش ہزار آفرین
ندارد کسی طاقت دیدنش	ز بس گریہ و سوز و نالیدنش
بیک دوش او بر، یکی پیرہن	بزہر آب آلودہ بہر حسن
ز خون حسینش بدوش دگر	فروہشتہ آغشتہ دستار سر
بدینسان رود خستہ تا پای عرش	بنالد بدرگاہ دارای عرش
بگوید کہ خون دو والا گھر	ازین ظالمان ہم تو خواہی مگر
ستم کس ندیدست از این بیشتر	بدہ داد من چون توئی داد گر
کند یاد سوگند یزدان چنان	بدوزخ کنم بندوشان جاودان
چہ بد طالع آنظالم زشتخوی	کہ خصمان شونش شفیعان او

(دیوان: حسین علی پستانی راہ ص ۵۸۹-۵۹۰)

ابن حسام

محمد بن حسام الدین خوسفی کا شمار نویں صدی ہجری کے مشہور شعراء میں ہوتا ہے۔ وہ ایک باقدرت طبیعت رکھنے والا شاعر اور بلند ہمت عالم تھا جس نے اپنی عمر خاندان رسالت کی مدح میں بسر کی اور لوگوں کی مدح سرائی رونی کی خاطر نہیں کی، جیسا کہ وہ کہتا ہے۔

شکم چون بہ یک نان توان کرد سیر مکش منت سفرہ ارد شیر
اس کا شعری مجموعہ ”خاوران نامہ“ اور ”دیوان“ پر مشتمل ہے جس میں اس کے قصائد، ترجیع بند، مخمس اور دوسرے اصناف شعر شامل ہیں۔ وہ سنہ ۸۷۵ ہجری قمری میں فوت ہوا۔

قصیدہ در مدح فاطمہ زہراء (س)

چنین گفت آدم علیہ السلام	کہ شد باغ رضوان مقیمش مقام
کہ باروی صافی و بارای صاف	زہر جانی می نمودم طواف
یکی خانہ در چشم آمد ز دور	برونش منور ز خوبی و نور
ز تابش گرفته رخ مہ نقاب	زنورش منور رخ آفتاب
کسی خواستم تا بہ رسم بسی	بسی بنگریدم ندیدم کسی
سوی آسمان کردم آنگہ نگاہ	کہ ای آفرینندہ مہر و ماہ
ضمیر صفی از تو دارد صفا	صفا بخشم از صفوت مصطفیٰ!
دلم صافی از صفوت ماہ کن	ز اسرار این خانہ آگاہ کن
زبالا صدائی رسیدم بگوش	کہ یا ای صفی آنچہ بتوان بگوش!
دعایی ز دانش بیاموزمت	چراغی ز صفوت برافروزمت

بگو ای صفی با صفای تمام	بحق محمد علیه السلام
بحق علی صاحب ذوالفقار	سپهدار دین شاه دلدل سوار
بحق حسین و بحق حسن	که هستند شایسته ذوالمنن
بختون صحرای روز قیام	سلام علیهم علیهم سلام
کز اسرار این نکته دلگشای	صفی را زصفوت صفایی نمای
صفی چون بکرد این دعا از صفا	درودی فرستاد بر مصطفی
در خانه هم درزمان باز شد	صفی از صفایش سر انداز شد
یکی تخت در چشمش آمد ز دور	سراپای آن تخت روشن ز نور
نشسته بر آن تخت مر دختری	چو خورشید تابان بلند اختر
یکی تاج بر سر منور ز نور	زانوار او حور یان را سرور
یکی طوق دیگر بگردن درش	بخوبی چنان چون بود درخورش
دو گوهر بگوش اندر آو یخته	زهر گوهری نوری انگیزته
صفی گفت یا رب نمی دانمش	عنایت بخطی که برخوانمش
خطاب آمد اورا که از وی سؤال	بکن تا بدانی تو بر حسب و حال
بدو گفت من دخت پیغمبرم	باین فر فرخندگی در خورم
همان تاج برفرق من باب من	دو دانه جواهر حسین و حسن
همان طوق در گردن من علی است	ولی خدا و خدایش ولی است
چنین گفت آدم که ای کرد گار	درین بار گه بنده راهست بار
مرا هیچ از اینها نصیبی دهند	از ین خستگیا طیبی دهند
خطابی بگوش آمدش کای صفی	دلت در وفا های عالم وفی
که اینها به پاکی چو ظاهر شوند	بعالم به پشت تو ظاهر شوند
صفی گفت با حرمت این احترام	مرا تا قیام قیامت تمام

مهمان نوازی رسول از طرف فاطمه (س)

باز بر اطراف باغ از چمن گل عذار	مجمره پر عود کرد بوی خوش نو بهار
مقنعه برپود باد از سر خاتون گل	برقع خضرا گشود از رخ گل پرده دار
مریم دوشیزه بود غنچه زآبستنی	درپس پرده زدلتنگی خود شرمسار

سرو سہی ناز کرد سرکشی آغاز کرد
 گل چه رخ نیکوان تازه و ترو جوان
 برصفت حسب حال گشته قوافی سگال
 ناله کنان فاخته تیغ زبان آخته
 بادریا حین فروش خاک زمین خله پوش
 برق ثواقب فروغ تیغ کشان از سحاب
 از پی زینت گری لعبت ایام را
 از دل خارای سنگ آمده بیرون عقیق
 بوی بنفشه بباغ کرده معطر دماغ
 یا قلم من فشانند برورق گل عبیر
 یا مگر از تربت دختر خیر البشر
 مَطْلَعَةُ الْكَوْكِبِينَ نَيْرَةُ النَّيِّرِينَ
 ماه مشاعل فروز شمع شبستان او
 ریشه کش معجزش مفتخرات النخام
 کسوت استبرقش اطلس نه نوى چرخ
 پردگی عصمتش پرده نشینان قدس
 رفته بجاروب زلف خاک درش حورعین
 آنچه زگرد رهش داده برضوان نسیم
 در حرم لا یزال ازپی کسب کمال
 مطبخیان سپهر هر سحری می نهند
 باشرف شرفه طارم تعظیم او
 در حرم عرش او از پی زینتگری
 زهره جادو فریب از سردست آمده
 معجز سر فرقدین تحفه فرستاده پیش
 زهره بسوری او رفت بدار السورور
 در شب تزویج او چرخ جواهر فروش
 پرده نشینان غیب پرده بیاراستند
 بس که جواهر فشانند کوکبه در موکبش

منبل تر باز کرد نافه مشک تار
 مرغ بزاری نوان برطرف مرغزار
 بلبل وامق عذار بر گل غذرا عذار
 سرو سر افراخته چون قد دلجوی یار
 لاله شده جرعه نوش در سر نرگس خمار
 ز آتش دل میغ راجشم سیه اشکبار
 لاله شده سرمه دان گل شده آینه دار
 لاله رخ افروخته بر کمر کوهسار
 لاله خور زین چراغ در دل شبهای نار
 یا درجنت گشاد خازن دارالقرار
 باد سحرگه فشانند بر دل صحرا غبار
 سَيِّدَةُ الْعَالَمِينَ بَضْعُهُ صَدْرُ الْكِبَارِ
 ترک فلک پیش او جاریه پیش کار
 رایحه چادرش نفحه عود وقمار
 سندس والای اوشعری شعری شعار
 کرده بنحاک درش خلد برین افتخار
 طره خوشبوی را کرده از آن مشکبار
 روشنی چشم را برده حواری بکار
 خلعت او خالدا ت کرده بجان اختیار
 بر فلک از خان او قرصه گاور سه دار
 کنگره نه فلک کم زیکی کو کنار
 هندوی شب و سحر کوب صبح سپید اب کار
 پیش کش آورد پیش هدیه او را سوار
 مشتری انگشتی داده و مه گوشوار
 بست بمشاطگی در کف حوران نگار
 کرد بمساط فلک پر دُر آبدار
 گلشن فردوس شد طارم نیلی حصار
 پرده گلریز گشت پر گهر شاهوار

مشعله داران شام بر سر بام آمدند	مشعله افروز شد هندوی شب زنده دار
گشت مزین فلک سدره نشین شد ملک	تا همه روحانیان یافت بیکجا قرار
جَلّ تعالی بخواند خطبه تزویج او	باولی الله علی بر سر جمع آشکار
روح مقدس گواه باهمه روحانیان	مجمع کزوبیان صف زده بر هر کنار
خازن دارالخلود خلد جنان در گشود	تا بتواند کرد زمره حوران نظر
همچو نسیم بهشت خواست نسیمی زعرش	کز اثر عطر او گشت هوا مشکبار
باد در سدره زدیر سر حورای عین	لؤلؤ و مرجان بریخت از سرهر شاخسار
خیمه نشینان خلد بسکه بجیدند دُر	مرهمه را گشت پر معجرو جیب و کنار
اینست عروسی و سوراينت سرور	اینست خطیب و گواه اینست طبق بانثار
ای بطهارت بتول لاله باغ رسول	کوکب تویی فضول عصمت تویی عوار
بابک بدرالدجا زوجک خیرالتقی	آنکف فخر النسیا چشم و چراغ تبار
مقصد عالم تویی زینت آدم تویی	عفت مریم تویی آخیر خیر الخیار
مام حسین و حسن فخر زمین و زمن	همسر توبو الحسن تازی دلدل سوار
ای که نداری خبر از شرف و قدر او	یک ورق از فضل او فهم کن و گوش دار
برورقی یافتم از خط بابای خویش	راست چو بر برگ گل ریخته مشک تنار



بود که روزی رسول بعد نماز صباح	روی بسوی علی کرد که ای شهسوار
هیچ طعامیت هست تا بضيافت رویم	نام تکلف مبر عذر توقف میار
گفت که فرمای تا جانب خانه رویم	خواجه روان گشت و شاه بر اثرش اشکبار
زانکه بخانه طعام هیچ نبودش گمان	تا بدر خانه رفت جان و دل از غم فکار
پیش درون شد علی رفت بر فاطمه	گفت پدر بر دراست تا کند اینجا نهار
فاطمه دلتنگ شد زانکه طعامی نبود	کرد اشارت بشاه گفت پدر را درار
باحسن و باحسین هر دویه پیش پدر	باش که من بنگرم تاجه گشاید ز کار
خواند انس را و داد چادر عصمت بدو	گفت ببازار بری جهت انتظار
تا بفروشم بزور ثمن آن برم	طرفه طعامی لطیف پیش خداوند گار
شد پدرم میهمان چادر من بیع کن	از ثمن آن برم زود طعامی بیار

چادر پشم شتر بافته و تافته
چادر زهرا انس برد وید لال داد
مرد فروشنده چون جامه زهم باز کرد
جمله بازار از آن گشت پر از مشغله
یکدیو خریدار خواست و آن سه درم خواستند
بود جهودی مگر بردرد کانخویش
چادر و دلال را بر درد کان بدید
خواجه بدو بنگریست گفت که این جامکک
گفت که چادر انس داده بمن زو بپرس
گفت انس راجهოდ قصه چادر بگوی
گفت بجان رسول آنکه تو یارویی
سر بسوی گوش او برد با هستگی
چادر زهر است این دختر خیرالوری
شد پدرش میهمان هیچ نبودش طعام
تا بفروشم بزروژمن آن برم
خواجه دکان نشین عالم توریة بود
از صحف موسوی چند ورق باز کرد
روبسوی انس کرد که این جامه من
قصه این چادر پرده نشین رسول
گفته که پیغمبر دور پسین را بود
روزی از آنجا که هست مقدم مهمان عزیز
فاطمه را در سرا هیچ نباشد طعام
چادر عصمت برند تا که طعامی خرنند
مخلص من دوستی چار هزارش درم
ذکر قسم میکنم من بخدائی خویش
عزت آن چادر از طاعت کروبیان
خاصه ترا یک هزار درهم دیگر دهم
من چو نبی رابسی کرده ام ایذا کنون

از عمل دست خود رشته ورا بود و تار
بر سر بازار شهر تا که شود خواستار
یافت از و شعله نور چو رخشنده نار
زرد شد از تاب اوبالش خور برم دار
وان سه درم رانکرد هیچکس آنجا چهار
مهتر بعضی یهود محتشم و مالدار
نور گرفته از و شهر یمین و یسار
راست بگوآن کیست راست بود رستگار
واقف این چادر اوست من نیم آگه زکار
گفت تو گرمیخری دست زپرش بدار
کین خبر از من مپوش راز نهفته مدار
گفت بگویم ترا گرتوشوی راز دار
فاطمه خیر النساء دختر خیر الخیار
داد بمن چادرش از جهة اضطرار
طرفه طعامی لطیف پیش خداوند گار
دید بسوی کتاب دیده جوابربهار
تا که بمقصد رسید مرد صحایف شمار
از تو خریدم بچار پاره درم یک هزار
گفته بموسی بطور حضرت پروردگار
پرده نشین دختری فاطمه باوقار
مر پدرش رفتند بر در حجره گذار
تا بنهد پیش باب خواجه روز شمار
وز سه درم بیش و کم کس نبود خواستار
بدهد و دروجه آن نقره بوزن عیار
از قسمی کان بود ثابت و سخت استوار
پیش من افزون بود از جهت اقتدار
لیک مرا حاجت نیست گربتوانی برآر
هست سیاه از حیاروی من خاکسار

روی بدو کردندم، روی ندار دولیک
 گر بغلامی خویش فاطمه بپذیردم
 رفت انس بازپس تابحریم حرم
 گفت انس رایهود چون برسی در حرم
 رفت انس در حرم قصه به زهرا بگفت
 فاطمه پیش پدر حال یهودی بگفت
 شدانس آواز داد تا که درآید یهود
 سر بنهاد آن جهود بر قدم عرش سا
 لفظ شهادت بگفت باز برون شدز کو
 چون بغلامی تو معتقد و مخلصم
 تا که بود نور و نار روشن و سوزنده باد
 می شد و میگفت کیست همچو من اندر جهان
 فاطمه مولای من دختر خیر البشر
 بر سر بازار و کوی بود در این گفت و گوی
 چار هزار از یهود هشتصد افزون برو
 روح قدس در رسید پیش رسول خدا
 موجب و مستوجب عشم خدا گشته بود
 برکت مهمانی دختر تو فاطمه
 ای که بعصمت توئی مطلع انوار قدس
 ورد زبان ساخته نعمت تو این حسام
 در حرم فاطمه خواهش من عرضه دار
 عمر بمولایش صرف کنم بنده وار
 بر عقب او جهود با دل امیدوار
 خدمت او عرضه کن تا که مرا هست بار؟
 گفت که تا من پدر را کنم آگه زکار
 گفت پذیر فتمش گوانس او را در آر
 یافته اندر دلش نور محمد قرار
 کرد ز خاک درش فرق سرش تاجدار
 طوف کنان برز بان نام خداوند گار
 در حرمت زان یهود حرمت من کم مدار
 قسم محب تو نور قسط عدوی تونار
 از عرب و از عجم دولتی و بختیار
 من بغلامی او یافته این اعتبار
 تا که بگسترده شد ظلّه نصف النهار
 مؤمن و دین و رشدند عابد و پرهیزگار
 گفت هزاران سلام بر تو ز پروردگار
 چند هزار از یهود چند هزار از نصار
 داد ز نار سموم این همه راز ینهار
 از زلل و معصیت دامن تویی غبار
 تا بودش در بدن مرغ روان را قرار

☆☆☆☆☆

اولادِ حضرت فاطمه سلام الله عليها

ذُرِّيَّةَ بَعْضِهَا مِنْ بَعْضٍ (آل عمران: ۳۳) بعض کی اولاد کو بعض سے (فضیلت دی)

جیسا کہ تاریخ اسلام سے آگاہ ہر شخص جانتا ہے کہ حضرت فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کی حضرت علی علیہ السلام سے اولاد تھی۔ جن میں دو بیٹے حسن اور حسین علیہما السلام اور دو بیٹیاں زینب اور ام کلثوم تھیں۔

مورخین اور سیرت نگاروں میں سے کسی ایک کو بھی ان چار بچوں کے بارے میں کوئی شک و تردید نہیں ہے۔ امام حسن علیہ السلام تیسری ہجری میں ۱۵ رمضان المبارک اور امام حسین علیہ السلام چوتھی ہجری میں ماہ شعبان میں پیدا ہوئے۔

سوانح عمری لکھنے والے شیعوں اور بعض علماء اہل سنت نے رسول خدا کی بیٹی کی ایک اور اولاد زینہ جس کا نام محسن ہے، لکھی ہے۔ ”نسب قریش“ کے مصنف مصعب زہیری متوفی ۲۳۶ ہجری نے محسن کا کوئی ذکر نہیں کیا لیکن بلاذری متوفی ۲۷۹ ہجری لکھتے ہیں:

فاطمہ کے بطن سے علیؑ کے بیٹے حسن، حسین، اور محسن علیہم السلام پیدا ہوئے۔ محسن بچپن میں ہی فوت ہو گئے۔ (۱)

نیز وہ لکھتے ہیں:

جب محسن پیدا ہوئے تو رسالت مآبؐ نے جناب فاطمہ (س) سے پوچھا اس کا کیا نام رکھا ہے؟ انہوں نے کہا ”حرب“ نام رکھا ہے۔ آپؐ نے فرمایا: ان کا نام محسن ہے۔ (۲)

(۱) انساب الاشراف ص ۴۰۲

(۲) ایضاً ص ۴۰۳

کتاب جمهرة انساب العرب کے مؤلف علی بن احمد بن سعید اندلسی (۳۸۳-۳۵۶) نے لکھا ہے: محسن بچپن میں فوت ہو گئے۔ (۱)

شیخ مفید نے جناب فاطمہ (س) کے بطن سے حضرت علی علیہ السلام کی اولاد کو یوں شمار کیا ہے: حسن، حسین، زینب کبریٰ و زینب صغریٰ جن کی کنیت ام کلثوم ہے۔ (۲)

اسی باب کے آخر میں وہ اضافہ کرتے ہیں:
شیعوں سے نقل ہوا ہے کہ پیغمبر اکرمؐ کی رحلت کے بعد فاطمہ زہرا (س) کا ایک بیٹا سقط ہوا۔ جب وہ ماں کے شکم میں تھا تو اس کا نام محسن رکھا۔ (۳)

طبری یوں لکھتے ہیں:
کہتے ہیں کہ علیؑ کا فاطمہ (س) سے ایک اور بیٹا محسن بھی تھا جو بچپن میں فوت ہو گیا۔

شیعہ روایات اور بعض سنی کتب میں موجود ہے کہ رسول اللہؐ کی رحلت کے بعد ان پر آشوب ایام میں فاطمہ زہرا (س) پر جو مصیبت گزری اس کی وجہ سے ان کا بیٹا سقط ہو گیا۔ (۴)

جناب زہرا (س) کے ان چار بیٹوں اور بیٹیوں کی زندگی کے بارے میں مختلف زبان میں کئی کتابیں اور مقالے لکھے گئے ہیں۔ مصنف کے اس سلسلہ کتب میں قارئین امام حسن اور امام حسین علیہما السلام کے حالات زندگی تفصیلاً پڑھیں گے۔

☆☆☆☆☆

(۱) جمهرة انساب العرب ص ۱۶

(۲) ارشاد شیخ مفید ج ۱ ص ۳۳۵

(۳) ایضاً ص ۳۵۶۔ کشف القمہ ج ۱ ص ۳۴۰-۳۴۱

(۴) الملل والنحل ج ۱ ص ۷۷

حضرت زینب سلام اللہ علیہا

قوی احتمال کی بناء پر حضرت زینب (س) کی ولادت ششم ہجری کو ہوئی ہے۔ اگر یہ احتمال درست ہو تو جب سے انہوں نے ہوش سنبھالا اور شعوری زندگی میں قدم رکھا، مصائب و آلام سے ان کا واسطہ پڑا۔ پانچ سال کی عمر میں رسول خدا کی جدائی کا صدمہ پیش آیا اور اس کے فوراً بعد وہ افسوسناک اور غمناک واقعات جو گھر کے اندر اور باہر رونما ہوئے انہیں اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ اس کے بعد ماں کو بستر بیماری پر دیکھا۔ رسول اللہ کی جدائی میں ان کے آنسوؤں کی لڑیوں کو دیکھا۔ ان کی آہ و فریاد کو سنا۔ لوگوں کی طرف سے ماں پر ظلم و ستم ہوتے ہوئے دیکھا اور ماں کو شکوہ کرتے ہوئے سنا۔ آخر کار دکھ باری ماں کی آنکھیں بند ہوئیں۔ اس صدمے سے بڑھ کر خوف و ہراس کی کیفیت ان پر طاری تھی کہ ہر کام خاموشی سے کیا جا رہا ہے، بچوں کو اونچی آواز سے ماں پر رونے کی اجازت نہیں تھی، مبادا ہمسائے ان کے رونے کی آواز سن لیں اور وہ دوسروں کو اس خبر سے آگاہ کر دیں اور وہ لوگ رسول زادی کے جنازے پر آجائیں اور یوں علی علیہ السلام فاطمہ زہرا (س) کی وصیت پر عمل نہ کر سکیں۔ خدا کی تقدیر، دونوں ماں بیٹی کی تربیت ایک طرح سے ہوئی۔ انہیں بھی یکے بعد دیگرے سخت آزمائشوں سے گزرنا پڑا تا کہ سخت اور مشکل ترین حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے آمادگی پیدا ہو جائے۔ جب حضرت زینب (س) سن بلوغ کو پہنچیں تو عبد اللہ بن جعفر کے ساتھ ان کی شادی ہو گئی۔ عبد اللہ حبشہ میں پیدا ہوئے۔ ان کے حق میں حضور پاکؐ نے دعائے خیر فرمائی تھی۔ (۱) تمام سیرت نگاروں نے ان کی شرافت و بزرگی، عزت نفس خصوصاً بہت زیادہ سخاوت کے اوصاف کے ساتھ ان کا ذکر کیا ہے۔

حضرت زینب کی حضرت عبد اللہ سے اولاد ہوئی۔ مصعب زہیری نے ان کی تعداد تین بیٹے

(۱) اسباب ج ۳ ص ۳۸

اور ایک بیٹی بیان کی ہے۔ بیٹے جعفر، عون اور اکبر جن کی آگے نسل نہیں چلی اور علی کہ حضرت عبداللہ کی تمام نسل اسی بیٹے سے بڑھی اور لڑکی ام کلثوم تھیں جن سے معاویہ اپنے بیٹے یزید کی شادی کرنی چاہتا تھا۔ عبداللہ نے ام کلثوم کا معاملہ امام حسین علیہ السلام کے سپرد کر دیا۔ انہوں نے ان کی شادی قاسم بن محمد بن جعفر بن ابی طالب سے کی۔ (۱) طبری مرحوم نے اعلام الوری میں بھی عبداللہ کی یہی اولاد یعنی تین لڑکے اور لڑکی لکھی ہے۔ (۲) لیکن مشہور یہ ہے کہ ان کے بیٹے علی، محمد، عون اور عباس تھے۔

جناب زینب عبداللہ کی زوجہ تھیں۔ ان کے گھر میں رہتی تھیں۔ ان کے بچے بھی تھے۔ لیکن اس کے باوجود اپنی ماں کی طرح اپنے باپ کی خدمت کو فراموش نہ فرماتیں۔ جب حضرت علی علیہ السلام نے طلحہ و زبیر کی لگائی ہوئی آگ، جنگ جمل، کو ٹھنڈا کرنے کے لئے عراق کا سفر اختیار کیا تو حضرت زینب بھی اپنے شوہر عبداللہ کے ہمراہ کوفہ تشریف لے گئیں اور وہیں قیام کیا۔ عراق میں جناب زینب نے عجیب اور دلخراش مناظر دیکھے۔ باپ کی ایسے گروہ کے ساتھ جنگ کو ملاحظہ کیا جو بصرہ میں اکھٹا ہوا تھا اور ان کی قیادت ایک ایسی شخصیت کر رہی تھی جو کل تک تو عثمان کو مدینہ کے یہودی (نغفل) سے تشبیہ دیتی اور اس کے قتل ہونے کی آرزو کرتی تھی۔ آج وہی خون عثمان کا انتقام لینے کے لیے علی علیہ السلام کے مقابلے پر آگئی۔ جناب زینب نے جنگ صفین اور اس میں دنیا کے چالبازوں کو بھی دیکھا جو ظاہر میں علیؑ کے ساتھ تھے لیکن خفیہ طور پر معاویہ سے ملے ہوئے تھے۔ اس کے بعد مقدس مآبوں اور قرآن کے قاریوں (خوارج) کی علیؑ کے ساتھ جنگ کا مشاہدہ کیا۔ آخر کار انیس رمضان المبارک کو مسجد کوفہ کے محراب میں علی علیہ السلام کا خون سے رنگین چہرہ دیکھا اور اس صدمہ کو برداشت کیا۔ اس کے بعد لوگوں کی امام حسنؑ سے بیعت کی چشم دید گواہ بنیں اور پھر انہی لوگوں کو بیعت توڑتے ہوئے امام حسنؑ پر حملہ کرتے اور ان کا خیمہ گراتے ہوئے بھی دیکھا۔ لوگوں کی بغاوت اور بھائی کی ران کو زخمی کرنے کو ملاحظہ کیا۔ اپنے بھائی حسنؑ کی مجبوری اور بے بسی دیکھی اور اسی بے بسی کے عالم میں بادلِ نخواستہ امام حسنؑ کا معاویہ سے صلح کا معاہدہ کرنا اور اس سے صلح کے بعد دوست نما دشمنوں کی باتوں سے طعن و تشنیع کے زخم برداشت کرنا بھی دیکھا (۳)۔

اس وقت تک حضرت زینبؑ اپنی عمر کے تیس سے زائد سال گزار چکی تھیں اور ماں کے بقول ”زمانے کے شکم میں کیا کیا نیرنگیاں چھپی ہوئی ہیں اور وہ کیا کیا تماشے (ایک کے بعد دوسرا)

(۱) نسب قریش ص ۸۲

(۲) اعلام الوری ص ۲۰۴

(۳) جلیلی از تاریخ اسلام از مؤلف ہذا ج ۲

نکالتا ہے۔“ واقعات و حادثات کیے بعد و گیرے رونما ہوئے۔ ان غموں اور مصیبتوں کو برداشت کرنے کے لیے فولاد جیسی سختی اور پہاڑ جیسی ہمت درکار ہے اور زینب بردباری، تحمل اور برداشت کا نمونہ ہیں۔

آخر کار علی علیہ السلام کا گھرانہ کوفہ سے مدینہ واپس آ جاتا ہے۔ کچھ عرصہ نہ گزرا تھا کہ زینب نے اپنے بڑے بھائی کو بستر مرگ پر زہر کے درد سے کروٹیں بدلتے ہوئے دیکھا۔ دوسرے دن اس سے بھی بڑا دلخراش اور اندوہناک منظر دیکھا۔ وہ لوگ جو حضرت رسول خدا کا جناب فاطمہ (س) کی طرف دیکھ کر محبت سے مسکرا دینا بھی گوارہ نہیں کر سکتے تھے ان کے دلوں میں زہرا (س) سے دشمنی اور بغض اب بھی موجود ہے۔ ان کے دلوں سے زہرا (س) کے خلاف حسد و کینہ کی آگ ابھی سرد نہیں ہوئی ہے۔ لہذا انہوں نے ماں کا انتقام بیٹے سے لینے کی ٹھان لی۔ یہاں تک انہوں نے زہرا (س) کے لخت جگر کو اپنے جد امجد کے پہلو میں دفن نہ ہونے دیا۔

مشکلات و مصائب کے دس سال اور گزر گئے۔ ان سالوں میں حکومت شام کے کارندوں نے عراق اور حجاز کے تمام شہروں میں شیعیان علی کا تعاقب کیا۔ انہیں گالیاں دیں۔ انہیں اذیتیں دی گئیں، انہیں مارا پیٹا گیا۔ انہیں زندانوں میں ڈالا اور بے دریغ قتل کیا گیا۔ یہاں تک کہ معاویہ کے مرنے کی خبر پہنچی۔ اہل عراق کے لیے دوسرے علاقوں کی نسبت یہ خبر باعث خوشی تھی۔ کوفہ میں جلے ہوئے لگے۔ مقررین کھڑے ہو کر اونچی آواز اور اپنی پوری طاقت کے ساتھ لوگوں کو اپنی بات ذہن نشین کرانے کی بھرپور کوشش کرنے لگے کہ ”ہم یزید کو امیر المومنین نہیں بننے دیں گے۔ یہ حق خداوند کی طرف لوٹنا چاہیے۔ جب تک نواسہ رسول موجود ہیں ہمیں ابوسفیان کے پوتے کی کیا ضرورت ہے؟“

کوفہ سے مسلسل بچے درپے مدینہ میں خطوط آرہے ہیں: یا بن رسول اللہ جتنی جلدی ہو سکے ہمارے پاس آئیے۔ اگر نہیں آئیں گے تو خدا کے سامنے جوابدہ ہوں گے۔“

حسین علیہ السلام مکہ سے عراق روانہ ہوئے۔ ادھر جب زینب (س) کے شوہر عبداللہ نے امام حسینؑ کا یہ حال دیکھا تو وہ تنگ و دو کرنے لگے۔ انہوں نے ایک طرف دیکھا کہ اس شہر میں ان کے چچا زاد اور برادر نسبتی حسین علیہ السلام کو خطرہ لاحق ہے اور امان نہیں ہے۔ دوسری طرف وہ اس سے پریشان ہیں کہ کوفہ والے ان کے ساتھ ان کے باپ اور بھائی جیسا سلوک نہ کریں۔

لہذا عبداللہ نے شہر کے حاکم عمرو بن سعید کے پاس جا کر اس سے امام حسین علیہ السلام کے لئے امان نامہ حاصل کیا جس کی عبارت یہ ہے:

میں نے سنا ہے کہ آپ نے عراق جانے کا ارادہ کیا ہے۔ خدا کے لیے افتراق و انتشار سے بچیں۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں آپ راستے میں مارے نہ

جائیں۔ میں عبد اللہ بن جعفر اور اپنے بھائی یحییٰ بن سعید کو آپ کے پاس بھیج رہا ہوں تاکہ وہ آپ کو بتائیں کہ آپ امان میں ہیں اور آپ کو میری مدد اور تعاون حاصل ہو گا۔ میری جانب سے آپ کے ساتھ اچھا اور نیک سلوک کیا جائے گا۔

عبد اللہ اور حاکم مکہ کے بھائی نے اس امان نامے کو امام حسین علیہ السلام تک پہنچایا۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کے امان نامے کا جواب امام حسینؑ کی جانب سے کیا ہو گا: جو شخص لوگوں کو اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کی طرف بلائے، نیکی اور تقویٰ کو اپنا شعار بنائے، وہ ہر گز افتراق پھیلانے والا نہیں ہے۔ اس نے خدا اور رسولؐ کی ہر گز مخالفت نہیں کی۔ بہترین امان خدا کی امان ہے۔ جو اس دنیا میں اللہ سے نہ ڈرے وہ قیامت کے دن اللہ کی امان میں نہیں ہو گا۔ میں خدا سے دعا کرتا ہوں کہ میں دنیا میں اس سے خوف کھاؤں تاکہ آخرت میں اس کی امان اور پناہ مجھے حاصل ہو۔ (۱)

قافلہ مکہ سے باہر نکلتا ہے۔ زینبؓ بھی قافلے کے ہمراہ ہیں۔ جب عبد اللہ نے دیکھا کہ امام علیہ السلام نے عراق جانے کا مصمم ارادہ کر لیا ہے اور اس سفر سے ہر گز نہیں رکیں گے تو اپنے بیٹوں عون اور محمد کو ان کے ساتھ کر دیا۔

دمشق نے کئی مہینوں سے عراق کی بگڑتی ہوئی صورت حال پر نظر رکھی ہوئی تھی۔ بالفاظ دیگر یوں کہیں کہ عراق کے موقع پرستوں نے (وہی موقع پرست جنہوں نے امام علیہ السلام کو کوفہ آنے کے لیے خطوط لکھے تھے) حکومت شام کو آنے والے طوفان سے باخبر کر دیا تھا۔ یزید نے تمام لازمی تدابیر اختیار کر لی تھیں۔ اس نے ایک ظالم، بے تقویٰ، بے رحم، بے اصل و نسب شخص کو کوفہ کا حاکم بنا کر بھیجا۔ عبید اللہ ابن زیاد نے امام حسینؑ کے نمائندے مسلم بن عقیل، ان کے میزبان ہانی بن عروہ کو شہید کر دیا اور لوگوں میں خوف و ہراس پھیلا دیا۔ اس کے مسلح سپاہیوں نے حجاز اور عراق کے راستوں کی ناکہ بندی کر دی۔ چنانچہ امام حسین علیہ السلام منزل شراف سے تھوڑے سے فاصلے پر حاکم کوفہ کی طرف سے حربین زیاد ریاحی کے لشکر کے روبرو ہوئے۔ حرنے نئے فرمان کے آنے تک کربلا کی سر زمین پر آپ کو روکے رکھا۔

محرم کے ان ابتدائی کٹھن، دشوار اور خوف و ہراس سے بھرپور ایام میں کم از کم کچھ لوگوں سے امیدیں وابستہ تھیں۔ اس کے بعد نو محرم کی عصر سے لے کر دوسرے دن شام غریباں

(۱) پس از پنجاہ سال ص ۱۳۷ طبع دوم

تک کیا گزری، اس سے آپ کم و بیش آگاہ ہیں۔۔۔ نیز اسی سلسلہ کتب میں امام حسینؑ کی زندگی کے بارے میں آپ ان واقعات کی زیادہ تفصیل پڑھیں گے۔ کرب و اذیت کے اس ماحول میں منصب کی کیا ذمہ داری بنتی تھی اور انہوں نے کس طرح اپنی شخصیت کو پیش کیا اور اس ذمہ داری کو کس طرح نبھایا یہ ایسی چھپی بات نہیں جس سے آپ آگاہ نہ ہوں۔ لیکن ان کی خاص ذمہ داری کا آغاز سنہ ۶۱ ہجری محرم کی عصر عاشورہ کو ہوا۔

روز عاشورہ اختتام کو پہنچا۔ مال و دولت کی محبت، جاہ و منصب کے لالچ یا حسد و کینہ اور انتقام کی آگ نے جن بد مستوں کو اندھا کر دیا تھا وہ اپنے آپ میں آئے۔ انہوں نے کیا کیا؟ اتنا بڑا کام! اتنا بڑا کام! جس کی مثال پوری تاریخ عرب میں نہیں ملتی۔ مہمان کو قتل کرنا، اس قوم کے لیے اس سے بڑھ کر کوئی ذلت مقصود نہیں ہو سکتی اور وہ بھی اس بے رحمی اور ظلم کے ساتھ! اس سے انہیں کیا ملا؟ کچھ بھی نہیں۔ کیوں کچھ نہیں! اس مہمان کو قتل کر کے انہوں نے بہت کچھ حاصل کیا، وہ کیا تھا؟ شام کے مقابلے میں کوفہ کی ذلت و خواری، نہ صرف ایک بار بلکہ چند بار کی ذلت۔ اب کیا کریں اور کہاں جائیں؟ ان کے لئے سب راہیں مسدود ہو گئیں۔ سوائے ایک راہ کے یعنی تنگ و عار، ذلت و خواری کہ یہ قافلہ مجبوراً اسے انتہا تک پہنچائے۔ اس راستے کا آغاز غاصریہ سے ہوا اور حاکم کوفہ کے محل تک، پھر وہاں سے شروع ہو کر دمشق کے سبز محل تک اختتام پذیر ہوا۔ عراقی قافلے کو (کوفہ میں) ایسے شخص کے سامنے پیشانی مذلت زمین پر ٹیکنا تھی جس کے باپ دادا کا کوئی پتہ نہ تھا۔ اس کے بعد اسی طرح سر جھکائے ناک زمین پر رگڑتے ہوئے شام تک جانا ہے۔ وہاں پہنچ کر ہند کے بیٹے کے دربار میں کھڑے ہو کر یہ کہنا تھا:

کل تیرے باپ کی غلامی کا طوق گلے میں ڈالا تھا آج تیرے حضور دست
بستہ کھڑے ہیں اور تیرے حلقہ بگوش ہیں۔ اب جو تو کہے گا وہ تیرا حکم
ہو گا جو تو سوچے گا وہ تیرا لطف ہو گا۔“

یہ عراقی قافلے کی سوغات ہے۔

لیکن مدینہ کا بچا کچھا قافلہ بھی خالی ہاتھ نہ تھا۔ اس کے ہاتھ پڑتے تھے۔ ان کے ہاتھ عراق اور حجاز کی وسعتوں کے برابر، نہیں جزیرۃ العرب کے برابر بلکہ عالم اسلام کی وسعتوں کے برابر گراں بہا متاع سے بھر پور تھے۔ ان کے ہاتھ میں عزت و شرف، عظمت و بزرگی، افتخار، حریت، کرامت انسانی اور شہادت جیسی مال و متاع تھی۔ لیکن اس مال کا خریدار نہ کوفہ تھا نہ شام۔ وہاں مرد اور مردانگی کی کوئی علامت نظر نہیں آتی تھی اور شہادت کے خریدار تو مرد ہوتے ہیں اور بقول پیرو میہنہ:

چوب بہ عیاران چوب کنند بنامردان چوب نکنند (امرار الخوید، ص ۵۸)

مردوں سے مقابلہ کیا جاتا ہے نہ کہ نامردوں سے

کوفہ اور شام کے محلوں میں رہنے والے ان کاغذ نشینوں کے گرد جمع ہونے والے نامرد تھے جو ان مرد نہ تھے۔

اس گرافندر متاع کو عورتوں اور چھوٹے بچوں پر مشتمل قافلے نے اٹھایا ہوا تھا جن کے پاؤں میں زنجیریں تھیں اور ہاتھ پس گردن بندھے ہوئے تھے۔ یہ قافلہ ایک خاتون کی سالاری میں تھا۔ جسے بجا طور پر ”کربلا کی شیردل خاتون“ کا لقب دیا گیا ہے۔^(۱)

سالار قافلہ نے اپنی اس گراں بہا جنس کو ہر دو مقامات (کوفہ و شام) پر لوگوں کے سامنے پیش کیا۔ اس لئے نہیں کہ کوئی خریدار بن جائے۔ کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ یہ لوگ اس جنس کے خریدار نہیں ہیں بلکہ اس لئے پیش کیا تا کہ پانچ سال بعد اس کی قیمت لگے اور بازار گرم ہو۔ پہلے شہر کوفہ میں، پھر مدینہ، پھر شام، خوزستان، خراسان میں اس کی مارکیٹ بنی۔ آخر کار خراسانیوں کے تابو توڑ حملوں نے ان نامردوں کو اپنے کیفر کردار تک پہنچایا۔ نامرد کبھی تختہ دار پر نہیں چڑھتے۔ یہ مردار پاؤں سے پامال کئے جاتے ہیں۔ یہ وہ دن تھا جب عباسی خلیفہ کے حکم پر امویوں کے نیم جان لاشوں پر فرش بچھایا گیا۔ اس پر دسترخوان چٹا گیا اور خلیفہ وقت اس پر کھانا کھانے بیٹھا۔^(۲) قافلہ اور سالار قافلہ بازار کوفہ میں داخل ہوئے۔ کوفہ کا حاکم یہ چاہتا تھا کہ اسی طرح قیدیوں کا تماشہ دکھا کر لوگوں کے سامنے علی کی بیٹی اور خاندان ہاشم کو ذلیل و رسوا کرے اور اس طریقے سے ان پر اپنی قوت و طاقت کا رعب مزید بھائے۔ انہیں بتائے کہ تمہارے شہر کے سابق حاکم کی بہو بیٹیاں ہیں۔ آج میرے حکم سے تمہاری آنکھوں کے سامنے ہاتھ پس گردن بندھے ہوئے پابہ زنجیر شہر کے گلی کوچوں میں پھرائی جا رہی ہیں اور انہیں تازیانے لگائے جا رہے ہیں۔

یہ ابن زیادہ کی آرزو تھی۔ لیکن خدا کا ارادہ کچھ اور تھا۔ شہر کے بوڑھے جوان سب گلیوں میں جمع ہو گئے تھے۔ مشہور ضرب المثل ہے: ”تیز بخار پسینہ بھی جلدی لاتا ہے۔“ جو لوگ جلد غصے میں آتے ہیں جلد پشیمان بھی ہوتے ہیں۔

دریائے فرات کے کنارے بسنے والے اس خصوصیت کے بہت زیادہ حد تک حامل تھے۔ ایک بات سن کر فوراً جذبات میں آ جاتے اور دشمن بن جاتے۔ دوسری بات سن کر ٹھنڈے ہو جاتے اور بھائیوں سے زیادہ مہربان ہو جاتے۔

حضرت زینب (س) کوفہ والوں کو اچھی طرح جانتی تھیں۔ جن خواتین کی عمریں تیس سال اور اس سے زیادہ تھیں، انہوں نے مسلمانوں کی نظروں میں زینب کے مقام و منزلت کا مشاہدہ کیا تھا۔

(۱) دربارہ زینب (ع)

(۲) قتلی از تاریخ اسلام طبع دوم

انہوں نے دیکھا تھا کہ نسب (س) اپنے باپ کے نزدیک کس شان و عظمت کی مالک تھیں۔
 نسب کبریٰ (س) اور دوسرے اسیروں کی رقت انگیز حالت میں بازار کوفہ میں آنے سے
 گزشتہ یادیں تازہ ہو گئیں۔ عورتوں نے آہ و فغاں کی اور مردوں کو بھی رلایا۔ عورتوں اور بچوں کے
 کہرام سے بچوں کی آہ و زاری کی آوازیں بلند ہونے لگیں۔ ہر طرف سے آہ و بکا کی صداکں آنے
 لگیں۔ یہاں پر اس جذباتی منظر کو عروج پر پہنچنا چاہیے تاکہ لوگوں کی آنکھیں کھلیں اور وہ دیکھیں
 کہ انہوں نے کیا کیا ہے؟

اسیروں میں سے کون اس ذمہ داری کو نبھا سکتا ہے۔ علی کی بیٹی۔ علی کی دو بیٹیاں تھیں۔
 کون سی بیٹی؟ نسب (س) یا ام کلثوم۔ قدیم ترین روایت، جس میں یہ خطبہ نقل ہوا ہے اس نے ام
 کلثوم کا ذکر کیا ہے۔ مؤلف نے خود اپنی کتاب (۱) میں ان روایات کی رو سے امانت کا خیال رکھتے
 ہوئے ان کا نام ام کلثوم لکھا ہے۔ لیکن جیسا کہ میں نے اس کتاب میں بھی لکھا ہے کہ ام کلثوم
 اس وقت زندہ نہیں تھیں۔ یہ اشتباہ اس وجہ سے ہوا ہے کہ جناب نسب (س) کی ایک کنیت ام کلثوم
 ہے۔ انہیں ام کلثوم کبریٰ اور ان کی بہن کو ام کلثوم صغریٰ کہتے تھے۔

بہر حال بازار کوفہ میں اپنے الفاظ کے ذریعے جس نے کوفہ والوں کو ناقابل فراموش درس
 دیا وہ نسب کبریٰ (س) تھیں۔ انہوں نے حمد الہی کے بعد فرمایا:

اے کوفہ والو! دعا باز اور دھوکے باز لوگو! اے پست و ذلیل
 لوگو! روؤ اور خوب روؤ۔ تمہاری آنکھیں روئی رہیں
 اور تمہارے سینے غم سے چلنے رہیں۔ تمہاری مثال ایسی عورت
 جیسی ہے جس نے سوت کا تنے کے بعد اسے ریزہ ریزہ کر دیا
 ہو۔ تمہارے وعدے جھوٹے اور تمہارے ایمان کے چراغ بے
 نور ہیں۔ تم بلند و بانگ دعوے کرنے والے لوگ ہو۔ جیلہ
 باز ہو اور خود نما، دوست کے قاتل اور دشمن نواز۔ تم
 گندے پانی کے سبزہ کی طرح ہو جس کا باطن گندہ، بدبودار
 اور ظاہر سرسبز و رنگین۔ تم بد بخت قبر کی چاندی سے طبع
 شدہ پتھر کی طرح ہو۔ کیا برا کام تم نے کر دیا؟ اللہ کے
 غضب کو آواز دی۔ تم آتش دوزخ میں ہمیشہ جلو گے۔ کیا تم
 رو رہے ہو؟ اور زیادہ گریہ کرو! تم اسی لائق ہو کہ روئے
 رہو۔ تم خوشی منانے کے لائق نہیں رہے۔ تم نے ذلت کی
 ایسی راہ کا انتخاب کیا ہے کہ زمانہ گزرتا جائے گا تمہاری
 ذلت کم نہیں ہو گی۔ تم اس ذلت کو کیسے دھو سکتے ہو

تم فرزند رسول کے قتل کا کیا جواب دو گے؟ جو انماں جنت کے
 سردار کا قتل، جو تم ذلیل لوگوں کے لیے چراغ ہدایت تھا، جو
 مشکلات میں تمہارا ساتھی، مصائب میں تمہارا ہمدرد و غم خوار
 تھا۔ اے عداور لوگو! ہلاکت و نابودی تمہارے نصیب میں ہو۔

يَا أَهْلَ الْكُوفَةِ يَا أَهْلَ الْخَيْرِ وَالْخِذَاءِ لَا، فَلَا
 رَقَابَ الْعَبْرَةَ، وَلَا هَذَابَ الرُّثَّةِ، إِنَّمَا مَثَلُكُمْ
 كَمَثَلِ الثِّيِّ نَقَضَتْ غَزْلَهَا مِنْ بَغْدٍ قُوَّةً أَنْكَلَا،
 تَتَّخِذُونَ إِيْمَانَكُمْ دَخْلًا بَيْنَكُمْ أَلَا، وَهَلْ فِيكُمْ
 إِلَّا الصُّلْفُ وَالشَّنْفُ، وَمَلَأَ الْإِيْمَاءُ وَغَمَزُ
 الْأَعْدَاءِ وَهَلْ أَنْتُمْ إِلَّا كَمَزَعِي عَلَى دِمْنَةٍ، أَوْ
 كَقِضْبَةٍ عَلَى مَلْحُودَةٍ. أَلَا سَاءَ مَا قَدَّمْتُمْ لَكُمْ
 أَنْفُسَكُمْ أَنْ سَخِطَ اللَّهُ عَلَيْكُمْ وَفِي الْعَذَابِ
 أَنْتُمْ خَالِدُونَ، أَتَبْكُونَ؟ أَيْ وَاللَّهِ فَابْكُوا، وَأَنْتُمْ
 وَاللَّهِ أَخْرِيَاءُ بِالْبُكَاءِ فَابْكُوا كَثِيرًا، وَاضْحَكُوا
 قَلِيلًا فَلَقَدْ فَدَنْتُمْ بَعَارَهَا وَشَبَّارَهَا. وَ لَنْ
 تُرْحَضُوهَا يَغْسِلُ بَعْدَهَا أَبَدًا.

وَأَنِّي تُرْحَضُونَ قَتْلَ سَلِيلِ خَاتِمِ النَّبُوَّةِ، وَمَعْدِنِ
 الرِّسَالَةِ وَسَيِّدِ شِبَّانِ أَهْلِ الْجَنَّةِ، وَمَنَارِ
 مَحَجِّتِكُمْ، وَمِدْرَةِ حَجَّتِكُمْ، وَمَفْرَحِ نَارِ لَيْتِكُمْ
 فَتَغْسَا وَتُكْسَا

ہمیشہ تم گھائلے میں رہو گے۔ اس سودے میں تم نے نقصان اٹھایا ہے۔ تم خدا کی ناراضگی میں گرفتار ہو اور ذلت و رسوائی کا طوق تمہاری گردن میں پڑا ہے۔ تم نے اتنا بڑا علم کیا ہے کہ مجھے ڈر ہے کہ تمہیں آسمان پھٹ نہ پڑے اور زمین دھنس نہ جائے پہاڑ ریزہ ریزہ نہ ہو جائیں۔ جانتے ہو تم نے کس طرح رسول خدا کے جگر کو جلایا ہے۔ اور اس کی حرمت کو پامال کیا ہے؟ تم نے کونسا خون بہایا ہے؟ اپنا منہ کس چیز سے کالا کیا ہے؟ تم نے سوچے سمجھے بغیر وہ بڑا کام انجام دیا ہے جس کے شر سے زمین و آسمان لبریز ہیں۔ حیران نہ ہوں کہ آسمان کیوں خون آلود ہے اور وہاں نقصان اٹھانے والوں کا کوئی یار و مددگار نہ ہو گا۔

اس سہلت سے تم خوش فہمی میں نہ رہو کیونکہ خدا فوراً ظالموں کو کیفر کردار تک نہیں پہنچاتا۔ آخر کار مظلوم کی فریاد رسی کرتا ہے۔ وہ ہمارا اور تمہارا نگران ہے اور وہ گناہ گاروں کو دوزخ تک گھسیٹ کر لے جاتا ہے

اس کے بعد جناب زینب (س) نے ان سے منہ پھیر لیا اور ان سب کو حیران اور انگشت بدنداں کر دیا۔ قبیلہ بنی بھی کے ایک بوڑھے شخص نے جس کی ریش آنسوؤں سے تر ہو چکی تھی، کہا:

كُھُولُھُمْ خَيْرُ الْكُھُولِ وَ نَسَلُھُمْ اِذَا عَدَّ نَسْلَ لَا یُورِ وَلَا یُخْزِی (۱)

ان کے بیٹے بہترین بیٹے ہیں۔ ان کا خاندان سر بلند خاندان ہے

قیدیوں کو ابن زیاد کے دربار میں لے جایا گیا۔ اس جلسے میں اپنی قدرت و طاقت کی زیادہ سے زیادہ دھاک بٹھانے کے تمام وسائل پہلے سے فراہم کیے جا چکے تھے۔ قدرت اور طاقت کا یہ مظاہرہ خاندان بنی بھی کو دکھانے اور کوفہ کے لوگوں کی آنکھوں کو خیرہ کرنے کے لیے تھا۔ ابن زیاد نے اپنے وہم و گمان میں کامیابی کے تمام زینے طے کر لیے تھے۔ حسین علیہ السلام کو قتل کر دیا۔ ان کی عورتوں اور بچوں کو قیدی بنا لیا۔ عراق کے شیعوں کے منہ پر مٹی مل دی تھی۔ اس کے بعد کسی کی جرات ہے کہ وہ نام علیؑ زبان پر لائے!

ابن زیاد نے پوچھا: یہ عورت کون ہے؟

جواب دیا گیا: زینب بنت فاطمہ (س)

ابن زیاد: خدا کا شکر ہے۔ دیکھا تم نے، خدا نے تمہیں کس طرح ذلیل و خوار کیا اور تمہارے جھوٹ کو آشکار کر دیا؟

(۱) بیانات، ۲، المبع نجف ص ۲۳۔ حمرة العرب ج ۲ ص ۱۲۳-۱۲۶۔ اعلام النساء ج ۲ ص ۲۵۹

ابن زیاد کو اپنی طاقت اور حکومت پر ناز تھا۔ طاقت اور قدرت نمائی کے لیے اس سے بدتر کوئی درد نہیں ہے کہ اسے کچھ نہ سمجھا جائے اور لوگوں کے سامنے اس کی تذلیل و تحقیر کی جائے۔ علیؑ کی بیٹی نے اس طرح بولنا شروع کیا گویا کوئی واقعہ رونما ہی نہیں ہوا۔ جیسے نہ ان کا بھائی اور دیگر یار و انصار مارے گئے ہوں، نہ انہیں دوسری عورتوں اور بچوں کے ساتھ قیدی بنایا گیا ہو اور نہ انہیں اس خونخوار اور اس ذلیل آدمی کے سامنے لا کھڑا کیا گیا ہو۔ بلکہ یوں لگتا تھا جیسے یہ محفل ایک علمی مناظرے کے لیے سجائی گئی ہو:

خدا کی حمد و ثنا ہے کہ اس نے حضرت محمدؐ کے ذریعے ہمیں عزت بخشی۔
فاسق جھوٹ بولتے ہیں اور بدکار رسوا ہوتے ہیں اور وہ ہم نہیں ہیں
ہمارے غیر ہیں۔

ابن زیاد کو حیرت ہوئی کہ جس گردن کو وہ جھکانا چاہتا تھا وہ بھکنے کی بجائے اور تن گئی ہے۔ سر جھکائے بے جان جسموں کے سروں کو ان کے چاہے بغیر اونچا کر دیا۔ مجبوراً ابن زیاد نے پینترا بدلا۔

ابن زیاد: دیکھا! تمہارے بھائی کے ساتھ خدا نے کیا سلوک کیا؟
ذینب: ہم نے خدا کی طرف سے اچھائی اور بھلائی کے سوا کچھ نہیں دیکھا۔ میرے بھائی نے اپنے یار و انصار کے ساتھ اس راستے کا انتخاب کیا جو خدا چاہتا تھا۔ انہوں نے شہادت کو گلے لگایا اور انتہائی افتخار کے ساتھ انہوں نے یہ نعمت حاصل کی ہے البتہ تجھ ظالم و شنگرنے جو کیا ہے اس کی سزا پائے گا۔
ابن زیاد بالکل لا جواب ہو گیا اس جواب سے وہ سر کوب ہو گیا۔ شکست خوردہ شخص کے پاس آخری ہتھیار کیا ہے؟ گالی گلوچ!

ابن زیاد: تیرے باغی اور سرکش بھائی کے قتل سے خدا نے میرا کلیجہ ٹھنڈا کر دیا ہے۔
ذینب: ابن زیاد! تو نے ہمارے سربراہ کو شہید کر دیا۔ میرے کنبہ کے تمام مردوں کو مار ڈالا۔ تو نے ہماری شاخوں کو کاٹ ڈالا اور ہماری جڑوں کو اکھاڑ دیا۔ تیرے درد کی دوا یہی ہے تو یہی سہی۔

ابن زیاد: (یہ عورت) بڑی مسجع گفتگو کرتی ہے۔ اس کا باپ بھی ایسی ہی مسجع باتیں کرتا تھا۔ (۱)

☆☆☆☆☆

(۱) طبری ج ۷ ص ۲۱۲

کاروان کی آخری منزل

شام، تیرہویں ہجری میں خالد بن ولید کی سربراہی میں مجاہدین اسلام کے ہاتھوں فتح ہوا۔ کچھ ہی مدت بعد حضرت عمر کی خلافت میں امیر معاویہ اس علاقے کا گورنر بن گیا اور اپنی موت تک وہ اسی طرح شام پر حکومت کرتا رہا۔

شام کے لوگوں نے اسلامی دستور اور تعلیمات کو خالد، معاویہ اور ان جیسے افراد کی رفتار و کردار کے آئینے میں دیکھا۔ انہیں سیرت پیغمبرؐ اور مجاہدین و انصار کے طرز عمل کا کچھ پتہ نہ تھا۔ ۶۱ ہجری میں شام میں چند افراد تھے جن کی عمریں ساٹھ سال سے اوپر تھیں۔ ان کی ترجیح یہی تھی کہ وہ ایک گوشے میں بیٹھ جائیں اور جو کچھ ہو رہا ہے اس سے آنکھیں بند کر لیں۔ تعجب کی بات ہے کہ جب ۱۳۲ سال کے بعد خاندان عباسی کا حکمران اس شہر میں آیا تو لوگوں نے کہا کہ ہم نہیں جانتے تھے کہ حضرت محمدؐ کے رشتہ دار اور قریبی بنی امیہ کے علاوہ کوئی اور بھی ہیں۔ یہاں تک کہ تم برسرِ اقتدار آ گئے۔ (۱)

اکثر مقتل کی کتب میں یہ لکھا ہے کہ اسیروں کے شہر دمشق میں داخلے کے موقع پر لوگوں نے شہر کو سجایا ہوا تھا تو یہ بعید نہیں اور اگر یزید نے اپنے دربار میں یہ اشعار پڑھے ہوں: ”کاش! آج میرے جنگ بدر میں مارے جانے والے بزرگ موجود ہوتے تو دیکھتے کہ میں نے کس طرح محمدؐ کی اولاد سے ان کا انتقام لیا ہے“ تو یہ بھی بعید نہیں ہے کیونکہ اس دن یزید کی مجلس میں اس کے ارد گرد ایسے افراد بیٹھے تھے جنہوں نے اسلام اور پیغمبرؐ کو حکومت تک پہنچنے کا ذریعہ بنایا ہوا تھا، نہ کہ قربت خدا کا ذریعہ۔

آپ ملاحظہ فرمائیں کہ دونوں محفلیں ایک طرح کی ہیں اور باتیں بھی ایک جیسی ہیں۔

(۱) المعونات النادرہ ص ۷۱

کونے میں ابن زیاد خوشی سے پھولا نہیں سماتا تھا کہ اس نے اپنا فرض پورا کر دیا ہے اور عراقیوں کے ہاتھوں سے ان کی قوت چھین لی ہے۔ شام میں یزید افتخار کر رہا ہے کہ جنگ بدر میں اس کے مقتول بزرگوں کا خون رائیگاں نہیں گیا۔ اگر یہ معاملہ یہیں پر ختم ہو جاتا تو کامیاب تھا لیکن نضب (س) نے اسے اس کی کامیابی کا پھل کھانے نہ دیا۔ وہ جسے اپنے لیے شیریں سمجھ رہا تھا نضب (س) نے اس کا مزہ حد سے زیادہ کڑوا کر دیا اور اس کے لیے تلخ بنا دیا۔ جناب نضب نے اپنی مختصر گفتگو میں اہل مجلس کو سمجھا دیا کہ ان پر حکومت کرنے والا کون ہے اور کس کے نام پر حکومت کر رہا ہے اور رسیوں میں جکڑے اس کے سامنے کھڑے قیدی کون ہیں۔ اس واقعے کے ایک سو چالیس سال بعد پیدا ہونے والے احمد بن طاہر بن ابی طاہر کی کتاب ”بلاغات النساء“ سے ان کے کلام کو میں نے نقل کیا ہے۔ اس کے بعد والے مآخذ میں اس کے الفاظ میں اختلافات پائے جاتے ہیں:

ثُمَّ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِينَ آسَاءَ وَالسُّوْءَى أَنْ كَذَّبُوا بِآيَاتِ اللَّهِ وَكَانُوا بِهَا يَسْتَهْزِءُونَ (روم: ۱۰)

پس برائی کرنے والوں کا انجام برا (دوزخ) ہو گا کیونکہ انہوں نے آیات الہی کو جھٹلایا ہے اور ان کا مذاق اڑایا ہے۔

یزید! کیا تو سمجھتا ہے کہ جب زمین و آسمان ہم پر ٹک کر دیا گئے ہیں اور ہمیں قیدی بنا کر شہر بہ شہر پھرایا گیا ہے، کیا خدا کے نزدیک ہم رسوا ہیں اور تو صاحب عزت و شرف ہے اور تو نے جو کچھ انجام دیا ہے وہ تیری سرداری کی علامت ہے؟ تو اپنے آپ پر فخر و مباہلات کر رہا ہے اور اپنے کئے پر خوش ہو رہا ہے کہ دنیا تیری تابع ہے اور تیرے سب کام سیدھے اور منظم ہیں۔

ایسا کہیں ہے! یہ خوشی تیرے لیے غم ہے۔ یہ مہلت تیرے لیے مصیبت ہے اور یہ قول خدا ہے: وہ لوگ جنہوں نے کفر اختیار کیا ہم ان کو مہلت دیتے ہیں اور وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ہمارے لیے بہتر ہے۔ میں ان کو اس لیے مہلت دیتا ہوں تاکہ وہ اپنے گناہوں کو اور بدحالیوں اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔ اے آزاد شدہ غلاموں کی اولاد! (۱) کیا یہ انصاف ہے کہ تیری عورتیں اور کنیریں تو پردے میں ہوں لیکن رسول زادوں کو در بدر پھرایا جائے۔ ان کی حرمت کو پامال کیا گیا۔ ان کا دم گھٹا ہے۔ انہیں بے پالان اونٹوں پر سوار کیا جائے اور شتر بان ان کے دشمن ہوں۔

ایک شہر سے دوسرے شہر ایک بازار سے دوسرے بازار

أَظَنَنْتَ يَا يَزِيدُ أَنَّ اللَّهَ جِئِنَ أَخَذَ عَلَيْنَا بِأَطْرَافِ الْأَرْضِ وَ أَكْثَافِ السَّمَاءِ فَاصْبَحْنَا نُسَاقُ كَمَا يُسَاقُ الْأَسَارَى، أَنْ بَنَّا هَوَانًا عَلَى اللَّهِ وَ بَكَ عَلَيْهِ كِرَامَةً. فَسَمِعَتْ بِإِنْفِكَ وَ نَظَرَتْ فِي عِظْفِكَ جَذْلَانِ فَرَحًا. جِئِنَ رَأَيْتَ الدُّنْيَا مُسْتَوْبِقَةً لَكَ. وَالْأُمُورَ مُتَّبِقَةً حَوْلَكَ

وَقَدْ أُمِهَلَتْ وَ نَقُتَتْ وَ قَوْلُ اللَّهِ تَبَارَكَ وَ تَعَالَى وَلَا يَخْسِبَنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا إِنَّمَا نُمِلُّ لَهُمْ خَيْرٌ لِّأَنفُسِهِمْ إِنَّمَا نُمِلُّ لَهُمْ لِيَزْدَادُوا إِثْمًا. وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّهِينٌ. (آل عمران: ۱۷۸) أَمِنَ الْعَدْلُ يَابْنَ الطُّلَقَاءِ تَخْدِيرَكَ نِسَانِكَ وَ إِمَانِكَ وَ سَوْفَكَ بِنَاتِ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ قَدْ هَتَكَتْ سُورَهُنَّ وَ اضْهَلَّتْ صَوْتَهُنَّ مُكْتَتِبَاتٍ تَخْدِي بِهِنَّ الْأَبَاعِرَ وَ يَخْذُو بِهِنَ الْأَعْدَايُ. مِنْ بَلَدٍ إِلَى بَلَدٍ. لَا يُرَاقِبْنَ وَلَا يُؤَوِّنْنَ. يَتَشَوَّفُهُنَّ

الْقَرِيبُ وَالْبَعِيدُ. لَيْسَ مَعَهُنَّ وَلِيُّ مِنْ رِجَالِهِنَّ. وَكَيْفَ يُسْتَبَطَا فِي بُغْضِنَا مَنْ يُنْظَرُ إِلَيْنَا بِالشَّنَفِ وَالشَّنَانِ وَالْإِخْوَانِ وَالْأَضْعَانِ. أَتَقُولُ لَيْتَ أَشْيَاخِي يَبْدُرُ شَهْدُوا غَيْرَ مُتَائِمٍ وَلَا مُسْتَعْظِمٍ؟ وَأَنْتَ تَنْكُثُ ثَنَابَا أَبِي عَبْدِ اللَّهِ.

وَلَمْ لَا تَكُونُ كَذَلِكَ؟ وَقَدْ نَكَثَ الْقَرْحَةُ وَاسْتَاصَلَتْ الشَّاقَّةَ بِأَهْرَاقِكَ دِمَاءَ ذُرِّيَّةِ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَنُجُومِ الْأَرْضِ مِنْ آلِ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ. وَلَتَرَدَّنْ عَلَى اللَّهِ وَشَيْكَأَ مَوْرِدَهُمْ وَلَتَوَدَّنْ أَنْكَ عَمِيَّتَ وَبِكَمَّتْ وَأَنْكَ لَمْ تَقُلْ: (فَاسْتَهْلُوا وَأَهْلُوا فَرَحًا) اللَّهُمَّ خُذْ بِحَقِّنَا، وَانْقِمْ لَنَا مِنْ ظَلَمِنَا، وَاللَّهُ مَا فَرَيْتَ إِلَّا بِي جِلْدِكَ، وَلَا خَزَزْتَ إِلَّا بِي لَحْمِكَ وَاسْتَرَدَّ عَلَى رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ بِرَغْمِكَ، وَعِثْرَتِهِ وَلَحْمِيهِ فِي حَظِيرَةِ الْقُدُسِ، يَوْمَ يَجْمَعُ اللَّهُ شَمْلَهُمْ مَلْمُومِينَ مِنَ الشَّعْ، وَهُوَ قَوْلُ اللَّهِ تَبَارَكَ وَتَعَالَى: وَلَا تَخْسِنِ الَّذِينَ قُتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَالًا بَلْ أَحْيَاءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُونَ. (آل عمران: ۱۶۹)

وَسَيَقْلَمُ مَنْ بَوَّأَكَ وَمَكَّنَكَ مِنْ رِقَابِ الْمُؤْمِنِينَ - إِذَا كَانَ الْحَكَمُ لِلَّهِ، وَالْعِزُّ

انہیں پھرایا جائے۔ ان کا نہ کوئی ہمدرد ہے نہ ان کا کوئی مددگار۔ نہ ان کے لیے کہیں جائے پناہ ہے اور نہ کوئی غمخوار۔ دور و نزدیک کی نظریں ان پر لگی ہیں لیکن کوئی بھی ان کی حالت پر رحم کھانے والا نہیں۔ سب ہمیں حقارت سے دیکھتے اور بغض و کینہ کی چٹکاریاں لئے ہمیں گھورتے ہیں۔ تو خوش نہ ہو، ہماری دشمنی کو دل سے نہ نکال۔ تو پیغمبر کے جگر گوشہ کے دانتوں پر چھڑی مار رہا ہے اور تو اپنے بدر میں مارے جانے والوں کو یاد کر رہا ہے کہ کاش وہ ہوتے اور تجھے شاباش دیتے۔ جو کچھ تو نے کیا اسے چھوٹا سمجھ رہا ہے اور اپنے آپ کو بے گناہ خیال کر رہا ہے۔

خوشیوں کے شادیانے کیوں نہ بجائے، اس لیے کہ تو نے ہمارے دلوں کو جلا کے رکھ دیا ہے۔ تو نے جو انان عبدالمطلب کا خون بہایا۔ تو نے زمین کے ستاروں اور رسول رب العالمین کے بیٹوں کا خون بہایا۔ تجھے جلد بارگاہ الہی میں ان کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اس وقت تیری شدید خواہش ہو گی کہ کاش میں اندھا اور گونگا ہوتا اور یہ نہ کہتا: ”کتنا اچھا ہوتا کہ آج اگر جنگ بدر میں مارے جانے والے میرے بزرگ ہوتے تو مجھے شاباش دیتے اور خوش ہوتے۔“ خدا! ہمارے حق کو لے۔ جنہوں نے ہم پر ظلم و ستم کیا انہیں کیفر کردار تک پہنچا۔ اے یزید! خدا کی قسم تو نے اپنی کھال ادھیری اور اپنا گوشت کاٹا ہے۔ تو بہت جلد رسول اللہ کے سامنے ناخواہ پیش کیا جائے گا۔ جب ان کے رشتے دار اور ان کی اولاد بہشت میں محو آرام ہو گی۔ خدا کی رحمتوں میں سرشار ہو گی۔ انہیں کسی قسم کا غم اور پریشانی نہ ہو گی۔ یہ خداوند متعال کا فرمان ہے:

جو راہ خدا میں قتل کر دیے گئے ہیں انہیں مردہ خیال نہ کرو وہ اپنے پروردگار کے ہاں زندہ ہیں اور وہ اپنا رزق پاتے ہیں (آل عمران: ۱۶۹)

جس نے تمہیں اس کرسی پر بٹھایا ہے اور مسلمانوں کی گردنوں میں تیری اطاعت کا طوق ڈالا ہے۔ وہ جلد جان لے گا کہ کھائے میں کون رہا۔ کون ذلیل و خوار ہے

(۱) جس دن رسول اکرمؐ نے کھنچ کیا تو قریش کے بڑے لوگ آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپؐ نے فرمایا: آپ لوگوں کا کیا خیال ہے کہ میں آپ کے ساتھ کیسا لوک کروں گا؟ انہوں نے کہا کہ جو ایک چھڑاڑ بھائی کے لیے مناسب ہے۔ آپؐ نے فرمایا: جائے آپ لوگ آزاد ہیں۔ اس دن سے قریش کے لوگ ایام الطلاق کے نام سے مشہور ہو گئے۔

اور کون بے یار و مددگار ہے۔ اس دن مقدمہ پیش کرنے والے جناب محمد مصطفیٰ ہوں گے۔ فیصلہ کرنے والا خدا ہو گا اور گواہی دینے والے تیرے ہاتھ پاؤں ہوں گے۔

اے دشمن خدا اور دشمن خدا کے بیٹے! میں تجھے ذلیل سمجھتی ہوں۔ تیری دھمکیوں کی پرواہ نہیں کرتی۔ لیکن کیا کروں میری آنکھیں برس رہی ہیں اور میرا سینہ غم سے پھٹا جا رہا ہے اور حسین کی شہادت کا غم جو ہمارے سینوں میں موجزن ہے، اس کا کوئی مداوا نہیں۔ شیطان کے لٹکر (۱) نے ہمیں یہ تو قوفوں (۲) کے مجمع میں بھیجا ہے تاکہ وہ انہیں خدا کی ہنک حرمت کے بدلے میں مال خدا بطور انعام عطا کرے۔ یہ ظلم و بربریت والے ہاتھ ہمارے خون سے آلودہ ہیں۔ یہ ہمارا گوشت ہے جو یہ دانتوں سے چبا رہے ہیں۔ یہ شہداء کے پاکیزہ جسم ہیں جنہیں جنگل کے بھیڑیے فوج رہے ہیں۔ اگر تم ہمیں مال غنیمت سمجھتے ہو تو ہم جہانہ لیں گے، اس دن جب تمہارے برے اعمال کے سوا تمہارے پاس کچھ نہ ہو گا۔ تو مر جانے کے بیٹے کو پکارے گا! اور وہ تجھ سے مدد چاہے گا۔ تو میزان کے کنارے اپنے یاروں کے ساتھ کھڑے ہو کر کتوں کی طرح بھونکے گا کہ سب سے بہتر زاد راہ جو معاویہ نے تیرے لیے تیار کیا وہ پیغمبر کے بیٹے کا قتل ہے، جو وہ تیری گردن میں ڈال گیا ہے۔ خدا کی قسم! خدا کے سوا مجھے کسی کا ڈر نہیں ہے اور اس کے سوا کسی کے سامنے شکوہ نہیں کرتی۔ تیرے پاس جو مکروہ حیلہ ہے اسے بروئے کار لے آ، اپنی تمام تر کوششوں کو آزمائے۔ خدا کی قسم! تیرے ماتھے سے یہ بد نما داغ نہ مٹ سکے گا۔

حمہ و ستائش ہے اس پروردگار کی جس نے جو انسان جنت کے سردار کا انجام خیر و سعادت اور مغفرت قرار دیا اور بہشت کو ان کے لیے واجب کر دیا۔ میری دعا ہے خداوند متعال ان کی قدر و منزلت میں اضافہ فرمائے اور اپنا بے حد فضل انہیں عطا فرمائے کہ وہی طاقتور مددگار ہے۔ (۳)

مَحَمَّدٌ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ ، وَجَوَارِحُكَ شَاهِدَةٌ عَلَيْكَ ، فَبُنْسَ لِلظَّالِمِينَ بَدَلًا - أَيْكُمْ شَرُّ مَكَانًا وَأَضْعَفُ جُنْدًا ، مَعَ أَنِّي وَاللَّهِ يَا عَدُوَّ اللَّهِ وَابْنُ عَدُوِّهِ ، أَسْتَصْغِرُ قُدْرَكَ ، وَأَسْتَغْثِمُ تَقَرُّيْمَكَ ، غَيْرَ أَنَّ الْعَيُونَ غَبْرَى وَالصُّدُورُ حُرَى ، وَمَا يَجْزِي ذَلِكَ . أَوْ يُغْنِي عَنَّا : وَقَدْ قُتِلَ الْحُسَيْنُ عَلَيْهِ السَّلَامُ ، وَحَزَبُ الشَّيْطَانِ يُقَرِّبُنَا إِلَى حَزْبِ اسْقَهَاءٍ ، لِيُغْطَوْهُمْ أَمْوَالُ اللَّهِ عَلَى انْتِهَاكَ مَحَارِمِ اللَّهِ ، فَهَذِهِ الْآبِدَى تَنْطَفِ مِنْ دِمَانِنَا ، الْأَقْوَاهُ تَنْحَلُّبُ مِنْ لُحُومِنَا ، وَتَلْكَ الْجَنَّتُ الزَّوَاكِي ، يَغْتَامُهَا عَسَلَانُ الْفَلَوَاتِ ، فَلَيْنِ اتَّخَذْتَنَا مَغْنَمًا لَتَتَّخِذَنَّ مَغْرَمًا ، حِينَ لَا تَجِدُ إِلَّا مَا قَدَّمْتَ يَدَاكَ .

تَسْتَصْرِخُ بَابِنِ مَرْجَانَةٍ ، وَيَسْتَصْرِخُ بِكَ ، وَتَعَاوَى وَاتَّبَاعُكَ عِنْدَ الْمِيزَانِ ، وَ قَدْ وَجَدْتَ أَفْضَلَ زَادَ زَوَدَكَ مُعَاوِيَةُ فَتَلْكَ ذُرِّيَّةُ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ ، فَوَاللَّهِ مَا أَتَّقِيْتُ غَيْرَ اللَّهِ ، وَلَا شَكَاوَى إِلَّا إِلَى اللَّهِ ، فَكَيْدَ كَيْدِكَ ، وَاسْعَ مَغْيِكَ ، وَتَأَصَّبَ جُهْدَكَ ، فَوَاللَّهِ لَا يُرْخَضُ عَنْكَ ، عَارِمًا أَتَيْتَ إِلَيْنَا أَبَدًا ،

وَالْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي خَتَمَ بِالسَّعَادَةِ وَالْمَغْفِرَةِ لِسَادَاتِ شُبَّانِ الْجَنَّةِ ، فَأَوْجِبَ لَهُمُ الْجَنَّةَ . أَسْأَلُ اللَّهَ أَنْ يَرْفَعَ لَهُمُ الدَّرَجَاتِ وَأَنْ يُوجِبَ لَهُمُ الْبَزِيدَ مِنْ فَضْلِهِ فَإِنَّهُ وَلِيُّ قَدِيرٌ

(۱) عبد اللہ بن زیاد اور اس کا لشکر مراد ہے۔

(۲) یزید اور اس کے لوگ مراد ہیں

(۳) بلاغات النساء، ص ۲۱ - ۲۳ - مخرجة خطب العرب ج ۲ ص ۱۲۶ - ۱۲۹ - اعلام النساء ج ۲ ص ۹۵ - ۹۷

جو کچھ عراق میں ہوا آہستہ آہستہ دمشق کے لوگ اس کی حقیقت سے آگاہ ہو گئے۔ وہ سمجھ گئے کہ امام حسین علیہ السلام کو یزید کے حکم سے کوفہ کے سپاہیوں نے شہید کیا ہے۔ یہ کسی باغی کا قصہ نہ تھا۔ بلکہ رسول خدا کا نواسہ تھا اور جن عورتوں اور بچوں کو وہ قیدی بنا کر دمشق لے آئے ہیں یہ رسول اللہ کے گھر والے ہیں۔ یہ ان کا کنبہ ہے جن کی خلافت اور جانشینی کے نام پر یزید ان پر اور دیگر مسلمانوں پر حکومت کر رہا ہے۔ اس مجلس کی تمام روئیداد، اس میں چند افراد کی طرف سے یزید پر اعتراضات اور تنقید اور مسجد دمشق میں امام علی بن الحسین (علیہما السلام) کی تقریر، متاخر مآخذ اور متون میں دیکھی جاسکتی ہے۔ یہ تمام واقعات اور بیانات اجمالی طور پر ایک حقیقت کی نشاندہی کرتے ہیں کہ ہخاندان رسالت سے جو سلوک کیا گیا اس پر لوگ ناخوش تھے۔ انہی واقعات کے بعد یزید نے اپنی عافیت اس میں دیکھی کہ قیدیوں کو مزید اپنے پاس نہ رکھے۔ پہلے پہل وہ ان سے اظہار ہمدردی اور کوشش کرنے لگا کہ جو کچھ کربلا میں ہوا ہے، اس کی تمام ترمیم داری ابن زیاد کی گردن پر ڈال دے۔ بہر حال قافلے نے واپس جانے کی اجازت چاہی اور مدینہ کی طرف چل پڑا۔ لیکن کب؟ کس مہینے اور کون سے سال؟ یہ بات صحیح طور پر واضح نہیں ہے۔

آیا یہ کاروان دمشق سے سیدہ مدینہ گیا؟ یا اپنا راستہ طولانی کر کے کربلا پہنچا تا کہ شہداء کے مزارات کی زیارت کر لے؟ کیا یزید نے اس کی موافقت کی؟ اور اگر یہ قافلہ کربلا تک واپس آیا ہو تو کیا یہ درست ہے کہ وہاں پر زیارت کے لیے آئے ہوئے صحابی حضرت جابر بن عبد اللہ انصاری سے اس کی ملاقات ہوئی؟ کیا وہاں پر مجلس عزاداری اور ماتم داری برپا ہوئی؟ اور اگر ہوئی تو چند میلوں کے فاصلے پر موجود حاکم کوفہ نے کس طرح تحمل کیا کہ اس طرح کی مجلس اور عزاداری وہاں پر برپا ہو؟ بالقرض اگر یہ تمام واقعات وہاں رونما ہوئے ہوں تو مجلس کون سی تاریخ کو ہوئی؟ واقعہ کربلا کے چالیس دن بعد؟

مسلمانوں کی بات حقیقت کے منافی ہے۔ کیونکہ ایک عام مسافر کے کربلا سے کوفہ اور وہاں سے شام اور پھر کربلا پہنچنے کے لیے اس دور کے وسائل سفر کے ساتھ چالیس دن سے زیادہ کا عرصہ درکار ہے۔ چہ جائیکہ سفر قافلے کی صورت میں ہو اور یہ کہ ابن زیاد کی طرف سے قیدیوں کے بارے میں فرمان لینے کے لیے قاصد دمشق جائے اور وہاں سے جواب آئے اور پھر قافلہ دمشق کی طرف روانہ ہو۔ اگر ان سب چیزوں کو پیش نظر رکھا جائے تو دو تین ماہ کا عرصہ درکار ہے اور یہ فرض بھی درست نہیں ہے کہ اسیروں کا قافلہ ۶۲ ہجری میں چہلم پر کربلا پہنچا ہو۔ کیونکہ اسیروں کا دمشق میں زیادہ مدت تک رہنا یزید کے حق میں بہتر نہ تھا (جیسا کہ پہلے بھی ہم نے لکھا ہے)۔ بہر حال ان واقعات میں ابہام موجود ہے اور درجہ اول کی روایات میں تحریف اور گڑبڑ ہونے کی وجہ سے بطور نتیجہ یہی کہا جاسکتا ہے کہ حقیقت کو اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ اسی طرح کربلا کی شیردل خاتون

کی باقی زندگی کے حالات بھی واضح طور پر موجود نہیں ہیں۔

یہ امر مسلم ہے کہ شام سے واپسی کے بعد جناب زینب (س) زیادہ دیر تک زندہ نہیں رہیں۔ جیسا کہ مشہور ہے کہ وہ سنہ ۶۲ ہجری میں اپنے خالق حقیقی سے جا ملیں۔ کہاں پر؟ مدینہ؟ دمشق؟ یا قاہرہ؟ سیرت نگاروں میں سے ہر ایک نے اپنے نظریے کی صداقت کے لیے دلیل یا دلائل پیش کئے ہیں۔

قاہرہ کے شہر میں سیدہ زینب (س) کے نام پر جو مزار قائم ہے وہاں دن رات خصوصاً جمعہ کی رات اور دن کو بہت زیادہ زائر آتے ہیں۔ اس طرح کی ایک اور زیارت گاہ ”راس الحسین“ کے نام سے بنائی گئی ہے۔ گویا چوتھی صدی ہجری میں جب قاہرہ فاطمیوں کے قبضے میں آیا تو انہوں نے ان دو زیارت گاہوں کو بنا کر لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی۔

بہت سے مؤرخین اور ناقدین حدیث، دمشق کے مزار کی اصلیت کا بھی انکار کرتے ہیں۔ مصنف نے اپنے سفر نامہ میں، جو چند ماہ پہلے یمن (۱) رسالے میں چھپ چکا ہے، قاہرہ کے حوالے سے لکھا ہے کہ یہ زیارت گاہیں ان گھروں کی مصداق ہیں جہاں اللہ کا نام بڑائی اور بزرگی کے ساتھ لیا جاتا ہے اور اہل بیتؑ سے محبت کرنے والے خلوص نیت کے ساتھ جن کے نام پر مزار بنائے گئے ہیں ان سے اپنی عقیدت و ارادت کا اظہار کرتے ہیں اور اپنے رسولؐ اور ان کے خاندان سے تجدید عہد کرتے ہیں۔

☆☆☆☆☆

ام کلثوم

حضرت امیر المومنین علیہ السلام کی جناب فاطمہ زہرا (س) سے دوسری بیٹی ام کلثوم صغریٰ ہیں۔ اس بارے میں مؤرخین کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے کہ حضرت علی علیہ السلام کی حضرت فاطمہ زہرا (س) سے دو بیٹیاں تھیں۔ طبری جب حضرت علی کی اولاد شمار کرتا ہے تو لکھتا ہے: زینب کبریٰ اور ام کلثوم۔ (۱) جناب فاطمہ (س) کے علاوہ دوسری بیویوں سے حضرت امیر کی اولاد بیان کرتا ہے تو لکھتا ہے: زینب صغریٰ اور ام کلثوم صغریٰ۔ (۲) شیخ مفید نے حضرت امیر المومنین (ع) کے لڑکے اور لڑکیوں کی تعداد چھبیس بیان کی ہے۔ حسن، حسین، زینب کبریٰ، اور زینب صغریٰ، جن کی کثیت ام کلثوم ہے، ان کی والدہ فاطمہ زہرا ہیں۔ (۳)

اختلاف صرف یہ ہے کہ ام کلثوم حضرت علیؑ کی دوسری بیٹی کا نام ہے یا اس کی کنیت ہے۔ بیشتر مؤرخین نے ان کا نام ام کلثوم لکھا ہے۔

ام کلثوم آٹھویں ہجری کے بعد پیدا ہوئیں۔ ان کی شادی پہلے عون ابن جعفر سے ہوئی۔ ان کی وفات کے بعد انہوں نے عون کے بھائی محمد بن ابی طالب سے نکاح کر لیا۔ زیادہ مؤرخین نے یہی لکھا ہے کہ محمد (۴) کے قتل کے بعد ام کلثوم نے کسی اور سے نکاح نہیں کیا۔ ان کا ایک ہی بیٹا تھا جن کا نام زید رکھا گیا۔

جناب ام کلثوم نے کب وفات پائی؟ معلوم نہیں ہے۔ کتاب بلاغات النساء کے مصنف احمد

(۱) طبری ج ۶ ص ۳۴۷

(۲) ایضاً ص ۳۴۷-۳۴۸

(۳) ارشاد ص ۳۵۵ ج ۱

(۴) دونوں طرح لکھے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں: مناقب الطاہرین ص ۲۱۔ قاموس الرجال ج ۸ ص ۹۶۔

بن ابی طاہر طیفوری متوفی ۲۸۰ ہجری نے امام صادق علیہ السلام سے ایک روایت نقل کی ہے اور آنحضرت نے اپنے آباء سے نقل کی ہے۔ اس میں بیان ہوا ہے کہ ام کلثوم نے بازار کوفہ میں لوگوں کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور پھر ایسا فصیح و بلیغ خطبہ پڑھا گویا علی ابن ابی طالب آگئے ہوں اور خطبہ دے رہے ہوں۔ (۱) عمر رضا کحالی نے اعلام النساء (۲) میں احمد بن ابی طاہر سے منقول یہ خطبہ لکھا ہے۔ لیکن اس روایت کو اس شکل میں قبول نہیں کیا جاسکتا کیونکہ شیعہ اور سنی دونوں فرقوں کے مؤرخین اور سیرت نگاروں نے لکھا ہے کہ ام کلثوم اور ان کے بیٹے زید ایک ہی دن مدینہ میں فوت ہوئے۔ زید کی موت کے بارے میں لکھا ہے کہ ایک رات بنی جہم کے افراد کے درمیان لڑائی چھڑ گئی۔ زید لڑائی میں صلح کرانے کے لیے داخل ہوئے لیکن رات کی تاریکی میں انہیں ضربت لگی اور وہ فوت ہو گئے۔

اور عبد اللہ بن عامر سعید نے اس کے بارے میں کہا ہے:

إِنَّ عَدِيًّا كَلِمَةً الْبَقِيعَ يُفَرِّجُوا عَنْ رَجُلٍ صَرِيعٍ
مُقَابِلٍ، فِي الْحَسْبِ الرَّفِيعِ أَذْرَكَهُ شَوْمُ بَنِي مُطِيعِ

زید اور ان کی ماں اس طرح اکٹھے فوت ہوئے کہ لوگ نہ سمجھ سکے کہ کون پہلے مرا ہے۔ اسی وجہ سے دونوں میں سے کسی نے بھی دوسرے کی وراثت نہ پائی۔ (۲)
ابن سعد نے لکھا ہے: زید اور اس کی ماں ام کلثوم دونوں ایک ہی دن فوت ہوئے اور عبد اللہ بن عمر نے ان دونوں کی نماز جنازہ پڑھائی۔ دوسری روایت جو اس نے بنی ہاشم کے مولا (آزاد کردہ غلام) عمار بن ابی عمار سے نقل کی ہے۔ (۳) اس میں ہے کہ سعید بن عاص جو اس وقت مدینہ کا حاکم تھا اس نے ان دونوں کی نماز جنازہ پڑھائی۔ (۴)
سعید بن عاص نے سنہ ۴۱ ہجری سے لے کر سنہ ۵۶ ہجری تک مدینہ پر حکمرانی کی۔ (۵) اگر مندرجہ بالا روایت کو درست تسلیم کریں تو ان کی وفات کوفہ سے مدینہ واپسی پر سنہ ۴۲ ہجری سے

(۱) بلاغات النساء (۲) اعلام النساء ج ۳ ص ۲۵۹

(۲) نب قریش ص ۲۵۲ - ۲۵۳ - ملاحظہ فرمائیں تھمرۃ الانساب العرب ص ۳۸ و ۱۵۸

(۳) جو روایت شیخ طوسی نے "خلافا" ج ۱ ص ۲۶۱ میں عمار یاسر سے اس بارے میں بیان کی ہے اس میں ابو عمار کو ابن سعد کی طرح غلط لکھ دیا ہے۔ جبکہ شیخ کی سند میں عمار بن عمار یاسر لکھا ہے۔

(۴) طبقات ج ۸ ص ۳۴۰

(۵) معجم الانساب ج ۱ ص ۱۳۵

لے کر سنہ ۵۶ ہجری کے درمیان ہوئی ہے۔ چونکہ ایک اور روایت میں آیا ہے حسن اور حسین (علیہما السلام) بھی جنازے کے ساتھ تھے۔ پس اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کی وفات، حضرت امام حسن علیہ السلام کی شہادت، جو سنہ ۵۰ ہجری میں ہوئی، کے بعد نہیں ہوئی۔ پس ان کی وفات سنہ ۴۲ سے سنہ ۵۰ ہجری کے درمیان ہوئی ہے۔



فهرست مصادر و ماخذ

۱. الاخبار الموفقیات: زبیر بن بکار. ڈاکٹر سامی مکی العانی. مطبعة العانی. بغداد. ۱۹۷۲
۲. الارشاد فی معرفة حُججِ الله عَلَی العباد: محمد بن نعمان المعروف شیخ مفید. به تصحیح حاج سیدهاشم رسولی محلاتی. مطبعة علمیه اسلامیة. تهران.
۳. الاستیعاب فی معرفة الاصحاب: ابن عبد البر یوسف بن عبد الله. حیدر آباد (هند). ۱۳۳۶ھ ق.
۴. الاصابه فی تمییز الصحابه: ابن حجر عسقلانی، مطبعة السعادة، قاهره، ۱۳۲۳ھ ق.
۵. الأصول مِنْ الکافی: محمد بن یعقوب الکلینی، دار الکتب الاسلامیه، تهران، ۱۳۷۳ھ ق
۶. الأعلام: خیر الدین زَرَّکلی، طبع دوم.
۷. أعلام النساء فی عالمی العرب و الاسلام: عمر رضا کتّال، مطبعة الهاشمیه، دمشق ۱۳۷۹ھ ق.
۸. إعلَامُ الْوَرَى باعلام الْهَدَى: فضل بن حسن طبرسی، مقدمه سید محمد مهدی خرمسان، دارالکتب الاسلامیه، ۱۹۷۰
۹. الأغانی: ابو الفرج اصفهانی، دارالکتب المصریه، قاهره.
۱۰. أَقْرَبُ الْمَوَارِدِ فی فَصَحِ الْعَرَبِیَّةِ وَالشُّوَارِدِ: سعید الخوری.
۱۱. أمالی: محمد بن حسن طوسی، منشورات المکتبه الاهلیه، طبع افست قم، منشورات داوری.
۱۲. أنساب الاشراف: احمد بن یحی المعروف بلاذری، محمد حمید الله دارالمعارف ۱۹۵۹.
۱۳. انقلاب بزرگ. ترجمه جلد اول الفتنة الکبری. سید جعفری شهیدی. مؤسسه مطبوعاتی علی اکبر علمی، تهران ۱۳۳۶ھ ش.
۱۴. بلاغاتُ النِّساء: ابو الفضل احمد بن ابی طاهر، طبع افست، مکتبه بصیرتی، قم و طبع بیروت.
۱۵. بلوغُ الأرب فی معرفة الاحوال العرب: سید محمود شکری آلوسی، مطبعة رحمانیه،

- قاهره ۱۳۳۳ هـ ق.
۱۲. پس از پنجاه سال: سید جعفر شهیدی، دفتر نشر فرهنگ اسلامی، تهران ۱۳۵۹ هـ ش.
 ۱۷. تاریخ الأدب العربی: دکتر شوکی ضیف، دارالمعارف قاهره.
 ۱۸. تاریخ التمدن الاسلامی: جرجی زیدان، مطبعة الهلال، قاهره ۱۹۰۲.
 ۱۹. تاریخ الرسل والملوک: محمد بن جریر طبری، طبع بریل
 ۲۰. تاریخ یعقوبی: احمد ابی یعقوب کاتب، مطبعته الغری، نجف ۱۳۵۸ هـ ق.
 ۲۱. التبیان: محمد بن حسن طوسی، مصحح احمد حبیب عاملی، نجف.
 ۲۲. تحلیلی از تاریخ اسلام: سید جعفر شهیدی، نهضت زنان مسلمان، تهران.
 ۲۳. جمهرة خطب العرب: احمد ذکی صفوت مصطفی البالی الحلبي، قاهره ۱۳۵۳ هـ ش.
 ۲۴. حبیب السیر فی اخبار افراد البشر: غیاث الدین خوند میر تصحیح دکتر دبیر سیاقی، کتابفروشی خیام، تهران ۱۳۳۳ هـ ش.
 ۲۵. حدیقة الحقیقه و شریعة الطریقه: مجلود بن آدم سنائی، مدرس رضوی، دانشگاه تهران.
 ۲۶. حلیة الأولیاء و طبقات الاصفیاء: ابو نعیم اصفهانی، مکتبه الخانجی، قاهره ۱۳۵۲ هـ ش.
 ۲۷. دیوان ابن حسام خوسفی: طبع سنگی، تهران.
 ۲۸. دیوان ابن یمین فریو مدی: حسین علی باستانی راد، کتابخانه سنائی، تهران.
 ۲۹. دیوان الیراحسیکتی: رکن الدین همایون فرخ، طبع زهره ۱۳۳۷ هـ ش.
 ۳۰. دیوان اسماعیل حمیری: (سید...) شاکر هادی شاکر، مکتبه الحیاة، بیروت.
 ۳۱. دیوان خواجوی کرمانی: احمد سهیلی خوانساری، کتابفروشی بارانی.
 ۳۲. دیوان دغیل: عبد الصاحب عمران الدجیلی، دار لکتاب اللبنانی، بیروت ۱۹۷۲.
 ۳۳. دیوان قوامی رازی: شرف الشعراء. بدرالدین، میر جلال محدث، ۱۳۷۳ هـ ق.
 ۳۴. دیوان متنبی: عبدالرحمن البرقوقی، مکتبه التجاریة، قاهره.
 ۳۵. دیوان مہیار دیلمی: دارالکتب المصریة، ۱۳۴۴ هـ.
 ۳۶. دیوان ناصر خسرو: سید نصر الله تقوی، و نیز طبع مینوی دکتر محقق.
 ۳۷. روضة الواعظین: محمد قتال، سید محمد مهدی خرسان، منشورات الرضی.
 ۳۸. سيرة النبی: ابو محمد الملک بن هشام، محمد محی الدین عبدالحمید، مطبعة حجازی، قاهره ۱۳۵۶ هـ ق.
 ۳۹. سنن: احمد بن شعيب نسائی، دارالفکر، بیروت ۱۳۳۸ هـ ش.
 ۴۰. سفينة البحار: حاج شیخ عباس قمی، انتشارات سنائی.
 ۴۱. شرح نهج البلاغه: ابن ابی الحديد، تصحیح محمد ابو الفضل ابراهیم، دار احیاء الکتب العربیة ۱۳۸۵ هـ ق.
 ۴۲. الشعر والشعراء: ابن قتیبة، تصحیح احمد محمد شاکر.
 ۴۳. الصحیح: محمد بن اسماعیل بخاری، محمد علی صبیح و اولاده، قاهره.
 ۴۴. الصواعق المخرقة: ابن حجر هیتمی، مصحح عبدالوهاب عبداللطیف، مکتبه القاهره

١٣٨٥ هـ ق

٣٥. الطِّبَقَاتُ الْكَبِيرُ: محمد بن سعد كاتب واقدي، زاخاؤ، لندن ١٣٣٢ هـ ق.
٣٦. عللُ الشَّرَائِع: صدوق، محمد بن علي، مكتبة الحيدريه، نجف ١٣٨٥ هـ ق.
٣٧. العَقْدُ الْقَرِيد: احمد بن محمد بن عبدربه، محمد سعيد العريان.
٣٨. عُيُونُ الْأَخْبَار: مكتبة التجارية، قاهره ١٣٤٢ هـ ق.
٣٩. الفَديِر: الشيخ عبد الحسين احمد اميني، دار الكتب العربي، قاهره.
٥٠. فَتُوحُ الْبِلْدَان: احمد بن يحيى بلاذري، صلاح الدين منجد، مكتبة النهضة، قاهره.
٥١. قاموسُ الرجال: حاج شيخ محمد تقى شوشترى، مركز نشر كتاب، تهران.
٥٢. الكامل في التاريخ: ابن لير عز الدين علي بن ابي الكرم، دار صادر بيروت ١٣٨٥ هـ ق.
٥٣. كَشَفُ الْقَمَهِ: علي بن عيسى اربلي، مصحح حاج سيد هاشم رسولى، تبريز.
٥٤. كَنْزُ الْعَمَالِ فِي سَنَنِ الْأَقْوَالِ وَالْأَفْعَال: علاء الدين علي، حيدآباد (هند) ١٣١٢ هـ ق.
٥٥. لِسَانُ الْعَرَب: ابن منظور محمد بن مكرم، دار صادر، بيروت ١٣٤٣ هـ ق.
٥٦. مَجْمَعُ الْأَمْثَال: ميداني، احمد بن محمد تهران، ١٢٩٠ هـ ق.
٥٧. مَجْمَعُ الْبَيَانِ فِي تَفْسِيرِ الْقُرْآن: فضل بن حسن طبرسى، صيدا، لبنان ١٣٣٣ هـ ق.
٥٨. الْمُسْنَد: احمد بن حنبل، احمد محمد شاكر، دار المعارف.
٥٩. الْمَعَارِف: ابن قتيبه، ثروت عكاشه دار الكتب ١٩٦٠.
٦٠. معجم الادباء: ياقوت بن عبد الله حموى، مكتبة القراءة والصحافة الادبيه، دكتور احمد فريد رفاعى، مصر قاهره.
٦١. معجم انساب العرب: ابن خرم اندلسى، تحقيق عبد السلام هارون.
٦٢. الْمَغَازِي: محمد بن عمر بن واقد: آكسفورد ١٩٦٦.
٦٣. مَقَاتِلُ الطَّالِبِينَ: ابو الفرج اصفهاني، سيد احمد صقر، دار المعرفة بيروت لبنان.
٦٤. مَقْتُلُ الْحُسَيْن: موفق بن احمد خوارزمي، مكتبة المفيد، قم ١٣٦٤ هـ ق.
٦٥. الْمَلَلُ وَ النَّحْل: محمد بن عبد الكريم شهر ستاني احمد فهمي، مكتبة الحسين قاهره ١٣٦٨ هـ ق.
٦٦. مناقب آل ابي طالب: محمد بن علي شهر آشوب، قم انتشارات علامه.
٦٧. منتهى الآمال: حاج شيخ عباس قمى، علميه اسلاميه تهران ١٣٢١ هـ ق.
٦٨. نسب قريش: مصعب بن عبد الله بن مصعب زبيرى، دار المعارف، سلسلة ذخائر العرب شماره ١١.
٦٩. نَهْجُ الْبَلَاغَةِ: مصحح عبدالعزيز سيد الاهل مكتبة الاندلس، بيروت ١٣٤٣ هـ.
٧٠. وَفَيَاثُ الْأَعْيَانِ وَ أَنْبَاءُ أَبْنَاءِ الْإِزْمَان: احمد بن محمد بن خلكان، محمد محي الدين عبد الحميد، مكتبة النهضة المصريه قاهره ١٣٤٦ هـ ق.
٧١. الْهَاشِمِيَّات: كميته بن زياد اسدى، تصحيح محمد محمود رافعى، شركة التمدن الصنا عيه قاهره.
٧٢. الْهَفَوَاتُ النَّادِرَة: عرس النعمه محمد بن هلال الضابى، دكتور صالح اشتر، ١٣٨٢ هـ ق.

حسب ذیل کتابیں بھی مؤلف کے زیر نظر رہی ہیں

۱. احوال حضرت فاطمہ (ع) (نا سخ التواریخ : لسان الملك سہر محمد تقی، کتابفروشی اسلامیہ، تہران ۱۳۵۳ھ ق.
۲. بحار الانوار: جلد اول احوال فاطمہ زہرا (ع): اسلامیہ تہران ۱۳۹۵ھ ق
۳. زندگانی حضرت فاطمہ (ع): (ترجمہ بیت الاحزان) سید محمود موسوی زرنندی اسلامیہ، تہران ۱۳۳۶ھ ق
۴. زندگانی صدیقہ کبریٰ (ع): دستغیب، انتشارات کاوہ.
۵. زندگی نامہ خدیجہ کبری و فاطمہ زہرا (ع): ترجمہ دکتر علی شیخ الاسلامی.
۶. فاطمہ (س): نصیر الدین امیر صادقی، حاج محمد علی علمی، تہران ۱۳۴۷ھ ش
۷. فاطمۃ الزہراء أم أبیہا: فاضل الحسینی المیلانی، دارالعارف للمطبوعات، بیروت ۱۳۹۸ھ ق
۸. فاطمۃ الزہراء من المہد إلى اللحد: سید محمد کاظم قزوینی، دارصادر بیروت ۱۳۹۷ھ ق
۹. فاطمۃ الزہراء و الفاطمیون: عباس محمود عقاد، دارالکتب العربی، بیروت ۱۹۶۷.
۱۰. فاطمہ دختر محمد (ص): سید جعفر شہیدی، کتابفروشی حافظ، سرچشمہ، ۱۳۳۰ھ ش
۱۱. فاطمۃ زہراء: حاج سید ہاشم رسولی محلاتی، علمیہ اسلامیہ، ۱۳۵۷ھ ش
۱۲. فاطمۃ زہراء: ترجمہ علی اکبر صادقی، امیر کبیر، ۱۳۶۰ھ ق.
۱۳. فاطمۃ زہرا: بانوی نمونہ اسلام، ابراہیم امینی، دارالتبلیغ قم.
۱۴. فاطمہ فاطمہ است: ڈاکٹر علی شریعتی، حسینہ ارشاد، تہران.



فہرست مضامین

پیش لفظ

ص ۱-۴

موضوع کتاب، سنت رسول کے محافظ، تبدیلی و تجدید کے طالب، سنت محمدی کا انجام، تاریخی اسناد و مدارک کا جائزہ۔

ص ۵-۱۲

صحرائے عرب، صحرائین اور اس کی زندگی۔ بتائے زندگی کی جنگ۔ صحرائینوں کی لڑائیاں۔ بنی کی پیدائش اور صحرائین۔ ظہور اسلام اور صحرائین کی زندگی میں تبدیلی۔ بیٹیوں کے بارے میں حضور پاک کے ارشادات۔

ص ۱۳-۲۲

حضرت خدیجہ: ان کا نسب۔ ان کی زندگی۔ ان کے والد۔ ان کا خاندان۔ حضرت محمد کے ساتھ ان کی شادی۔ ان کے فرزند۔ حضرت فاطمہ (س) کی ولادت باسعادت۔ دختر پیغمبر کی تاریخ ولادت سے متعلق اسناد کا تجزیہ و تحلیل۔

ص ۲۳-۳۱

حضرت فاطمہ (س) کا نام اور القاب۔ حضرت فاطمہ کی تعلیم و تربیت۔ بچپن کی عبادت و ریاضت۔ حضرت خدیجہ اور ابو طالب کی وفات۔ پیغمبر خدا کی نظر میں حضرت فاطمہ (س) کا مقام و احترام۔

ص ۳۲-۵۰

حضرت فاطمہ (س) سے شادی کے خواستگار۔ بعض مستشرقین کی تحریروں کا جائزہ۔ اسلام اور اسلامی شخصیات کے بارے میں مستشرقین کی کتب کے قارئین کے لئے تذکرہ۔ حضرت علیؑ کی حضرت فاطمہؑ سے خواستگاری۔ رسول خداؐ کی بیٹی کا مہر۔ حضرت فاطمہؑ کا جہیز۔ خطبہ نکاح۔ دعوت ولیمہ۔ حضرت فاطمہؑ کی رخصتی۔ ابن شہر آشوب کی تحریر کا تجزیہ۔

ص ۵۱-۵۸

فاطمہ (س) شوہر کے گھر میں۔ اسماء بنت عمیس کی شادی میں شرکت پر تبصرہ۔ علی (ع) و فاطمہ (س) کا حارث بن نعمان کے گھر منتقل ہونا۔ یہودی عبد اللہ بن ابی اور پیغمبر خدا۔ علی و فاطمہ (س) کا ایثار۔

ص ۶۲-۶۹

ولادت امام حسن (ع)۔ جنگ احد اور اس کے نقصانات امام حسینؑ کی ولادت۔ حضرت فاطمہ (س) کا زہد و ریاضت۔ علی (ع) کے گھر پیغمبر اور فاطمہ الزہرا (س) کی

ملاقات۔ سلمان فارسی اور دختر پیغمبرؐ کی چادر۔ گردن بند کا فروخت کر دینا۔ ملازم کی بجائے حمد خدا۔ پیغمبر خدا کا حضرت زہرا (س) کی تعریف کرنا۔

ص ۷۰ - ۷۴

کیا میاں بیوی میں کبھی رنجش پیدا ہوئی؟ ابو جہل کی بیٹی جویریہ کا قصہ۔ مسور بن مخرمہ اور اس کی روایت کا جائزہ۔

ص ۷۵ - ۷۶

حضرت زہرا (س) کی عبادت تسبیح اور دعا کا ذکر۔

ص ۷۷ - ۷۹

جنگ خندق۔ صلح حدیبیہ۔ فدک۔ قریش کی جانب سے صلح نامہ حدیبیہ کی خلاف ورزی۔ ابوسفیان کا دختر پیغمبرؐ سے سفارش کے لئے کہنا۔

ص ۸۰ - ۸۱

فتح مکہ۔ سیرۃ النوف۔ حیزۃ الوداع۔ احکام حج کی تعلیم۔ واقعہ غدیر۔ پیغمبر خدا کا حضرت زہراء (س) کو اپنی وفات سے متعلق خبر دینا اور یہ کہ وہ ان سے جلد آ ملیں گی۔ رسول خدا کا مریض ہونا اور مسجد میں جا کر وعظ و نصیحت کرنا۔ رسول خدا بستر بیماری پر۔

ص ۸۲ - ۸۵

حیزۃ الوداع۔ پیغمبر اکرم (ص) کی وصیت۔ پیغمبر اکرم (ص) کا مریض ہونا۔

ص ۸۶ - ۸۷

محبوب خدا، خدا سے جا ملے۔ پیغمبر اکرم کی وفات پر حضرت عمر کا اعتراض اور حضرت ابو بکر کا جواب۔ سقیفہ بنی ساعدہ میں اجتماع۔

ص ۸۸ - ۹۲

پیغمبرؐ کے گھر کا محاصرہ۔ اہل سقیفہ کا بیعت پر اصرار

ص ۹۳ - ۹۸

حکومت کا فدک پر قبضہ۔ فدک، مروان کے حوالے۔ فدک اور عمر بن عبد العزیز۔ مامون کا فدک کو فرزندان فاطمہ کے حوالے کر دینا۔

ص ۹۹ - ۱۱۰

مسجد مرکز عدل و انصاف۔ زہرا (س) کا مجمع عام میں شکایت کرنا۔ سند خطبہ حضرت زہرا (س)۔ انداز خطبہ کا تجزیہ اور معترضین کا جواب۔ خطبہ کا ترجمہ۔

ص ۱۱۱ - ۱۱۸

حضرت ابو بکر کا بنت رسولؐ کو جواب۔ بنت رسولؐ کا خلیفہ سے احتجاج کرنا۔ بنت رسولؐ کی علیؑ سے گفتگو۔ ایک جائزہ۔

ص ۱۱۹ - ۱۲۳

بنت رسولؐ بستر بیماری پر۔ کیا حضرت فاطمہ (س) پیغمبر اکرم کی وفات سے قبل بیمار تھیں؟ قریش کی خود خواہی۔

ص ۱۲۳ - ۱۲۸

انصار کی خواتین بنت رسولؐ کے گھر میں۔ حضرت زہرا (س) کی عبرت آمیز باتیں۔ مستقبل کے خطرات سے آگاہ کرنا۔

ص ۱۲۹-۱۳۱

حضرت زہرا (س) کی زندگی کے آخری ایام۔ اسماء بنت عمیس کو حضرت زہرا (س) کی وصیت۔

ص ۱۳۲-۱۳۵

حضرت زہرا (س) کی تدفین۔ قبر زہرا (س) پر علی کا درد دل بیان کرتا۔

ص ۱۳۶-۱۳۸

حضرت زہرا (س) کی قبر کہاں ہے؟ ان کی قبر کیوں پوشیدہ رکھی گئی؟

ص ۱۳۹-۱۵۶

عبرت برائے تاریخ۔ قحطانی اور عدنانی عرب۔ قبل از اسلام ان کی باہمی دشمنیاں۔ ظہور اسلام کے بعد عدنانی اور قحطانی عربوں کی صورت حال۔ قریش کا حکومت اسلامی پر قبضہ۔ بنی امیہ اور اسلامی قوانین و احکامات کی پامالی۔ بدعتوں کا راج اور مسلمانوں کی پشیمانی۔ دینداروں کا مجتمع ہونا۔ زہرا (س) رحمہ اللہ کی مظلومیت۔

ص ۱۵۷-۱۸۰

شیعہ شعرائے عرب کے اشعار سے انتخاب۔ ابوالحسن علی، حمیت بن زیاد اسدی سید اسماعیل بخاری۔ منصور غبری۔ و غیل۔ سلامۃ الموصلی۔ صنوبری۔ ناشی صغیر۔ ابن حماد۔ مہیار دلی۔ ابن العودی۔ علاء الدین حلی۔

ص ۱۸۱-۲۰۰

فارسی شاعری میں حضرت فاطمہ (س) کا ذکر۔ ناصر خسرو۔ سنائی۔ قوامی رازی۔ اثیر اخیسی۔ خواجہ کرمانی۔ ابن یحییٰ۔ ابن حسام۔

ص ۲۰۱-۲۱۳

اولاد حضرت فاطمہ (سلام اللہ علیہا)۔ حضرت زینبؓ (ولادت، ازدواج، اولاد)۔ حضرت علیؓ کے ہمراہ عراق میں۔ مدینہ واپسی۔ بھائی کے ہمراہ کربلا میں۔ بازار کوفہ میں خطبہ۔ ابن زیاد کے دربار میں۔

ص ۲۱۳-۲۲۲

کاروان کی آخری منزل۔ یزید کے دربار میں۔ حضرت زینب (س) کی وفات۔ ام کلثوم۔

ص ۲۲۳-۲۲۶

فہرست مآخذ۔

☆☆☆☆

- ☆ کیا آپ جاننا چاہتے ہیں کہ ”مکتب تشیع“ کیا ہے؟
- ☆ کیا آپ اسلامی تاریخ کے تناظر میں ”تشیع“ کا کردار جاننا چاہتے ہیں؟
- ☆ کیا آپ ائمہ اہل بیت علیہم الصلوٰۃ والسلام کی خوں رنگ جدوجہد کی تاریخ پڑھنا چاہتے ہیں؟
- ☆ کیا آپ وارثان خاتم الرسل صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حقیقی اور روح پرور تعلیمات پڑھنا چاہتے ہیں؟

آئیے ہماری مطبوعات کا مطالعہ کیجئے۔

الرضا پبلیکیشنز . اسلام آباد